تحقیقی مقالہ برائے ایم۔ایس اُردو

صادق حسین کے افسانوں میں سماجی شعور

(تجزیاتی مطالعہ)

محقق

عاصمہ بتول

146-FLL/MSURDU/F14

نگران

ڈاکٹر صباحت مشتاق

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

شعبہ اُردو

کلیۂ زبان و ادب

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

CENTRAL LIBRARY

Accession No. TH 23088

MS
891.4393
ع اص

اردو ادب - افسانہ

" " " - تجزیاتی مطالعہ

" " " - سماجی شعور

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: **Aasma Batool**
Title of the Thesis: " صادق حسین کے افسانوں میں سماجی شعور: تجزیاتی مطالعہ "
Registration No: 146-FLL/MSURDU/F14

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of Languages & Literature, International Islamic University, Islamabad, in partial fulfillment of the requirements for the Master of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE

Chairperson Viva Committee:

Dr. Najeeba Arif
Chairperson Department Of Urdu Female IIUI

External Examiner:

Dr. Aqlima Naz Assistant Professor
Fatima Jinnah Women University, Rawalpindi.

Internal Examiner:

Dr. Humaira Ishfaq
Assistant Professor, Department of Urdu Female IIUI

Supervisor:

Dr. Sabahat Mushtaq
Assistant Professor, Department Of Urdu Female IUII

بسم الله الرحمن الرحيم

X121525

100 Rupees ۱۰۰ روپیہ

﴿بیان حلفی﴾

منکہ مسماۃ عاصمہ بتول دختر افتخار احمد سکنہ ککرالہ ڈاکخانہ خاص تحصیل سوہاوہ ضلع جہلم ، رجسٹریشن نمبر 146-FLL/MS/UR/F14، حلفاً اقرار کرتی ہوں کہ میرا مقالہ بعنوان صادق حسین کے افسانوں میں سماجی شعور (تجزیاتی مطالعہ) سرقے سے پاک ہے اور اس مقالے میں مکمل اور اصل حوالہ جات دیے گئے ہیں۔

متذکرہ بالا بیان میرے علم و یقین کے مطابق درست ہے اور کوئی امر مخفی ہرگز نہیں رکھا گیا ہے۔

مقالہ نگار

عاصمہ بتول

شناختی کارڈ نمبر 37303-6145757-2

ATTESTED
Muhammad Arif Khan
Oath Commissioner
District Court Rawal...

الجامعة الإسلامية العالمية

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبہ اُردو

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ عاصمہ بتول رجسٹریشن نمبر146-FLL/MSURDU/F14 نے ایم۔ایس اُردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے **"صادق حسین کے افسانوں میں سماجی شعور: تجزیاتی مطالعہ"** کے عنوان سے تحقیقی مقالہ رقم کیا ہے۔میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا اور یہ کام سرقے سے پاک ہے۔

نگران: ڈاکٹر صباحت مشتاق

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

فہرست موضوعات

صفحہ نمبر	عنوانات	نمبر شمار
1	**باب اوّل:** سماج اور ادب	۱۔
56	**باب دوم:** صادق حسین کے افسانوں میں سماجی شعور (بحوالہ موضوع)	۲۔
166	**باب سوم:** صادق حسین کے افسانوں میں سماجی شعور (بحوالہ کردار)	۳۔
224	**باب چہارم:** صادق حسین کے افسانوں میں سماجی شعور (بحوالہ اسلوب)	۴۔
274	**ماحصل**	
297	**ماخذات**	

پیش لفظ

ادب کی دنیا بڑی وسیع دنیا ہے نثری ہو یا شعری۔ ہر شاعر، ادیب، افسانہ نگار یا ناول نگار اپنے خاص مطالعے، مشاہدے اور احساسات وجذبات سماجی شعور اور خاندانی پس منظر میں اپنے فنی پیرائے کا اظہار کرتا ہے۔ ادب اور سماج کا رشتہ بہت گہرا اور مضبوط ہوتا ہے۔ تغیر پذیر معاشرے میں اس کی اہمیت اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ ادب ہر دور میں ہی سماج کا عکاس رہا ہے۔ ہر صنفِ ادب نے اپنے اپنے عہد کے سماجی رویوں کی عکاس ہوتی ہیں۔ اُردو افسانے میں سماجی اثرات کی عکاسی تو ابتداء ہی سے موجود تھی۔ بڑے بڑے افسانہ نگاروں نے سماجی موضوعات پر خامہ فرسائی کی۔

صادق حسین کا شمار بھی اُردو ادب کے اُن اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے معاشرتی تغیر و تبدیلی اور سماجی مسائل، خاص کر دیہی معاشرت کے مسائل کو باریک بینی کے ساتھ سپردِ قلم کیا۔ آپ کے بیشتر افسانے نچلے اور متوسط طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ عام انسانی زندگی کے مسائل اور طبقاتی کش مکش، غربت، معاشی تنگدستی و ناآسودگی اور دیگر سماجی محرکات ان کا خاصا رہا ہے۔ خاص طور انسانی فطرت کے مطالعے کو انھوں نے باریکی اور مہارت کے ساتھ سپردِ قلم کیا۔ اُن کی تحریریں بلاشبہ اُن کے عہد کی عکاس ہیں۔ اُن کے افسانے زندگی سے بھرپور ہیں۔ کیونکہ انھوں نے سماجی زندگی کے مختلف چھوٹے چھوٹے پہلوؤں اور معاشرتی اضطراب اور بے چینیوں پر گہری نظر رکھی۔ اُن کا مشاہدہ عمیق ہے۔ اس کے علاوہ ان کا نفسیاتی اور سماجی تجزیہ بھرپور اور کامیاب ہے۔ انھوں نے جس فکر انگیز انداز میں اپنے کرداروں کی نفسیاتی کش مکش کی مصوری کی ہے اس میں اُن کے فن کا کمال اور زندگی کی گہرائیوں سے اُن کی واقفیت نظر آتی ہے۔ اُن کے کردار نچلے طبقے کے نمائندہ ہیں۔ آپ کا اندازِ بیان سادہ اور پرتاثیر ہے۔ اُردو افسانے میں صادق حسین کی آواز جس قدر منفرد ہے اس سے کہیں زیادہ فنی پختگی کی نمائندگی کرتی ہے۔

زیرِ نظر تحقیقی مقالے میں صادق حسین کے افسانوں میں سماجی شعور کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ مقالہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔ مقالے کا پہلا باب ''سماج اور ادب'' کے باہمی تعلق اور رشتے کی وضاحت کرتا ہے۔ سماج کیسے وجود میں آتا ہے، ؟انسان کا معاشرے میں کیا کردار ہے ؟اور ادب اور سماج کس طرح ایک دوسرے کو متاثر کرتے ہیں ؟ان باتوں کے تجزیے کے علاوہ باب اوّل میں اُردو افسانہ عصری مسائل اور سماجی افسانہ نگاروں کے حوالے سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

باب دوم میں صادق حسین کے افسانوں میں سماجی شعور کا تجزیاتی مطالعہ موضوعات کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ اُن کے موضوعات میں تنوع بھی ہے اور کچھ موضوعات میں مماثلتیں بھی۔ لیکن موضوعاتی اعتبار سے انھوں نے سماجی زندگی کے جن جملہ اُمور کی نشاندہی اپنے افسانوں میں کی ہے باب دوم اُن تمام اُمور سے متعلق تمام تفصیلات موجود ہیں۔

صادق حسین نے افسانوی کرداروں کے ذریعے طبقاتی کش مکش کے علاوہ نجی زندگی کے مسائل اور امور کو بیان کیا ہے۔ اُن کے کردار مختلف طبقات اور پیشوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اور مخصوص سماجی پس منظر کے علاوہ مختلف سماجی حقائق و مسائل کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ اس مقالے کے باب سوم میں صادق حسین کے افسانوں میں سماجی شعور کا تجزیاتی مطالعہ بحوالہ اسلوب کیا گیا ہے۔ اس

باب میں اُن کے اسلوب اظہار، تکنیکی مہارتوں اور تجربات، زبان و بیان اور دیگر فنی خصائص کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس باب کی تکمیل کے بعد تحقیقی مقالے کا جامع خلاصہ اختتامیہ میں موجود ہے۔ آخر میں کتابیات کی مکمل فہرست ہے۔

یہ تحقیقی مقالہ اتنی جلدی پایہ تکمیل تک نہ پہنچ پاتا اگر محترمہ ڈاکٹر صباحت مشتاق کی بصیرت افروز رہنمائی مجھے میسر نہ ہوتی۔ ان کی زیر نگرانی مقالہ مکمل کرتے خود کو میں خوش قسمت تصور کرتی ہوں کیونکہ مجھے اُن کی نگرانی میں کام کرنے اور اُن کے علمی فیوض و برکات سے اپنے دامن کو بھرنے کا بہترین موقع میسر ہوا موصوفہ کی شفقت، تربیت اور رہنمائی کے لیے میں تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

میں محترمہ یاسمین پرویز صاحبہ سابق انسٹرکٹر شعبہ اُردو (گورنمنٹ پولی ٹیکنک انسٹیٹیوٹ برائے خواتین ایچ ایٹ ون اسلام آباد) کی تہہ دل سے ممنون ہوں جنھوں نے اس مقالے کی تکمیل اور خاص طور پر تلاشِ مواد کے سلسلے میں جس طرح میری مدد کی اس کے لیے شکریے کے الفاظ بہت تھوڑے محسوس ہوتے ہیں۔ آپ صادق حسین (مرحوم) کی سب سے چھوٹی صاحبزادی ہیں۔ آپ کے مشفقانہ رویے اور تعاون کے بغیر اس تحقیقی مقالے کی ترتیب و تکمیل ممکن نہ ہو پاتی۔ ایک مقالہ نگار کے لیے سب سے مشکل اور کٹھن مرحلہ تحقیقی مواد کی دریافت کرنا ہے۔ محترمہ نے تمام بنیادی ماخذات تک میری رسائی کو یقینی بنانے کے لیے حتی المقدور کوشش کی اللہ تعالٰی آپ کو جزائے خیر عطا کرے۔ (آمین)

میں محترمہ ڈاکٹر نجیبہ عارف (صدر شعبہ اُردو انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد) جیسی مشفق اور علمی و ادبی شخصیت کی تربیت اور مفید مشوروں کے لیے سراپا ممنون ہوں۔

اس کے ساتھ ساتھ میں اپنے تمام اساتذہ کرام کی ممنون و مشکور ہوں جنھوں نے اس تحقیقی مقالے کی تیاری کے سلسلے میں مجھے قیمتی مشوروں سے نوازا۔

افرادِ خانہ میں والدین نے ہمیشہ میری ہمت بڑھائی اور مجھے ہر طرح کی سہولیات فراہم کیں۔ یہ اُن کی دعاؤں اور شفقت و محبت کا ثمر ہے کہ الحمد اللہ آج میرے ایم۔ ایس اُردو کے تحقیقی مقالے کی تکمیل ممکن ہو سکی۔ اُن کی جانب سے ملنے والی توجہ، حوصلہ افزائی اور دعائیں میری زندگی کا قیمتی اثاثہ ہیں۔

سب سے آخر میں میں اپنی تمام ہم جماعتوں خاص کر سحر افشاں کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے قدم قدم پر میرا حوصلہ بڑھایا۔ اور مجھے دعاؤں میں یاد رکھا۔ اس کے ساتھ ہی میں اپنی بہت ہی پیاری اور فرمانبردار شاگرد مائرہ شفیع اور کی محبتوں کا تہہ دل سے احترام کرتی ہوں جس کی دعائیں ہمیشہ میرے تعاقب میں رہیں۔

ان تمام کا بے حد شکریہ جنھوں نے مقالے کو کمپیوٹر کی سطح پر لفظوں کے قالب میں ڈھالنے میں میرا غیر معمولی ساتھ دیا۔ اور جن کا ذکر نہ ہو سکا میرا شکریہ ان تمام کے لیے بھی ہے۔

عاصمہ بتول

تفصیلی فہرست

باب اول:

سماج اور ادب

سماج

انسان اور سماج

ادب کیا ہے؟

ادب اور سماج کا باہمی تعلق

سماجی شعور

اردو افسانہ اور سماج

اردو افسانہ اور عصری شعور

اردو افسانے کی روایت ہیں سماجی شعور کے حامل افسانہ نگار۔

حوالہ جات

باب دوم:

صادق حسین کے افسانوں کا سماجی شعور (بحوالہ موضوع)

پھولوں کے محل میں سماجی شعور،

شہر اندر شہر میں سماجی شعور۔

گلاب کے آنسو میں سماجی شعور

متفرق افسانوں میں سماجی شعور،

حوالہ جات

باب سوم:

صادق حسین کے افسانوں کا سماجی شعور (بحوالہ کردار)

پھولوں کے محل میں سماجی شعور

شہر اندر شہر میں سماجی شعور۔

گلاب کے آنسو میں سماجی شعور
متفرق افسانوں میں سماجی شعور
حوالہ جات
باب چہارم: صادق حسین کے افسانوں کا سماجی شعور (بحوالہ اسلوب)
منظر نگاری،
سراپا نگاری
کرداروں کے نام
جزئیات نگاری
تشبیہات
محاورات
ضرب الامثال
صوتی عناصر
متضاد کیفیات
حوالہ جات
ماحصل
ماخذات

بابِ اوّل:

سماج اور ادب

سماج:

سماج دو یا دو سے زیادہ افراد کے ایسے مجموعے کو کہتے ہیں جس میں افراد کے طرزِ زندگی میں بہت حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اور وہ اپنی بنیادی ضروریات کی تکمیل میں بہت حد تک خود کفیل ہوتے ہیں۔ وہ مشترکہ مفادات وثقافت پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ اور اس کے تحفظ اور اگلی نسل کی منتقلی کا عمل جاری رکھتے ہیں اس سے معاشرتی وسماجی زندگی، منظم انداز میں جاری وساری رہتی ہے۔ دنیا میں بستیوں اور شہروں کا وجود معاشرتی زندگی کی اہمیت کا ٹھوس اظہار ہے۔

> "سماج "لفظ سنسکرت زبان کے دو لفظوں سے مل کر بنا ہے یہ لفظ "سم" اور آج ہیں۔ "سم" کے معنی اکٹھا یا ایک ساتھ اور آج کے معنی ہیں رہنا۔ یعنی سماج کے لغوی معنی ہیں ایک ساتھ رہنا۔ انگریزی میں سماج کے لیے Society کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ لفظ Society لاطینی زبان کا لفظ Socias سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں اکٹھا ہونا۔ اس خیال سے جہاں افراد ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں۔ وہیں سماج بن جاتا ہے "[۱]

فرہنگ آصفیہ میں سماج کے لیے مستعمل الفاظ یہ ہیں۔

سماج: اسم مونث۔ سبھا، انجمن، مجلس، محفل، سوسائٹی، گروہ، جتھا، ٹولی اور منڈلی کے ہیں اور انگریزی میں سماج کو Society کہا جاتا ہے۔ یعنی سماج افراد کا ایسا گروہ ہے جو مشترکہ مفادات کے لیے ایک دوسرے سے تعاون کرتا ہے اور مشترکہ روایات، اقدار، رسم ورواج اور طرزِ زندگی اختیار رکھے ہوئے ہو۔

ویبسٹر نیو انگلش ڈکشنری میں سماج کی تعریف کچھ یوں بیان کی گئی ہے۔

> "Human being in general taken in relation to one another: an organize community: a body of person united for some common purpose: the more cultured or more fashionable part of the community"[۲]

یعنی تمام انسان ایک منظم کمیونٹی کے اندر ایک تعلق یا رشتے میں پروئے ہوئے ہوتے ہیں۔ان سب کے مقاصد اور طرزِ رہائش میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔اور اس مخصوص کمیونٹی سے تعلق رکھنے والے افراد ہی معاشرے کی تشکیل کرتے ہیں۔مارس گنسبرگ (Mars Ginsberg) کے الفاظ میں:

"سماج افراد کا ایسا مجموعہ ہے جو مخصوص تعلقات اور برتاؤ کے طریقوں میں بندھے ہوئے ہوتے ہیں اور اسی بنیاد پر ان دوسرے لوگوں سے مختلف ہیں جو ان تعلقات کو اختیار نہیں کرتے یا جو ان میں سے الگ ہوں۔"[۳]

اس طرح نگینہ جبیں سماج کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہیں۔"سماج رسم و رواج کا حقائق اور آپسی ہمدردی کا مختلف گروہوں اور شعبوں کا انسانی برتاؤ اور طور طریقوں کی حریت اور مساوات کا نام ہے۔"[۴]

یوں سماج کے حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ "سماج" معاشرہ یا سوسائٹی انسانوں کے اس بڑے گروہ کو کہتے ہیں جو باہمی تعلق و تعامل کے اعتبار سے انفرادی خصوصیات کا حامل ہو۔اس میں اقدارِ حیات اور ثقافت و تہذیب کے ساتھ ساتھ زمینی، روحانی اور نظریاتی اختصاص اس طور موجود ہو جو اسے دیگر مشابہ گروہوں سے ممتاز کرے۔نیز جذباتی و احساساتی اور شعوری و غیر شعوری سطح پر اس کی وحدتی کڑیاں منضبط ہوں۔

ڈاکٹر افضال احمد سماج کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"سماج ہندی زبان کا لفظ ہے۔اور اُردو میں اس کے لیے معاشرہ کا لفظ مستعمل ہے۔جو عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی اکٹھا رہنے کے ہیں۔سماج کا انگریزی مترادف سوسائٹی ہے۔"[۵]

میکائو اور پیج (Michaiw & Baig) نے اپنی کتاب "سوسائٹی" میں لکھا ہے۔

"Society is the web of social relationship." یعنی سوسائٹی یا معاشرہ، معاشرتی تعلقات کا جال ہے[۶]۔اور سماج کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ سماجی تعلقات کے معنی اور ان تعلقات سے پیدا ہونے والے نظم و ضبط کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔کیونکہ سماج، سماجی تعلقات کے نظم و ضبط کی شکل میں ہے۔سماج خود ایک گروہ ہے۔ایک انجمن ہے جس میں آپسی تعلقات رکھنے والے ایک ساتھ منظم ہوتے ہیں اسی طرح مارس گنس برگ (Mars Ginsberg) کے مطابق:

"ایک سماج انسانوں کا وہ گروپ ہے جو کچھ تعلقات یا عمل کے طور طریقوں سے منظم ہے جو انہیں کچھ دوسروں سے الگ کرتے ہیں جو ان تعلقات میں شامل نہیں ہیں یا جو عملی طور پر ان سے جدا ہیں۔"[۷]

بے شک سماج یا معاشرہ انسانوں کے گروہی شکل میں مل جل کر رہنے کا نام ہے۔لیکن مختلف ماہرین نے اس کی تعریف اپنے اپنے انداز میں بیان کی ہے جن کے مفاہیم میں مشابہت و مماثلت بھی ہو سکتی ہے تاہم ان کے اندازِ بیان میں فرق ہے۔میکائیو اور پیج (Michaiwe&Baige) سماج کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"رسم و رواج عمل در آمد حقوق اور آپسی امداد، بہتر گروہوں اور محکمات، انسانی برتاؤ اور سلوک کی نگرانیاور آزادی کا ایک نظم وضبط ہے۔اس مستقل تبدیل ہونے والے مشکل نظام کو ہم سماج کہتے ہیں۔یہ سماجی تعلقات کا جال ہے اور یہ ہمیشہ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔"۸

گویا ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ سماج افراد کے باہمی تعلقات کے تانے بانے کا نام ہے۔افراد کا ایسا گروہ جس کا تعلق ایک خاص جغرافیائی حدود سے ہو اور جہاں افراد طویل عرصے تک مشترکہ مفادات اور دلچسپیوں کے باعث مشترکہ ثقافتی انداز اور طرزِ زندگی کو اپناتے ہوئے باہم مل جل کر اتفاق و اتحاد کے ساتھ زندگیاں بسر کریں اور باہمی اشتراکِ عمل سے وسائلِ حیات کے حصول اور اپنی نسل کے بقاء کے لیے جد جہد کریں۔اور سماجی تعلقات میں نظم وضبط پیدا کرنے کی کوشش کریں۔کسی بھی سماج میں درج ذیل خصوصیات کا ہونا ضروری ہے۔

۱۔ انسانوں کا مکمل اور منظم گروہ
۲۔ آپس کے تعلقات اور احساسات کا بیدار ہونا
۳۔ عمل اور جد وجہد کا مادہ اور یک جہتی
۴۔ باہمی اتفاق اور امداد کے جذبات
۵۔ مشترکہ لائحہ عمل اور مضبوط نظامِ حیات
۶۔ مشترکہ قانون اور عدلیہ
۷۔ آزادی کے اور حقوق کا تحفظ اور پاسداری
۸۔ مشترکہ اقدار وروایات
۹۔ وسیع النظری کا مزاج یعنی کثرت میں وحدت

یعنی ایک مثالی معاشرہ یا سماج ایسا سماج ہے جو اس کرہ ارض کے مختلف حصوں میں پھلتا پھولتا رہے۔مساوات اور امن پسندی کا درس دے، قانون کا وکیل محافظ ہو، تمام انسانی اعمال کا ذمہ دار اور جواب دہ ہو۔رد عمل کا تابع نہ ہو۔اور مشترکہ مفادات کا حصول اسکا بنیادی مقصد ہو جس کیلئے ایک مشترکہ لائحہ عمل تشکیل دیا جائے اور معاشرے میں جنم لینے والے مسائل کو ختم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔اور انسانوں کے مابین کسی نوع کی تفریق تسلیم نہ کرتا ہو، یعنی نسلی امتیازات سے پاک ہو۔اور اجتماعی عدل وانصاف کا امین ہو۔اسکے علاوہ مضبوط و منضبط اقتصادی اور اجتماعی نظام کے ذریعے زندگی کی پیداواری قوت کو انفرادی تصرف میں لاتے ہوئے جاگیردارانہ نظام کی مخالفت بھی کرتا ہو۔اور تعصب سے پاک ہو۔ایسا سماج مثالی سماج کہلاتا ہے۔

دنیا کے تمام معاشروں کی اپنی اپنی ثقافت اور پہچان ہوتی ہے۔ اُن کے رہن سہن کے اصول وضوابط ایک دوسرے سے منفرد اور جداگانہ نوعیت کے ہوتے ہیں اور یہی ضوابط کردار کی تشکیل بھی کرتے ہیں اور اسے کنٹرول بھی کرتے ہیں انہی اصولوں اور قوانین کی پابندی نہ کرنے پر ہمارا معاشرہ سزا دیتا ہے۔ اور یہی ضابطے اور اصول اچھے اور برے کردار کے معیار ہیں۔ انہی کی بنیاد پر فرد کے کردار کی جانچ پرکھ ممکن ہوتی ہے۔ معاشرے کے ہر فرد کو مختلف گروہوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ بلکہ فرد اپنے گرد بہت سے گروہ بنالیتا ہے اور یہ گروہ فرد کیلئے اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہی گروہ فرد کو معاشرتی زندگی کے انداز سکھاتے ہیں۔

سماجی زندگی کے بے شمار پہلو ہیں۔ ہر پہلو الگ الگ انسانی ضرورت کا مظہر ہے۔ ان ضروریات کی تکمیل اسی وقت ممکن ہے جب فرد کی معاشرتی زندگی میں بے شمار سماجی حالات پیش آتے ہیں۔ جن میں وہ اپنے فرائض منصبی انجام دیتا ہے۔ تمام سماجی حالات انسان کی معاشرتی زندگی کی مختلف حاجات سے پیدا ہوتے ہیں۔ مختلف موقعوں میں اپنا کردار کامیابی سے ادا کرنے کیلئے اسے مختلف قسم کے اصول وضوابط اور طریقے آنے چاہیں۔ اور عمرانی علوم کے مطابق انہی اصولوں اور طریقوں کو معاشرتی معمولات کا نام دیا جاتا ہے۔ سماجی معمولات انسانی کردار کے لیے راہنما اصول ہیں۔ جنھیں فرد اپنے مقاصد کے حصول میں استعمال کرتے ہیں سماجی معمولات کی بنیاد ثقافتی اقدار پر ہوتی ہے اور ان کا وجود آج ہمارے کردار کے لیے مشعل راہ ہے۔ کئی صدیوں پرانے تجربات کا نچوڑ ہے۔ بہت سے معیار ایسے بھی ہیں جن میں کئی نسلوں تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ان معیاروں میں پختگی آجاتی ہے اور یہی معیار آنے والی یا موجودہ سماجی زندگی کے لیے اہم ہوتے ہیں۔ لیکن سماجی معیار سماجی حالات کے تبدیل ہونے کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں تاکہ سماجی حالات میں توازن کو برقرار رکھا جاسکے۔

سماج ہم سے تقاضا کرتا ہے کہ ہم اپنے کردار کو معاشرے کے قائم کردہ اصولوں کے مطابق ادا کریں بصورت دیگر سماج کی گروہی زندگی انتشار کا شکار ہونے لگے گی۔ لیکن کچھ اقدار ایسی بھی ہیں اگر ان کا تحفظ نہ کیا جائے تو ان کے ٹوٹ جانے سے کوئی سماجی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ اور کچھ اقدار ایسی ہوتی ہیں جو معاشرتی زندگی کی تشکیل اور اس کے وظائف کا لازمی جزو ہیں۔ ان کا استحکام معاشرے کا استحکام ہے۔ معاشرے میں رہتے ہوئے انسان نہ صرف معاشرتی اقدار کی پاسداری اور تحفظ کرتا ہے بلکہ کامیاب ترین مشترکہ زندگی گزارنے کے لیے باہمی تعلقات اور روابط میں بھی پختگی لاتا ہے۔

"فئیر چائلڈ (Fair Child)" سماج کو انسانوں کا ایسا گروہ قرار دیتا ہے جو اپنے بہت سے ضروری مقاصد (ذاتی تحفظ، روٹی کپڑا کو پورا کرنے میں مدد دیتا ہے۔"[9]

انسان اور سماج:

معاشرے کے ساتھ فرد کا تعلق بہت گہرا ہے۔انسان تنہا رہ کر زندگی نہیں گزار سکتا۔دوسرے افراد کے ساتھ مل جل کر رہناانسان کی فطرت میں شامل ہے۔ارسطو نے فرد کو معاشرتی حیوان کہا ہے۔معاشرے کے افراد باہم مل جل کر مشترکہ زندگی گزارتے ہیں۔سماجی مشاغل اور معاشرتی سطح پر کاروبار اور دیگر سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں۔یہ کہنا بھی درست ہے کہ معاشرتی زندگی ہی انسان کو صحیح معنوں میں انسان بناتی ہے۔سماج کے بغیر انسان کی ذہنی اور روحانی قوتوں کی مکمل نشوونما ممکن نہیں۔سماج میں رہ کر ہی فرد بامقصد زندگی بسر کرتا ہے۔باہمی عمل اور مشترکہ تعاون سے افراد ضروریات زندگی کو پورا کرتے ہیں۔اگر معاشرے کے افراد روز مرہ زندگی کے امور میں ایک دوسرے سے تعاون نہ کریں تو معاشرتی زندگی کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔معاشرتی زندگی کا مادی پہلو ہو یا ذہنی اور روحانی ہر اعتبار سے فرد کا سماج کے ساتھ تعلق بہت اہم اور گہرا ہے۔

انسان کے خیالات، جذبات اور عقائد شعوری اور غیر شعوری سطح پر دوسرے افراد کو متاثر کرتے ہیں۔کیونکہ افراد کی زندگی میں وہ تمام تجربات کارنامے ذہنی اور علمی کمالات اور سیرت کی خصوصیات شامل ہیں جو ایک معاشرے کا طرہ امتیاز ہوتے ہیں۔اسی طرح معاشرتی زندگی میں رسوم و رواج، مذہب، علوم وفنون، واقتصادی اور سیاسی مشاغل اور خانگی زندگی کے اصولوں اور قاعدوں کو بھی اہمیت حاصل ہے۔اور انہی اصولوں اور قاعدوں پر ہی درحقیقت معاشرتی ترقی کا انحصار ہوتا ہے۔ہر معاشرے کیلئے ضروری ہے کہ وہ افراد کو کامیاب زندگی گزارنے کے مواقع فراہم کرے اور افراد معاشرہ کے لیے تعمیری منصوبہ بندی کرے۔تاکہ افراد اپنی قوتوں کو تعمیری کاموں کیلئے استعمال کر کے معاشرتی ترقی میں اپنا خاص کردار ادا کر سکیں۔موجودہ تہذیب و تمدن کی بنیاد ہی عمرانی زندگی پر ہے۔یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ معاشرے میں انسانوں کا باہمی تعلق ان کے ارتقائی عمل پر اثر انداز ہوتا ہے۔معاشرتی سطح پر افراد کے تعلقات جتنے زیادہ منظم ہوں گے اتنا ہی اُن کا نتیجہ عمدہ برآمد ہوگا۔افراد کے باہمی اشتراک عمل پر خیال اور عمل کی آزادی کا انحصار ہوتا ہے۔

انسان اپنے ماحول میں ایک طرف تو اشیائے فطرت کا مشاہدہ کرتا ہے اور دوسری طرف انسانی علوم وفنون، اخلاق وسیاست کی ارتقاء پذیر دنیا ہے جس کی تخلیق انسان نے کی ہے اور اسکی تخلیق کا انحصار انسانی کوششوں، ذہنی کاوشوں اور جہد مسلسل پر ہے۔علم وادب موسیقی، مصوری، صنعت وحرفت، قانون، سیاست، تدریسی ادارے ان بے شمار افرادی جماعتوں کی کاوش کا نتیجہ ہیں جو گزشتہ نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں نئی نسل تہذیب و تمدن کے ارتقائی عمل کو اس نقطہ سے شروع کرتی ہے جہاں گزشتہ نسل نے اسے چھوڑا۔کوئی قوم بھی اپنے ماضی کو فراموش کر کے ترقی نہیں

کر سکتی۔ ماضی حال کا حصہ بن کر مستقبل کی تعمیر میں اپنا خاص کر دار ادا کرتا ہے۔ انسان گزشتہ زمانے کے رسوم و رواج پر تنقید بھی کر سکتا ہے اور مخالفت بھی۔ اس جد وجہد میں وہ اسے ذہنی اور مادی آلات و وسائل کا استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ معاشرتی سطح پر بہت سی تبدیلیاں بھی رونما ہوتی ہیں۔ اور بلاشبہ سماجی قوتیں جن میں ماحول، آبادی میں اضافہ، نظریات، عقائد اور انفرادی قیادت شامل ہیں معاشرتی سطح پر تبدیلی لانے کا موجب بنتی ہیں۔ اور ان سماجی تبدیلیوں کا سبب معاشی و سماجی مفادات، نظریات فرد، اور جغرافیائی حالات ہو سکتے ہیں۔ سماجی ارتقاء کے عمل سے گزرتے ہوئے انسان تعمیری کاموں میں شمولیت اختیار کرتا ہے۔ اور پھر اُن مقاصد کے حصول کے لیے ایک لائحہ عمل تشکیل دیتا ہے۔ اور بلاشبہ اس تعمیری و تخلیقی منصوبہ بندی میں اس کے فکر و تخیل اور مشاہدے کا خاص عمل دخل ہوتا ہے۔ انسان فطری ضروریات کے تحت مخصوص ماحول میں اپنے رجحان اور دلچسپیوں کی بنا پر نئی دنیا بناتا ہے۔ اور یوں معاشرتی تعمیر میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ انسان کی دلچسپیوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے فنونِ لطیفہ سب سے اہم اور دلچسپ کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ فنون لطیفہ انسان کے تخیلات و احساسات کے اظہار کے لیے پلیٹ فارم مہیا کرتا ہے اور یہ پلیٹ فارم بھی اسی سماج کی ہی دین ہے۔

اس حقیقت کو بھی تسلیم کر لینا چاہیے کہ سماج کا آپس میں بے جان چیزوں سے کوئی رشتہ نہیں۔ یہ رشتہ استوار کرنے میں بھی انسان اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ معاشرے کے ساتھ تعلق استوار کرنے میں بھی انسان کے باہمی تعلقات کا عمل دخل ہوتا ہے اور یہ رشتے مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں۔ خاندانی رشتے، سماجی، معاشی، سیاسی اور مذہبی رشتے، ان رشتوں کی نوعیت بھی بعض اوقات مختلف جگہوں پر مختلف صورت اختیار کر جاتی ہے۔ کہیں محبت، کہیں دوستی کہیں بغض اور کہیں دشمنی و عناد کے رشتے بنتے نظر آتے ہیں۔

انھی رشتوں کی بنیاد پر سماج کی عمارت کی تعمیر ہوتی ہے اور بعد میں ہی رشتے سماجی کلچر کی شکل میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ سماج ایک بے جان چیز ہے جو ایک جماعت کے بیچ انسان میں پائے جانے والے آپس کے گہرے رشتوں کی پہچان کراتی ہے۔ انسان پیدائش سے لے کر موت تک ایک ہی جماعت میں رہنا پسند کرتا ہے۔ اسی گروہی زندگی میں رہتے ہوئے وہ اصول و ضوابط اور قوانین بناتا بھی ہے۔ اور وہ معاشرے کی طرف سے قائم کردہ اُصولوں کو اپناتا بھی ہے۔ یہی سماجی اُصول انسان کو باہمی سطح پر جوڑے رکھتے ہیں سادہ لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ معاشرے کی طرف سے قائم کردہ قوانین اور اصول انسان کو سماجی بندھن میں باندھ رکھتے ہیں۔ اور جو فرد اُن اصولوں سے روگردانی کرتا ہے۔ وہ سوسائٹی کی نگاہوں سے گر جاتا ہے۔ یہ سماجی بندھن عقائد و نظریات کے اختلافات کی بنا پر مختلف صورتوں میں تشکیل پاتے ہیں ہر فرد فطری طور پر دوسرے افراد سے منفرد و شخصیت کا حامل ہی۔ ہر فرد فطری طور پر دوسرے

افراد سے منفرد شخصیت کا حامل ہوتا ہے۔ اسکی سوچ زاویہ نگاہ سوسائٹی کے دوسرے افراد سے مختلف ہوتی ہے۔ سوچوں کا تضاد شخصی اور انفرادی سطح پر علیحدہ نظریات کی تشکیل کرتا ہے۔ انسان کی فطرت میں مقابلے کا رجحان اور دوسروں کے ساتھ موازنے کی خواہش شامل ہے۔ وہ خود کا موازانہ دوسروں کے ساتھ کرتا ہے اور دوسروں سے بہتر زندگی گزارنے کی تمنا کرتا ہے۔ یہی آرزو اور تمنا سماج میں طبقات کو جنم دینے کا سبب بنتی ہیں اور یوں دیکھتے ہی دیکھتے انسان فطری یا منصوبہ بند طریقے سے سماج کو مختلف طبقوں اور ذات پات میں تقسیم کر دیتا ہے۔

خوداعتمادی و خودانحصاری کا جذبہ انسان میں سماج ہی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ زندگی کے ابتدائی ایام سے لے کر آخر تک وہ سماج پر ہی انحصار کرتا ہے۔ سماج کے بغیر انسان کی زندگی بے معنی اور بے مقصد ہو جاتی ہے۔ انسانوں میں پائی جانے والی اخلاقی اقدار، رویے، حسنِ سلوک، بول چال، اور اچھا برتاؤ وغیرہ جو چیزیں بھی ہماری تہذیب میں شامل ہیں اسی سماج کی ہی دین ہیں۔ سماج انسان کو ان گنت طریقوں سے متاثر کرتا ہے۔ جس طرح سماج کے بغیر انسان کی کوئی وقعت نہیں بالکل اسی طرح انسان کے بغیر سماج کی کوئی حیثیت نہیں۔ انسان کے دم قدم سے ہی معاشرے کا وجود بر قرار رہتا ہے بلکہ حقیقتاً سماج کی بنیاد انسان ہی بناتا ہے۔ انسان اگر اپنا وجود نہ رکھتے ہوں تو سماج کا وجود برقرار رہنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ انسان مہذب اور تعلیم یافتہ ہے اور اسکی یہی خصوصیت سوشل کلچر کی بنیاد رکھنے میں معاونت کرتی ہے۔ ایک مہذب اور باشعور انسان ہی سماجی قوانین کی بنیاد رکھتا ہے۔ تہذیب کو جنم دیتا ہے۔ تہذیبوں کے بدلنے سے سماج بدلتا ہے۔ سماج کے ڈھانچے کی تشکیل میں انسان کی اہمیت ریڑھ کی ہڈی کی سی ہے۔ جس طرح انسان ریڑھ کی ہڈی کے بغیر اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتا بالکل اسی طرح سماج کی حیثیت انسانوں کے بغیر بے وقعت اور بے معنی ہو جاتی ہے۔ اس لیے تو سماج اور انسان ایک دوسرے کیلئے لازم و ملزوم ہیں۔ سماجی / عمرانی ماہرین کے مطابق "فرد اور سماج کا تعلق گہرا ہے۔ یہ ایک ایسا رشتہ ہے جو اٹوٹ اور ناقابل شکست ہے۔"

فردِ واحد کی شخصیت پر سماج گھر، خاندان، محلے، مدرسے، سکول، یونیورسٹی، دفتر، شہر اور ملک کے مختلف روپ میں اثر انداز ہوتا ہے۔ اور سماج کی یہی منفرد صورتیں مختلف انداز میں فرد کی فکر و فن تقریر اور ذہنی و جذباتی رویوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اور ان تمام سماجی صورتوں کی تخلیق میں انسان کا ہی عمل دخل ہے اسی لیے معاشرہ اور فرد دونوں ایک ہی سکے کے دو رخ گردانے جاتے ہیں۔ معاشرے میں چونکہ افراد کبھی ایک دوسرے کے تعلق کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور ایک دوسرے کے ساتھ نفسیاتی تعلق میں بندھے ہوئے اپنی زندگی کی دوڑ میں مصروف ہیں اور اسی کا نام معاشرہ ہے۔ وہ ایک دوسرے کا شعور رکھتے ہوئے گروہی زندگی کو قائم رکھتے ہیں۔ معاشرے کے افراد میں یکسانیت کی وجہ سے "ہم" کا احساس پایا جاتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اور یکسانیت کے شعور کی بنیاد پر لوگوں

میں باہمی تعلق سے گروہ اور تہذیبیں وجود میں آتی ہیں۔ سماج کی بنیاد فراہم کرنے میں بہت سے عوامل اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔

معاشرہ یکسانیت کے بغیر نہیں رہ سکتا زبان، لباس، جذبات، اقدار وعادات، رسومات، عقائد، احساسات، جذبات وعقائد میں یکسانیت لوگوں کو ایک بندھن میں باندھے رکھتی ہے۔ اور اپنی مشترکہ صفات کی بناء پر تہذیب یا معاشرہ پروان چڑھتا ہے۔

معاشرہ صرف یکسانیت پر ہی قائم نہیں رہ سکتا۔ اگر زندگی میں تغیر و تبدل نہ ہو تو زندگی جمود کا شکار ہو جاتی ہے اور اس طرح معاشرتی ترقی کا عمل رک جاتا ہے۔ سماجی سطح پر مذہبی سیاسی، نسل، لسانی، تہذیبی اور معاشی اختلافات پائے جاتے ہیں جو سماجی تبدیلی کا باعث بنتے ہیں۔ لہذا یکسانیت کے ساتھ ساتھ اختلافات وانقلابات بھی معاشرتی نظام کے بنانے اور بگاڑنے میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔

جب کوئی شدید انقلاب یا تیز سماجی تغیر عمل میں آتا ہے تو معاشرے کی بنیادیں ہل جاتی ہیں اور سماجی تنظیم کا ڈھانچہ قائم ودائم رہنے کی بجائے ہلنے لگتا ہے۔ اس کے اجزاء یعنی گروہ اور افراد بکھرنے لگتے ہیں۔ معاشرے میں انتشار اور بے چینی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور معاشرہ بد نظمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں بہت سے سماجی مسائل بھی جنم لینے لگتے ہیں لہذا جہاں پر یکسانیت ہوگی وہاں پر تغیر کا ہونا بھی یقینی امر ہے۔ ''شکیل احمد'' اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''انقلاب اور سیاسی تغیرات کے سبب اکثر وبیشتر نئے اور زیادہ اہم سماجی مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ معاشرہ ان نئے حالات کیلئے تیار نہیں ہوتا۔ اچانک نئے حادثات سے قومی وسائل متاثر ہوتے ہیں لوگوں کے روزمرہ کے معمولی کاموں سے لے کر ملکی سطح کے اہم معاملات تک میں زبردست انقلاب پیدا ہو جاتا ہے یہ انقلاب اگر اجنبی اور متحارب تہذیبی گروہوں کی طرف سے ہو تو اس کے خوفناک اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ کیوں کہ ایسی صورتحال میں تہذیبی، فکری، لسانی اور معاشرتی غرض کے متعدد قسم کے اختلافی موضوعات سامنے آجاتے ہیں۔''[۱۰]

خانگی انفرادی زندگی سے لے کر مشترکہ یا اجتماعی زندگی تک کے روزمرہ کے مسائل سماجی مسائل کے دائرے میں آتے ہیں۔ انسانی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات حادثات اور انقلابات اور ان کے سبب پیدا ہونے والے مسائل جیسے، غربت، باہمی کشیدگی، انتشار، بد نظمی، نسلی امتیازات، ذات پات کا نظام طبقاتی امتیازات، اور خواتین کے مسائل وغیرہ سماجی مسائل کی ذیل میں آتے ہیں اور یہی مسائل اس وقت تک کسی بھی سماج کو متاثر کرتے رہتے ہیں جب تک ان کے حل کیلئے مناسب طریقے سے لائحہ عمل نہ اختیار کیا جائے۔ سماجی عوامل میں تہذیب و ثقافت کا بھی اپنا کردار ہے۔

ثقافت وہ راہ عمل ہے جو کسی معاشرے کے افراد اپنی معاشرتی زندگی میں اختیار کرتے ہیں۔ ثقافت دراصل معاشرتی زندگی کا کورس ہے۔ ہر معاشرہ اپنا جداگانہ انداز رکھتا ہے۔ اسکی شکل دوسرے معاشروں سے مختلف ہوتی ہے۔ اُن کے گروہی زندگی، معاشرتی معمولات، ادارے، اقدار، روایات اور مسائل بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ثقافت دوسری ثقافتوں سے مختلف ہوتی ہے۔ اور یہی ثقافت ہی معاشرے کو ساخت عطا کرتی ہے۔ ثقافت در حقیقت معاشرتی زندگی کی کتاب ہے جو معاشرے کے ہر فرد کو ملتی ہے اور یہ کتاب ہمیں اپنے آباؤاجداد سے ورثے میں ملتی ہے۔

ہمارا کھانا پینا، بولنا، چلنا، اٹھنا، بیٹھنا، ہمارے خیالات، نظریات، سوچ، وعادات، ہماری رسومات اور عقائد کے علاوہ ہمارے اخلاق و کردار کے نمونے، ہمارے اصول و ضوابط، قوانین، خانگی اقدار و روایات، اور معاشی زندگی اور اس سے متعلق جملہ مادی ساز و سامان ان، سب چیزوں کا نام ہی ثقافت ہے۔ ثقافت ایک وسیع تر اور جامع تصور ہے جس میں انسان کی پوری معاشرتی زندگی گردش کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ثقافت انسان کے سیکھے ہوئے رویوں کی تخلیق کا نام ہے۔ جس میں خیالات، عقائد و اقدار، علم اور مادی اشیاء سب شامل ہیں۔ ہم جو کچھ ہیں وہ تہذیب ہے اور ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ تمدن ہے اور انہی دونوں کے ملانے سے کلچر وجود میں آتا ہے۔ جبکہ ماہرین سماجیات نے تہذیب کو سماجی وراثت کہا ہے جس میں ہم زندگی گزرنے یا عمل و فکر کے ان سبھی طریقوں کو شامل کرتے ہیں جو ایک نسل سے دوسری نسل کو ملتے ہیں اور انہیں سماج قبول کرتا ہے۔ ثقافت، تہذیب اور کلچر ہم معنی ہیں۔ جن کے بنانے میں معاشرتی اقدار اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔ ڈاکٹر عابد حسین تہذیب و ثقافت کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

> "تہذیب نام ہے اقدار کے ہم آہنگ شعور کا جو ایک انسانی جماعت رکھتی ہے۔ جسے وہ اپنے جماعتی ادارات میں ایک معروضی شکل دیتی ہے۔ جسے افراد اپنے جذبات و رجحانات، اپنے سبھاؤ اور برتاؤ میں ان اثرات میں ظاہر کرتے ہیں جو وہ مادی اشیاء پر ڈالتے ہیں۔"[11]

یعنی تہذیب معاشرے کے اندر جنم لیتی ہے اور اس کی تخلیق اور اسے برقرار و قائم رکھنے میں افراد کی مشترکہ گروہی کاوش شامل ہے۔ یہی مشترکہ گروہی کاوشیں اور مضبوط سماجی روابط انسان کی معاشرتی زندگی میں سکون اور راحت لانے کا سبب بنتی ہیں۔ ایچ سوامی چھنیانند تہذیب کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "کسی ملک کے عوام کی تہذیب کو ان کی تخلیقی تحریکات کی پرورش ان کے اعمال کی راہنمائی اور رنج و راحت دونوں کیفیتوں میں ان کی آسودگی و آسائش و توازن اور سکون عطا کر کے ان کی خدمت کرنا ہی تہذیب ہے۔"[12]

تہذیب زمانی تغیر کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ تہذیب کے توسط سے ہی انسان کی سماجی، اقتصادی، اور معاشی زندگی کی قدیم صورت نئی اقدار کو جنم دیتی ہے۔ تہذیب کا ارتقاء تخلیقی قوتوں کے سبب ممکن ہوتا ہے۔ جبکہ اس کے برعکس وہ تہذیب روبہ زوال اور جمود کا شکار ہو جاتی ہے جہاں تخلیقی قوت نہ ہو۔ کلچر میں فنونِ لطیفہ۔ ادب، سائنسی ایجادات اور مذہب واقدار وغیرہ آتے ہیں۔ ایک دوسرے سے وابستہ عقائد اور اداروں کے نمونے کو ہی کلچر کا نام دیا جاتا ہے لہذا بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ کلچر انسانوں کے ایک طبقہ یا گروہ کے ذہنی، سماجی، اقتصادی، فنی اور مذہبی خصوصیات کا نام ہے۔ تہذیب ہماری ان اعلیٰ صلاحیتوں کا نتیجہ ہے جسے ابتدا میں انسان بروئے کار لائے اور بعد میں انہیں لوگوں کے لیے سماجی حقیقت بنادے۔ اس لحاظ سے تہذیب زندگی گزارنے کا ذریعہ ہے اور ایسی قدر جو زندگی کے کے اظہار اور مقاصد کے تعین کے علاوہ ایسے ماحول کو جنم دیتی ہے جس کے مطابق زندگی خود کو ڈھالنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ تہذیب کا سب سے بڑا مقصد ہی فطرت کو مسخر کرنا ہے۔ کائنات کے اندر موجودات کی تسخیر ہی اسکا اصل مقصد ہے۔ تہذیب سماج اور ادب تینوں کا آپسی رشتہ بہت گہرا اور مربوط ہے۔ جہاں پر زندگی ہے وہاں سماج ہے اور جہاں سماج ہو وہاں ادب کی تخلیق یقینی ہے۔ اور جس سماج میں ادب کے فروغ اور ارتقاء کیلئے سامان موجود ہو وہاں تہذیب کا ہونا بھی لازمی ہے۔ سماج ادب اور تہذیب باہم مربوط ہیں۔

کسی بھی سماج میں ایک انسان دوسرے افراد کے ساتھ تعلقات قائم کر کے معاشرتی تعمیر و ترقی کا وسیلہ بنتا ہے وہیں پر وہ سماج انسان کو سماجی بنا کر اس کی ترقی کیلئے راہیں بھی ہموار کرتا ہے۔ اور تہذیب کی تخلیق کا باعث بھی بنتا ہے۔ سماج کو سمجھنے کے لیے سماجی تعلقات کے معنی اور ان سے پیدا ہونے والے نظم وضبط کو سمجھنا بھی بہت ضروری ہے۔ ایک بے مثال تہذیب وہی ہو گی جہاں نسلی امتیازات، فرقہ واریت اور بد نظمی اور انتشار کا گلا گھونٹ دیا گیا ہو اور اسکی جگہ امن و آشتی ار فلاح و بہبود کے ساتھ ساتھ معاشرتی خوشحالی کا دور دورہ ہو۔ احترام آدمیت اور باہمی مساوات اور بھائی چارہ ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ سماج کا رشتہ تہذیبی وراثت کی ڈور سے منسلک ہوتا ہے۔ سماج کے افراد میں ایک تنظیم اور ہم آہنگی ہوتی ہے۔ سماج انسان کو زندگی کی اقدار کا شعور سکھاتا ہے۔ کائنات کی تمام مخلوقات میں انسان کا مرتبہ سب سے ارفع اور بلند ہے۔ اسکا ذہنی شعور اسے تمام مخلوقات سے ممتاز کرتا ہے۔ انسان اپنے ذہنی شعور سے کام لے کر ایک دوسرے سے مستفیض ہوتا ہے۔ اور اپنی زندگی کو بہتر سے بہترین بنانے کیلئے نئی نئی تدبیریں سوچتا ہے۔ سماج میں رہنے والے افراد سماج کی طرف سے عطا کردہ تجربات سے مستفید ہوتے ہیں اور انہی تجربات کے نتیجے میں اپنے تجربات حاصل کرتے ہیں۔ اور یوں تجربات کی ترسیل کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور بلاشبہ ان تجربات کی ترسیل میں افراد کا تخیل اور ذہنی وحسی شعور معاونت کرتا ہے۔ انسان اپنے تجربات کو سوسائٹی تک منتقل کرتا ہے۔ اور منتقلی اور

ترسیل کے لیے وہ مختلف طریقے استعمال کرتا ہے کبھی تحریری صورت میں تو کبھی کسی فن پارے کی صورت میں ،اصطلاح میں اسے آرٹ یا فنون لطیفہ کا نام دیا جاتا ہے۔ خطاطی، سنگ تراشی اور عمارات کی تعمیر، تخلیقی و تحریری ادب یہ سب چیزیں فنون لطیفہ کے ذیل میں آتی ہیں۔ یہی آرٹ سماج کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اور اسی کے ذریعے ہم ماضی، حال، اور مستقبل کی تصویریں دیکھ سکتے ہیں۔ آرٹ یا فنونِ لطیفہ کے بنیادی مقاصد میں سماجی حقائق کی ترجمانی شامل ہے۔ بقول اطہر پرویز:

"فن ہمارے اُن جذبات کا اظہار کرتا ہے جن میں گویائی کی قوت نہیں ہوتی۔ فن ہماری روح کو زبان عطا کرتا ہے۔ غیر معمولی مسرت اور بے انتہا غم انسان کو خاموش کر دیتا ہے۔ ہمارے خیالات اور احساسات کا کوئی ایسا گوشہ نہیں جو فن کے ذریعے ایک بڑی حد تک ظاہر نہ ہو سکتا ہو۔"[۱۳]

فن سماجی حقائق کے ساتھ ساتھ انسانی جذبات کا ترجمان بھی ہے۔ فنونِ لطیفہ انسانی سعی کے وہ حقیقی کمالات ہیں جن سے انسانی تہذیب نے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ فن کاری کے یہ نمونے عمارات، مجسموں، تصاویر اور تحاریر کی صورت میں آج بھی نظر آتے ہیں۔ انسان ہزاروں سالوں سے اپنے جذبات و احساسات اور خیالات کو نئی نسلوں تک منتقل کرتا آیا ہے۔ احساسات اور خیالات کے اظہار کا بہترین ذریعہ ادب ہے۔ ادب زندگی کی تنقید کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی مکمل تصویر بھی پیش کرتا ہے۔ اس کے علاوہ پورے سماجی نظام کا عکاس ہونے کے ساتھ ساتھ فرد واحد کے تخیلات اور محسوسات کو پلیٹ فارم بھی مہیا کرتا ہے اور اس کے علاوہ وہ سماجی نظام کی تعمیر و تشکیل میں بھی معاونت کرتا ہے۔ ادب سماج سے جنم لیتا ہے اور سماج کے ثقافتی ورثے، تغیرات زمانہ اور ماضی کو محفوظ بھی کرتا ہے۔ ادب اور زندگی کے باہمی تعلق کا ذکر کرتے کرتے ہی بے شمار سوالات ذہن میں ابھرتے ہیں۔ مثلاً ادب کیا ہے؟ کیا یہ خود کوئی مقصد ہے یا کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ؟ کیا ادب صرف انفرادی جذبات اور احساسات کا ترجمان ہے یا سماجی شعور کا عکاس بھی؟ ان تمام سوالات کے جوابات میں ہی ادب اور زندگی کے باہمی تعلق اور رشتے کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔ انسان جس ماحول میں رہتا ہے اسکا جس سماج کے ساتھ تعلق ہوتا ہے وہ ماحول اور سماج اس کے ادب سے ظاہر ہوگا۔ ہر ادبی تخلیق زندگی سے زندگی حاصل کرتی ہے اور اس کے مطالعے اور مشاہدے کے بعد ہم اپنے آپ کو زندگی سے زیادہ قریب محسوس کرتے ہیں۔ ادب دراصل ایک ایسی دستاویز ہے جس میں انسان نے جو کچھ دیکھا، سمجھا اور محسوس کیا اسے قلمبند بھی کیا۔ ادب کے اندر ہی انسانی تجربات کی یادگاریں نظر آتی ہیں۔ ادب کا رشتہ ماضی سے بھی اتنا ہی ہے جتنا حال سے ہے وہ مستقبل سے بھی اتنا ہی قریب ہے جتنا ماضی سے اور حال سے کیونکہ ادب میں انسانی زندگی آرزوئیں اور خواہشات بھی شامل ہوتی ہیں۔

ادب کے مفہوم کو سمجھنے کیلئے یہ جان لیناضرور ہے کہ ادب کیا ہے ؟اس حوالے سے ادب کی چند تعریفیں ملاحظہ ہوں :

ادب کیا ہے ؟ا"دب کے لغوی معنی ہر چیز کی حد کو نگاہ میں رکھنا،حفظِ مراتب ،لحاظ،تہذیب یا شائستگی کے ہیں۔"انگریزی زبان میں ادب کے لیے"Literature" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جس کے معنی ہیں علم یا سیکھنا۔ گریٹ انسائکلوپیڈیاڈکشنری میں ادب کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

"کسی ملک یا کسی عہد کی ایسی تحریریں جن کی قدروقیمت ان کی ہیت کی خوبصورتی یاان کے جذباتی اثر کی بنا پر ہو۔"۱۴

اسی طرح ویبسٹر(Webster)کی تھرڈ انٹر نیشنل ڈکشنری(۱۹۷۰ء)ادب کی تعریف یوں کرتی ہے۔

"وہ تحریریں جواعلیٰ درجے کی ہیتوں اور طرز اظہار پر مشتمل ہوں اور دائمی اور آفاقی خیالات کا اظہار کرتی ہوں۔"۱۵

یعنی کسی بھی سماج ملک یا کسی بھی عہد سے متعلقہ وہ تحریریں جن کی اہمیت اس مخصوص دور کے سماج کے جذباتی اثرات کی وجہ سے ہو۔ادب کہلاتی ہے۔ادب اپنے عہد کے سماج کی سوچ،خیالات وتاثرات اور اس عہد کے اندر ہونے والی سماجی تبدیلیوں کو اچھوتے انداز سے بیان کرنے کا نام ہے۔

یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ادب بلند تخیلات کے مالک افراد کی تحریریں جو اپنے جداگانہ اور منفرد اندازِ بیان اور آفاقی خیالات کا اظہار کریں۔ اور ان کے خیالات آئندہ آنے والی نسلوں کیلئے مشعلِ راہ کا کام کریں۔ گویا"ادب خیالات اور احساسات کا تحریری اظہار ہے جو پڑھنے اور سننے والے میں شخصی ردعمل پیدا کرے۔"یعنی پڑھنے یا سننے والا نہ صرف اس تحریر سے محظوظ ہو بلکہ اُسی تحریر سے اسکی سوچوں کو نیا رُخ مل سکے اور وہ اپنے اندر مثبت تبدیلیاں پیدا کر کے انفرادی سطح پر معاشرے میں اپنا کردار بھرپور طریقے سے ادا کرے۔پروفیسر آل احمد سرور ادب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"ادب زندگی کی عکاسی بھی کرتا ہے اور اسکی بدلتی ہوئی قدروں کی نشاندہی بھی کرتا ہے اسکی تصویریں کے متحرک ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں اسکی اپنی روح بھی شامل ہوتی ہے۔" ۱۶

زمانے میں جتنے بھی تغیر اور تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں ادب اُن سب کا ترجمان ہوتا ہے کیونکہ ادب ہماری خیالات پر تبصرہ کرتا ہے۔ ہاں اسکے انداز مختلف ہو سکتے ہیں۔ یہ تبصرہ چاہے افسانوں کی شکل میں ہو یاناولوں کی صورت میں یا پھر مقالوں کی ہیت میں۔ادب حقیقی معنوں میں حیاتِ زندگی کے چھوٹے چھوٹے پہلوؤں سے لے کر بڑے بڑے پہلوؤں کی ترجمانی کرنے میں ادب اپنا اہم کردار ادا کرتا آیا ہے اور آئندہ بھی کرتا رہے گا۔

اردو ادب کے مختلف ادوار کو بغور مطالعہ کریں تو صاف طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے کہ مختلف ادوار میں ہمارے معاشرے کے دل پر کیا بیتی،لوگوں نے کس انداز سے سوچا کیا دیکھا اور کیا چاہا ہے اس سب کا اظہار ہمارے

ادب میں ملتا ہے۔ ہمارا ادب ہی بتاتا ہے کہ دکن میں کس طرح لوگ قطب شاہی دور میں چین اور آرام کی زندگی گزرتے تھے۔ خدا کو یاد کرنے کیلئے ان کے پاس پر سکون دماغ، مطمئن دل اور پاکیزہ خیالات ہوتے تھے۔ ابتدائی دور میں اولیاء ادب سے تبلیغ اسلام کا کام لیا کرتے تھے اور اس دور میں تصوف کی کتابیں لکھیں یہ سب اس زمانے کے ادب میں نظر آتی ہیں۔

اس کے بعد اگر زمانے میں تغیر آیا اور وقت نے پلٹا کھایا تو مسلمانوں کی سلطنت برباد ہوتی نظر آنے لگی اور انگریزوں کے اقتدار کے ساتھ ہی لوٹ مار اور افراتفری پھیل گئی۔ اس وقت کے معاشرے میں خون کی ندیوں کا بہہ جانا اور آباد بستیوں کا ویران ہو جانا۔ یہ تمام نقشے اس بیتے ہوئے زمانے کے ادب میں متحرک نظر آتے ہیں۔ میر امن کی باغ و بہار، حیدر بخش حیدری کی آرائش محفل اور فورٹ ولیم کالج کے دیگر مصنفین اور مولفین کی مختلف کتابیں ہی بتاتی ہیں کہ کس طرح دل کی آگ کو بجھانے کیلئے لوگ اپنے دشمن انگریزوں کی سرکار میں جا کر سلام کرتے تھے اور دعا کرتے تھے کہ اقبال اُن کا قائم رہے۔ جب تک گنگا جمنا بہے۔ نذیر احمد دہلوی کے مختلف ناول یہ پیش کرتے ہیں کہ اس دور میں مذہب کا مفہوم مختلف لوگوں کے ذہن میں کیا تھا۔ مذہب اور لا مذہبیت کا معیار کیا تھا۔ انگریز مسلمانوں سے اور مسلمان انگریزوں سے کس طرح ملتے تھے۔ اسی طرح فسانہ آزاد میں لکھنو کے معاشرے کی مسخ شدہ خصوصیات اور وہاں کے لوگوں کی خود فریبی صاف نظر آتی ہے جن نے ان کو خوبی بنا دیا تھا۔ شرر کے ہاں وہ احتجاج صاف نظر آتا ہے جو انگریزوں کی غلط بیانی اور اسلامی تاریخ کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کا نتیجہ ہے۔ ساتھ ہی وہ مسلمانوں کے ماضی کی تابناکی کا اظہار جوش دلانے کو کرنا چاہتے تھے۔ مرزا رسوا نے معاشرے کے اس پہلو کو آئینہ دکھایا ہے جسکی چمک دمک سے لوگ چھپ کر لطف اُٹھانا چاہتے تھے۔ پریم چند نے ادب کی تصاویر کا کینوس بڑھا دیا۔ ان کے ادب میں شہر اور دیہات دونوں جگہ کے ہر طرح کے انسانوں کی جذبات نگاری ملتی ہے۔ اسی طرح پریم چند کے بعد سے لے کر موجودہ زمانے تک تمام نثر نگار ادیب، شعراء اور افسانہ نگار اپنے ماحول کو اپنی تحریروں میں پیش کرتے رہے ہیں۔

سب سے پہلے جس نے ادب کی معقول تعریف کی اور ادب اور زندگی میں مطابقت پیدا کرانے کی کوشش کی وہ میتھیو آرنلڈ تھا اُس نے ادب کی جو تعریف کی ہے وہ آج تک ضرب المثل ہے اس نے ادب کو زندگی کی تنقید بتایا ہے۔

کامیاب ترین ادب وہ ہوتا ہے جو حال کا آئینہ ہو اور مستقبل کا اشاریہ ہو۔ جس میں واقعیت اور تخلیت ،افادیت اور جمالیت ،ایک آہنگ ہو کر ظاہر ہوں۔ اور اس میں اجتماعیت اور انفرادیت دونوں مل کر ایک مزاج بن

جائیں جو ہمارے ذوق حسن اور ذوق گل دونوں کو ایک ساتھ آسودہ کر سکے۔ عزیز احمد ادب کے موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ادب زندگی کا پابند ہے۔ جو زندگی سے گریز ہی نہیں کر سکتا۔ انقلاب سے ہمیشہ متاثر ہوتا ہے۔ کبھی کبھی وہ انقلاب کے پیش رو بھی بن جاتا ہے۔ کیونکہ وہ صاحب دماغ آدمیوں کا آلہ کار ہوتا ہے۔ ١٧

ادب تخلیق کرنے والا بھی چونکہ فرد ہوتا ہے۔ اگر اس کا دل و دماغ معمول کے مطابق کام کر رہا ہو اور غیر معمولی کیفیات سے دو چار نہ ہو تو فرد ادب تخلیق نہیں کر سکتا۔ اس کے خیالات اور جذبات میں ہیجان یا تلاطم ہی اسے قلم اٹھانے پر مجبور کرتا ہے۔ اور وہ جب تک اپنے خیالات کو تحریری شکل میں نہ آئے اسکی وہ مضطربانہ کیفیت برقرار رہتی ہے۔ یا یوں کہیے کہ اُسکی شخصیت بے چین نظر آتی ہے۔ اس بے چینی کے عالم میں وہ جو کچھ تحریر کرتا ہے وہی در حقیقت ادب کی حقیقی اور ظاہری شکل ہو گی اور آفاقیت کا رنگ لیے ہوئے ہو گی۔ انسان کے ذہن میں ایسی غیر معمولی کیفیات اسی وقت پیدا ہوتی ہیں۔ جب اس کا ذہن محسوس کرے کہ دنیا اُس کی منشاء و رضا کے مطابق نہیں چل رہی۔ انفرادیت اُسی وقت بیدار ہوتی ہے جب مختلف قسم کے مصائب و رکاوٹیں اور مشکلات اُس کی راہ میں حائل ہو جائیں۔ اور اُسے نارمل انداز سے زندگی نہ گزارنے پر مجبور کریں۔ ذہن کو اپنی برتری کا احساس بھی اُسی صورت میں ہوتا ہے جب ایسی مشکلات اور تکلیفیں اس کی راہ میں مزاحمت پیدا کریں۔ اُسے سخت قسم کی کوئی روحانی یا ذہنی تکلیف ہو۔ اور وہ تکلیف یا اذیت اُسے اس حد تک کمزور کر دے کہ وہ اپنے خیالات و جذبات کو تحریری صورت میں لے آئے۔ یعنی نارمل زندگی گزارنے کے رشتے میں مزاحمت ڈالنے والی رکاوٹیں یا حالات ہی انسان کو لکھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے تو یہ بات درست ثابت ہو جاتی ہے کہ ادب جو کچھ بھی ہے یا ادب کے اندر جو کچھ بھی شامل ہوتا ہے اس کا تعلق فرد یا افراد کی زندگی سے ہوتا ہے۔ وہ خارجی محرکات ہی اسکے اندرونی جذبات میں ہیجان برپا کرتے ہیں اور نتیجہ ادب کی تخلیق کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ کسی بھی ادب کے اندر مندرجہ ذیل خصوصیات کا ہونا لازم ہے۔

ادیب ایک مخصوص اجتماعی نظامِ تمدن کا پروردہ ہوتا ہے جس طرح کہ کوئی دوسرا فرد۔ اور ادب بھی براہ راست ہماری معاشی اور سماجی زندگی سے اسی طرح متاثر ہوتا ہے جس طرح ہماری دوسری حرکات و سکنات۔ ادیب یا شاعر جو کچھ بھی لکھتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک اندرونی اپج سے مجبور ہو کر لکھتا ہے اور بظاہر یہ انفرادی چیز معلوم ہوتی ہے۔ لیکن دراصل یہ اپج مجموعی طور پر پورے تمدن کا عکس ہوتی ہے۔

یعنی مصنف یا ادیب اپنے داخلی خیالات اور احساسات کو تحریری صورت میں لانے کیلئے خارجی حالات و اسباب کا بھی محتاج ہوتا ہے۔ جو اُسے سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ یعنی ادب کسی بھی مصنف کے داخلی و خارجی تجربات کا نچوڑ ہوتا ہے۔ خارجی سطح پر سماجی قوتیں اسکے لیے تحریک کا کام کرتی ہیں۔

ادب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ایک مخصوص عہد کی ترجمانی کرتا ہے یعنی ہر دور میں اسکی یکسانیت برقرار نہیں رہتی بلکہ ادب بدلتا رہتا ہے۔ زمانے اور حالات کے تغیر و تبدل ادب پر بھی اثرانداز ہوتے ہیں۔ جس طرح ہر چیز تاریخ یا زمانے سے مجبور ہوتی ہے بالکل اسی طرح ادب بھی مجبور ہوتا ہے۔ تاریخی جبر صرف اقتصادیات و معاشیات اور عمرانیات ہی کا قانون نہیں ہے۔ ادبیات کی دنیا میں بھی قدرت کا یہی اٹل قانون جاری و ساری رہتا ہے۔ اس پر بھی زمانی تغیر و تبدل اثرانداز ہوتے رہتے ہیں۔ کسی بھی ادبی پیداوار کی خصوصیت سے پہلے ہو اور نہ وقت کے بعد۔ یعنی جس وقت یا عہد کی ترجمان ہو وہ اُسی دور میں لکھی جائے۔ کیونکہ اگر وہ ادبی پیداوار مخصوص وقت گزر جانے کے بعد لکھی جائے یا پہلے سے قیاس آرائیوں سے کام لے کر اُسے تخلیق کیا جائے تو وہ اپنی داخلی معنویت کھودیتی ہے۔ شاہکار تسلیم نہیں کی جاتی۔ ایسی ادبی پیداوار بالکل بے معنی اور بے کار ہوتی ہے۔ اور اسکا تاریخ میں کوئی نام و مقام نہیں ہوگا۔

ادبی تخلیقات یا ادب تاریخ کا حصہ ہوتی ہے اس لحاظ سے ادب تاریخ کا کام بھی کرتا ہے اور مخصوص عہد میں مخصوص سماج یا تمدن کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ کیونکہ وقت اور حالات کبھی بھی رکے نہیں ان میں آئے دن تغیر اور تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں جو کل تھا وہ آج نہیں اور جو آج ہے وہ آنے والے کل میں نہیں ہوگا۔ لہذا جس وقت، جس دور میں، جس تہذیب یا معاشرے اور سماج میں جو کچھ چل رہا ہوگا اُسے اُسی دور کے تخلیق کار اپنی تحریروں کی صورت میں محفوظ کرلیں تو مناسب ہوگا اور وہی تحریری مواد آنے والے وقتوں میں تاریخ کی صورت اختیار کرلے جو مستقبل کی نسلوں کے لیے سرمایہ حیات ہوگا۔

دنیا کے ادبیات کا اگر تاریخی مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ زندگی کے اور شعبوں کی طرح ادب بھی انہیں حالات و اسباب کا نتیجہ ہے جن کو مجموعی طور پر ہیئتِ اجتماعی یا نظامِ تمدن کہتے ہیں۔

ادب انسان کے جذبات و خیالات کا ترجمان ہوتا ہے۔ اور انسان کے جذبات و خیالات زمانے اور ماحول کے تابع ہوتے ہیں۔ لہذا جیسا دور اور جیسی معاشرت ہوگی، جیسا سماج ہوگا ویسے ہی جذبات و خیالات ہوں گے اور پھر ویسا ہی ادب ہوگا۔ ڈاکٹر سید نورالحسن ہاشمی ادب کی خصوصیات کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ :

> ''ادب وہ سخنہائے گفتنی یا شنیدنی ہیں جو اپنی موضوع کی جدت اور حسنِ بیان کی چمک کے باعث لائق کشش ہوتے ہیں۔ یا پھر ادب نام ہے کسی حقیقت کے حسین ترین اظہار کا۔ ادب ایک چمکتا ہوا سورج ہے جس میں حرارت اور چمک دونوں کا ہونا ضروری ہے۔ بعض اوقات لوگ محض چمک ہی سے مسحور ہو جاتے ہیں لیکن سچا اور پائدار ادب وہی ہے جس میں حرارت بھی ہو۔ ورنہ خالی چمک دمک چاند کی روشنی کی طرح محض خالی

اور اور شرارہ کی چمک کی طرح وقتی ہوتی ہے۔ حرارت کا تعلق ادیب کے دل ودماغ سے ہوتا ہے اور چمک یا حُسن کا تعلق اُس کے فن سے ۱۸

ادب کی ایک خصوصیت عالمگیریت بھی ہے یعنی ادب آفاقی نوعیت کا ہونا چاہیے۔ ادب صرف مخصوص عہد کیلئے ہی کار آمد نہ ہو بلکہ ہر دور کے لوگوں اور ہر عہد کے لوگوں کے لیے مفید ہو۔ بلکہ ہر سماج کے لوگوں کیلئے بھی مفید ہو۔

ادب ساخت اور خوبیوں کے لحاظ سے ایسا ہونا چاہیے جو اپنی معنی خیزی کی وجہ سے دوسرے لوگوں کو متاثر کر لے اور ادب کی مقصدیت سے لوگ آگاہ ہو سکیں اور پڑھنے اور سننے والے اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ یعنی ادب میں صرف فنی محاسن کا ہونا ہی ضروری نہیں جو اسکی ظاہری خوبصورتی کو برقرار رکھے بلکہ اس کے اندر ایک داخلی معنویت بھی ہو اور اس کے اندر ایک مقصدیت بھی ہو کیونکہ ادب مصلح کا کام بھی کرتا ہے۔ اور معاشرتی اصلاح کا کام بھی کرتا ہے لہذا ادب کو بامقصد بھی ہونا چاہیے۔

ادب تہذیبی روابط کا تعین کر کے تہذیبی رشتوں کو ایک کڑی میں پرو دیتا ہے۔ ادب کا تعلق سماج سے ہوتا ہے۔ کسی بھی سماج سے تعلق رکھنے والے افراد کا اپنے تجربات کا خیالات اور مشاہدات کا اس انداز سے تحریر کرنا جس کی اہمیت ان کے طرز بیان کی خوبصورتی کی بنا پر ہو اور اُن کے خیالات آفاقی نوعیت کے ہوں اور خیالات و تجربات کسی مخصوص خطے یا سماج کیلئے مخصوص نہ ہوں بلکہ ان سے ہر طرح کا سماج اور ہر زمانے کا سماج مفید ہو سکے۔ یہی ادب کی حقیقی تعریف کہلاتی ہے۔

ادب تاریخ بھی ہے جس میں کسی ملک یا کسی قوم کے دور بہ دور بدلتے ہوئے تمدن کی مسلسل تصویریں نظر آتی ہیں۔ البتہ اس کیلئے دیدہ بینا درکار ہے۔ فنون لطیفہ بالخصوص ادبیات کسی نہ کسی حد تک قوموں کے عروج وزوال کا آئینہ ضرور ہوتے ہیں۔ ادب میں عصری میلانات کا ہونا بھی ضروری ہے۔ "ایمرسن "کہتا(Emerson) ہے کہ:

> "ہر دور کو خود اپنا قوی ادب(Classics) پیدا کرنا چاہیے یعنی ہر ادبی کارنامے میں ان عصری میلانات و خصوصیات کا ہونا ضروری ہے جن کیلئے جرمن زبان میں(Zeitgiest) کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ اور جس کے معنی روحِ عصر کے ہیں۔ آج محض حسن کاری کو ادب نہیں کہتے۔ ادب اگر ملک اور زمانہ کے تازہ ترین فکریات (Idealogy) یعنی اجتماعی خیالات وافکار کا حامل نہیں ہے تو وہ صحیح معنوں میں ادب نہیں ہے۔'
>
> ۱۹'

یعنی ادب کسی بھی تہذیب یا معاشرے کے عصری تقاضوں اور ضروریات کو پورا کرتا ہو۔ وہ صرف ذاتی افکار کا مالک نہ ہو بلکہ اس کے اندر اجتماعیت کا تصور ہو۔ بے شک ایک وقت میں ایک تحریر ایک فرد ہی لکھتا ہے لیکن وہ اپنے ذہن میں اُن معاشرتی مقاصد کو رکھ کر تخلیق کرے جن کا تقاضا اُس عہد کا سماج یا حالات و واقعات کرتے ہیں۔

اُس عہد کا نظریہ کیا ہے؟ سماجی ترقی یا سماجی انتشار کے حوالے سے لوگوں کا مطمع نظر کیا ہے؟ معاشرے میں بہتری اور اصلاح کیلئے کن اقدامات کی ضرورت ہے؟۔ان تمام باتوں سے نہ صرف ادیب کو آگاہی ہو بلکہ وہ اپنی تحریروں کے ذریعے اصلاح معاشرہ کا بھی فریضہ انجام دے۔ لہذا ادب کی خصوصیات میں ایک یہ صفت بھی ضروری ہے کہ اس میں عصری میلانات موجود ہوں۔

ادب میں لچک بھی ہونی چاہیئے یعنی ادب زمانے کے تغیرات اور تبدیلیوں کو خوش آمدید کر کے اپنے اندر سمونے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔

شاہکار ادب یا ادبی تخلیق صرف اسی صورت میں وجود میں آسکتی ہے جب اس میں مقصدیت ہو۔یعنی ادب کو با مقصد ہونا چاہیے، معاشرے کا عکاس ہونا چاہیے۔ ادب میں لچک ہونی چاہئے۔ ادب عصری میلانات اور عصری تقاضوں کو پورا کرتا ہو، داخلی اور خارجی حالات و تجربات کا نچوڑ ہو، تہذیبی روابط کا تعین کرتا ہو۔ ادب مصلح ہو اور معاشرتی اصلاح کا فریضہ انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہو،ادب میں انفرادیت ہو۔انسانی حیات پر تبصرہ کرتا ہو یعنی تنقید کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ادب تحریک پیدا کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ادب تغیر زندگی بھی ہو اور تصویر زندگی بھی۔ ادب کسی بھی سماج کے انفرادی شعور اور اجتماعی شعور کا ترجمان بھی ہو۔ادب حال کا آئینہ اور مستقبل کا اشاریہ ہو۔

ادب زندگی کا اظہار ہے۔ادب معاشرے کی ظاہر و باطن کا آئینہ دار ہے۔ جو کچھ معاشرے کے اندر ہو رہا ہے۔ جو کچھ معاشرے پر گزر رہی ہے۔ ادیب کی تحریر اس کا احاطہ کرتی ہے ۔۔ نیا احساس اور نیا شعور ادب کے وسیلے سے اجنبی بن کر داخل ہو جاتا ہے۔ لیکن آئینہ آہستہ آہستہ ہمارا دوست بن جاتا ہے۔ادب ہی وہ واحد وسیلہ ہے جس کے ذریعہ ایک معاشرہ اپنی حقیقی روح دریافت کرتا ہے۔ آگے بڑھتی زندگی کے معنی دریافت کرتا ہے۔ عہد حاضر اور آنے والے دور کے حوالے سے نیا شعور حاصل کرتا ہے۔ ادب کا کام زندگی کو آگے بڑھانا ہے ۔اور یہی ادب اور معاشرے کا گہرا بنیادی رشتہ ہے۔ اسی رشتہ سے حب الوطنی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور زندہ رہتا ہے اور اسی حوالے سے ادیب اور مملکت کا تعلق قائم رہتا ہے۔ اور ادیب کی آواز معاشرے کے ضمیر کی آواز بن جاتی ہے۔ زبان کی جڑیں تہذیب میں ہیں ادب تہذیب کا چہرہ ہے اگر وہ واقعی ادب کا چہرہ ہے تنقید کے عمل میں آپ تاریخ اور تہذیب سے صرفِ نظر کر ہی نہیں

سکتے۔ادب چونکہ لفظوں کی ترتیب و تنظیم سے وجود میں آتا ہے اور لفظوں میں جذبہ و فکر بھی شامل ہوتے ہیں اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ لفظوں کے ذریعہ جذبے احساس یا فکر و خیال کے اظہار کو ادب کہتے ہیں۔

ادب کے حوالے سے توجہ طلب جو بات ہے وہ یہ کہ ادب زندگی کی کسی چیز کا بدل نہیں ہے اگر اس کی حیثیت کسی چیز کے بدل کی ہے تو پھر وہ ادب نہیں ہے۔ادب ایسا اظہار ہے جو زندگی کا شعوری ادراک حاصل کرنے کیلئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ادب کے اندر انسان کے سوچ اور خیالات کو ابھارنے کی زبردست قوت موجود ہوتی ہے۔اور پڑھنے والا اس سے آگاہ بھی ہو جاتا ہے۔اس کے علاوہ انسان میں موجود خفیہ صلاحیتوں اور انفرادی خصوصیات کو ابھارنے کی بھی خصوصیات موجود ہوتی ہیں۔ادب ہمیں زندگی کا شعور دلاتا ہے اور زندگی گزارنے کے اُصول اور طریقے بھی سکھاتا ہے ادب کے ذریعے ہم دوسروں کے تجربات میں شریک ہوتے ہیں۔اور ادبی سطح پر انسان اپنی ذات سے بلند ہو جاتا ہے۔

ادب زندگی میں نئے معنی تلاش کرنے کا دوسرا نام ہے۔اور ہم ادب سے ہی زندگی کا شعور حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔اور اسی شعورِ حیات کے سبب ہم بدلتے ہیں۔زندگی کے ایسے تجربات جن سے ہمیں واسطہ پڑا ادب کے ذریعے براہِ راست ہمارے تجربے بن جاتے ہیں اور ہمارے افکار و خیالات کے انداز کو بدل دیتے ہیں۔ادب ایک ایسا جھوٹ ہے جو بظاہر ہمیں سچائی کا شعور دلاتا ہے۔اس لیے انسان جب تک زندہ ہے اسے ادب کی ضرورت پڑتی رہے گی۔ بظاہر شاعری افسانے اور ناول وغیرہ فرضی اور جھوٹے ہوتے ہیں۔ لیکن یہی ہمیں زندگی کے تجربات کا شعور دلاتے ہیں اور ہم معاشرے میں کامیاب زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

ادب کا کام زندگی میں معنی تلاش کرنا ہے اور ان رشتہ ماضی سے قائم کر کے مستقبل سے جوڑ دینا ہے۔ادب کا حوالہ خود زندگی ہے اور اسے آگے ہی آگے بڑھاتا ہے۔ادب انسان کے تجربات کے مکمل علم و آگاہی ہی کا نام ہے اور یہ علم و آگاہی وہ غیر معمولی مرتب و منظم صلاحیت ہے جس کے اظہار کی صلاحیت صرف باشعور دردمند انسان کے پاس ہے۔وہ انسان جو نہ صرف اس کے اظہار پر قدرت رکھتا ہے بلکہ جس کا اظہار سچا بھی ہے اور حسین بھی، مکمل بھی ہے اور موثر و مثبت بھی۔اسی لئے ادب تنقید حیات ہے۔

ادب کا صحیح مفہوم اس کی لغت میں ہی مضمر ہے۔ادب ہماری زندگی کی علامت ہے جس کو سماجی زندگی کہتے ہیں۔ادب کے معنی ہیں سب سے مل جل کر رہنے کا طریقہ و سلیقہ اور ادب یعنی لٹریچر دراصل اسی سلیقے کا غیر شعوری نتیجہ ہوتا ہے۔ مختصراً ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ادب سماجی زندگی کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا۔اگر انسانی دنیا میں یہ ممکن ہوتا کہ ہر فرد اپنی علیحدہ زندگی بسر کرتا اور دوسروں سے برائے نام بھی کوئی تعلق نہ ہو سکتا تو نہ سماج کا وجود ہوتا نہ

اقتصادیات کا اور نہ ادب کا اس لیے کہ یہ اس وقت غیر ضروری چیزیں ہو تیں۔ تخیل کی ہر پیداوار اس واقعی دنیا کا عکس ہوتی ہیں۔ جس میں صاحب تخیل زندگی بسر کر رہا ہے۔اس لیے ادب بھی اس تعلق کا نتیجہ ہے جو ادیب کو اپنے زمانے کی دنیا کے ساتھ اور اس دنیا کو اس ادیب کے ساتھ ہوتا ہے۔ یعنی ادب سماجی تعلقات کے اظہار کا نام ہے اور سماجی تعلقات کو فروغ دینے کا ذریعہ بھی ہے۔

ادب اور سماج کا باہمی تعلق

کسی بھی سماج سے آگاہی حاصل کرنے کا ایک بہترین اور موثر ذریعہ ادب ہے۔ کوئی بھی ادبی تخلیق ہو وہ مکمل طور پر اپنے سماج کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ چونکہ سماج انسانوں کے دم قدم سے وجود میں آتا ہے۔ اور انسانوں کے گروہ ہی سماج کی تشکیل و ترقی میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں لہذا سماج کے اندر ہی سے ادبی تخلیق کار جنم لیتے ہیں۔ یعنی ادب تخلیق کرنے والوں کا تعلق بھی کسی نہ کسی سماج سے ہوتا ہے۔ اور وہ اپنے دور میں اپنے مخصوص خطے جن سے ان کا تعلق ہو اپنی تخلیقات میں اُن کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ لہذا سماج سے ادب کے رشتے کو سمجھنے اور جانچنے کے لیے کسی بھی سماج سے تخلیق کار کے مضبوط رشتے کو جاننا اور سمجھنا بھی نہایت ضروری عمل ہے۔

ادب اور سماج باہم دگر پیوست ہیں دونوں کا تعلق بہت گہرا ہے اور دونوں ہی ایک دوسرے کیلئے لازم و ملزوم ہیں۔ ادب تخلیق کرنے والا معاشرے میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔ اس لیے ایک قلم کار یا ادیب ہی اپنے متعلقہ معاشرتی پہلوؤں کو اپنی تحریروں میں جگہ دے کر معاشرے والوں کے سامنے لاتا ہے اور عوام کو ان کے مسائل سے روشناس کرواکر اُن کے حل کے لیے نئی راہیں بھی متعین کرتا ہے۔ ادب کی جڑیں ابتدائی دور کے انسان کی تحریروں میں نظر آتی ہیں۔ جیسے جیسے تحریر و ترقی ہوئی ویسے ویسے زندگی اور سماج کی تاریخ ادب کی شکل میں نظر آنے لگی۔

پانچ ہزار سال قبل جب انسان نے پڑھنا لکھنا شروع کیا تب سے اس نے اپنے تجربات و مشاہدات اور اپنی داخلی کیفیات اور تاثرات کو قلمبند کرنا شروع کیا۔ انسان نے دنیا میں آکر جو کچھ دیکھا اور اس سے جو کچھ سیکھا اور اچھے اور برے تجربات و تاثرات جو بھی اس نے حاصل کیے وہ اُن تاثرات کو اپنی تحریروں میں مختلف انداز سے جگہ دیتا گیا۔ اس لئے ادب زندگی کا نقاد، زندگی کی حقیقت اسکی مختلف صورتوں، زندگی اور سماج کے تعلق، زندگی بسر کرنے کے مختلف طور طریقے، رہن سہن، اقتصادی اور مادی ترقی، طبقاتی سماج، سیاست اور اس کی ضرورت، مذہب، آرٹ، کلچر، ابتدا سے اب تک کے انسانی مساوات اور اُن کے خونی نتائج و حادثات و انقلاب اور قوموں کے عروج زوال کی کہانی سمجھا جاتا ہے۔ ادب کو سماج کا آئینہ بھی اسی لیے کہا گیا ہے۔ اگر سماج کا وجود نہ ہوتا تو ادب بھی جنم نہ لے سکتا۔ کوئی بھی سماج ہو اس کی ترقی و تنزلی کا اندازہ اس دور کے ادب سے لگایا جاسکتا ہے۔

جس دور کا جیسا سماج ہو گا ویسا ہی ادب بھی ہو گا۔ اور اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سماج تغیر پذیر ہوتا ہے۔ اور یہ بھی زندگی کی مانند متحرک اور ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ اسی لئے ادب کا تغیر پذیر ہونا بھی لازمی ہے۔ زندگی ہر لحظہ بدلتی رہتی ہے اسی طرح بدلتی ہوئی زندگی کی مانند ادب بھی کروٹیں بدلتا رہتا ہے۔ اور اس میں بھی

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ زندگی کبھی جمود کا شکار نہیں ہوئی۔ اور نہ ہی کبھی ایک منزل پر ٹھہرتی کبھی وہ ترقی کی طرف گامزن ہوتی ہے اور کبھی مائل بہ زوال ان تبدیلیوں کے اثرات ادب پر بھی مرتب ہوتے ہیں۔ جب زندگی کروٹ بدلتی ہے تو سماج بھی اسی انداز سے بدلتا ہے۔

پرانے زمانے سے لے کر آج تک جب ہم ادب پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ہر دور میں انسان اور اسی کی معاشرت ماحول کے لحاظ سے اس کے ادب میں بھی مختلف انداز سے کروٹیں لیتی رہی ہے۔ کوئی بھی ایسا دور نہیں گزرا جب انسانی تاریخ انسانی ادب پر اثر انداز نہ ہوئی ہو۔ ادب کسی بھی دور کا ہو اور کسی بھی انسانی تاریخ سے اس کا تعلق کیوں نہ۔ انسانی تاریخ انسانی ادب پر اثر انداز نہ ہوئی ہو۔ ہر دور کا ادب اپنے سے متعلقہ افراد کی تقل و حرکت ، تحریکات، خیالات اور نظریات کی عکاسی سے خالی نہیں۔ انسان نے جب بھی اپنے خیالات کو رواج دینا چاہا اپنی الجھنوں کا تذکرہ کرنا چاہا تو وہ سب باتیں ادب میں شامل کرتا گیا۔ یہاں تک کہ تصویری دور میں جب انسان اپنے خیالات و جذبات کی ترجمانی مصوری کی شکل میں یا مختلف تصاویر بنا کر کیا کرتا تھا اس وقت بھی ادب میں انسانی ضروریات، سماجی کشمکش اور اس کے جذبات کا اظہار ہوا کرتا تھا۔

ادیب یا تخلیق کار بھی ایک سماجی فرد ہے وہ جس طرح کے سماج میں رہتا ہے اور سماج سے جس طرح کے اثرات قبول کرتا ہے وہی اثرات اپنی تخلیقات میں ثبت کرتا چلا جاتا ہے۔ لہذا اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ادب اور سماج ایک ہی سکے کے دو رخ ہوں۔ اور دونوں نہ صرف ایک دوسرے کیلئے لازم و ملزم ہیں بلکہ ایک دوسرے پر اپنے اثرات بھی مرتب کرتے ہیں۔ ادب سماج کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا اور سماج ادب کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ادب اگر مثبت ہو گا اور اصلاحی پہلوؤں کو جگہ دے تو وہ معاشرے میں امن، خوشحالی اور معاشرتی ترقی کا باعث بنے گا اور معاشرے کے افراد کو بیدار کر کے انہیں باعمل انسان بنانے میں کسر نہیں چھوڑتا۔ اور معاشرے کی اصلاح کا ضامن بنتا ہے۔ بالکل اسی طرح اگر ادب منط قی نوعیت کو مدنظر رکھتے ہوئے تخلیق کیا گیا ہو تو وہ معاشرے پر اپنے منفی اثرات مرتب کر کے معاشرتی تباہی کا باعث بنے گا۔ اسی طرح سماج ادب تخلیق کرنے کا باعث بنتا ہے سماجی عناصر، سماجی تبدیلیاں، سماجی ردوبدل اور اونچ نیچ کے ساتھ ساتھ سماجی ترقی اور سماجی مسائل اور افراد ادب پر اپنے نقوش مرتب کرنے کا باعث بنیں گے۔ اور یہی سماجی عوامل ادب کی تخلیق میں ممدو معاون ثابت ہوں گے۔

ادب معاشرے کا آئینہ دار ہوتا ہے اور اپنے سماجی مسائل کا عکاس بھی۔ اور سماجی تبدیلیاں زندہ معاشرے کو ظاہر کرتی ہیں۔ کسی بھی سماج میں یہ تبدیلیاں اور انقلابات وقتاً فوقتاً تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اور ان کا اثر وقت گزرنے

کے ساتھ ساتھ ادباء اور ان کی تخلیقات پر بھی پڑتا ہے۔ ادب میں کہاں سماجی پس منظر اور مسائل کی جھلک پیش کی جاسکتی ہے اس سلسلہ میں ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

"ادب میرے خیال میں زندگی، تہذیب، کلچر کا عکاس ترجمان اور نقاد ہوتا ہے۔ میرے خیال میں ادب ایک سماجی عمل ہے۔ اور چونکہ سماجی زندگی ہر لمحہ اور ہر آن تغیر و تبدل سے ہم آغوش و ہم کنار رہتی ہے اس لیے ادب بھی تغیرات و انقلابات کے سانچوں میں ڈھلتا رہتا ہے اور ہر دور کے ادب میں اس وقت کی سماجی تصویروں کا آنا ضروری ہے کیونکہ ادب ہر حال میں سماجی زندگی ہی کے درمیان پیدا ہوتا، پلتا، بڑھتا اور پروان چڑھتا ہے۔ کسی قسم کا کوئی ادب اپنے ماحول، حالات و واقعات اور سماجی زندگی کے مختلف مسائل سے چشم پوشی نہیں کر سکتا۔" ۲۰

کسی بھی عہد کے سماج کے حوالے سے اگر انسان کو معلومات حاصل کرنا ہوں تو وہ اُس عہد کے ادب کا مطالعہ کرے گا۔ کیونکہ ادب سماجی عمل ہے اور کسی بھی سماج کے اندر ہی ادب کی نشو و نما ممکن ہوتی ہے۔ کوئی بھی ادیب ہو، ادب کی سماجی حیثیت کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو وہ ادیب ان افکار و خیالات اور تصورات سے بے خبر اور بے بہرہ نہیں ہو سکتا جو اُسے سماج مہیا کرتا ہے۔ لہذا ادب کی حیثیت سماجی ہونے کے ساتھ ساتھ طبقاتی بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ ادب مختلف قسم کے سماج سے نہ صرف تعلق رکھتا ہے بلکہ ہر طرح کے سماج میں موجود ہر طرح کے طبقے کی نمائندگی بھی کرتا ہے۔

ادب چونکہ سماج کا عکاس اور ترجمان ہوتا ہے اس لیے ادب کے مقاصد بھی عظیم ہونے کے ساتھ ساتھ مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ادب کی ذمہ داریاں محدود نہیں ہوتیں اور نہ اُن کی کوئی حد متعین کی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ادب میں لچک موجود ہوتی ہے۔ اور اس میں یکسانیت کا تصور اور عنصر ناپید نظر آتا ہے۔ وقت اور حالات میں بھی یکسانیت قائم برقرار نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ زمانہ اور حالات تیزی کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ آئے دن نئی تبدیلیاں اور انقلابات انسان کو خوش آمدید کہنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ یہ تبدیلیاں اور انقلابات انفرادی بھی ہو سکتی ہیں اور اجتماعی نوعیت کی بھی۔ فرد اور معاشرہ لازم و ملزم ہیں انہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا لہذا معاشرتی تبدیلیاں اور انقلابات بالواسطہ اور براہِ راست طور پر انسان کی زندگی کو بھی متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ سماج اور انسان دونوں ہی ان تبدیلیوں کی زد میں آجاتے ہیں۔ ادب تخلیق کرنے والا فرد اور افراد کا تعلق بھی سماج سے ہوتا ہے۔ لہذا ادیب بھی ان تبدیلیوں سے اثر قبول کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ بدلتا زمانہ اور حالات کے تغیر و تبدل ادیب کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ اس لیے ہر دور کا ادب بھی مختلف ہوتا ہے اور اپنے مخصوص عہد کا ترجمان بھی۔ بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ بہتر ہو گا کہ سماجی تبدیلیاں اور انقلابات ادب میں بھی آئے روز تبدیلیاں اور انقلابات

لانے کا باعث بنتے ہیں۔ اوران تبدیلیوں کی نوعیت بھی مختلف ہو سکتی ہیں، صنعتی اور اقتصادی نوعیت کی بھی۔ اسکے علاوہ تہذیبی و تعلیمی اور سیاسی نوعیت کی بھی معاشرتی تبدیلی چاہے کسی بھی نوعیت کی کیوں نہ ادب کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور ادب بھی ہر آنے والی تبدیلی کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ اس لیے تو کہا جاتا ہے کہ ادب اور معاشرتِ زندگی کا تعلق بہت پرانا ہے۔ اب جب سے تخلیق ہونا شروع ہوا اس دور سے لے کر موجودہ دور تک اپنے زمانے اور حالات کی ترجمانی وعکاسی کرتا ہے۔ ادب اور معاشرتی زندگی کا تعلق ہمیشہ سے تھا اور ہمیشہ رہے گا۔

ادیب جس سماج میں آنکھ کھولتا ہے اُس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ادیب اور تمام لکھاری نہ صرف معاشرے کے حساس ترین افراد ہوتے ہیں بلکہ ذمہ دار اور فرض شناس شہری بھی ہوتے ہیں۔ جو نہ صرف معاشرتی مسائل سے متاثر ہو کر الجھتے ہیں بلکہ معاشرتی اصلاح کی خاطر اور اپنے تزکیہ نفس کی خاطر کچھ نہ کچھ تحریر کرتے رہتے ہیں۔ اُن کی یہی تحریریں ان کے اندر کا ابال ہوتی ہیں اور ان کے جذبات واحسات کی ترجمانی کرتی ہیں کہ آیا کون سی تبدیلی نے کس انداز سے اور کس حد تک مصنف یا ادیب کو متاثر کیا اور وہ اُن متاثر کرنے والے عوامل کو کس حد تک لکھنے اور سمجھنے میں کامیاب ہوا؟ جس طرح ہر کام کے پیچھے کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ اور ہر مقصد کے پیچھے کوئی نہ کوئی محرک ہوتا ہے بالکل اسی طرح سماجی مسائل اور معاشرتی تبدیلیاں مصنفین اور ادباء کے لیے تحریک کا کام دیتی ہیں۔ اور اُن کی سوچوں میں کشادگی اور وسعت پیدا کر کے کوئی نہ کوئی شاہکار تخلیق کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ لہذا ادب ہی معاشرتی مسائل کا مداوا بن کر نہ صرف مسائل کے حل میں معاون و مددگار ثابت ہوتا ہے بلکہ ہم ادب ہمیں نئی زندگی کی جستجو کیلئے عمل کی طرف آمادہ اور تیار کرتا ہے۔ اس لیے تو ادب اب ہماری زندگی کا مصور اور ترجمانی ہی نہیں کرتا بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ ہماری سماجی زندگی کا نقاد بھی بن گیا ہے۔ ادب ہمارے لیے زندگی کی تلاش کا دوسرا نام ہے۔ اور معاشرتی حقائق سے آشنائی بھی۔ اس حوالے سے ڈاکٹر محمد حسن رقمطراز ہیں۔

> "ادب ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح جامد اور متعفن نہیں بلکہ ہر دم تروتازہ اور دریا کی مانند رواں دواں رہتا ہے۔ جس طرح زندگی ہر کروٹ اپنا لبادہ تبدیل کرتی رہتی ہے اور ہر وقت متغیر حالات اور متنوع کیفیات سے دوچار رہتی ہے۔ سچا ادب وہی ہے جو زندگی کی حقیقتوں کو بے نقاب کرے۔ وہی ادیب زندہ جاوید رہ سکتا ہے۔ جسکا ہاتھ معاشرے کی نبض پر ہو اور جو زندگی کے لمس کو محسوس کرتا ہو۔ اسے پوری سچائی کے ساتھ قوم کے روبرو پیش کر دے۔ اسی حقیقت پسندی کے باعث ادب میں افادیت کا پہلو نمایاں ہوتا ہے اور مقصدیت ابھر کر سامنے آتی ہے" [۱۲]

ادب جامد نہیں ہوتا۔ بلکہ بہتے ہوئے پانی کی مانند ادب بھی وقت اور حالات کے دھارے پر بہتا رہتا ہے اور اس میں بھی وقت اور حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ نئے موڑ آتے رہتے ہیں۔ ادب مختلف النوع کیفیات سے متاثر

ہوتا رہتا ہے اور زندگی کی تلخ حقائق اور سچائیوں سے معاشرے کے افراد کو روشناس کروانے کے ساتھ ساتھ انہیں سوچنے اور عمل کرنے پر آمادہ اور تیار بھی کرتا رہتا ہے۔ایک سچے ادب کو تخلیق کرنے میں سچے ادیب کا ہاتھ ہوتا ہے اور اچھے اور سچے ادب کو تخلیق کرنے کیلئے ادباءاور مصنیفن کے اندر وہ صلاحیتیں موجود ہونی چاہیں جو زمانی اور سماجی حقائق سے پردہ اُٹھا کر معاشرے کے سامنے لا کھڑا کریں۔اس لیے ادباء کرام کا اپنے منصب سے آگاہ ہونا بھی اتنا ہی ضروری اور اہم ہے۔جب ایک سچا اور کھرا ادیب اپنے منصب سے آگاہ ہو جاتا ہے تو وہ ایسا ادب تخلیق کرتا ہے جس میں زندگی کے معیاروں کو بلند کرنے کی صلاحیت بھرپور انداز میں موجود ہوتی ہے۔شاعر ہو یا ادیب معاشرے کے دیگر افراد سے زیادہ تیز شعور اور احساسات کا مالک ہوتا ہے اُسکی قوتِ مشاہدہ اور فطرت سے لگاؤ بھی معاشرے کے باقی افراد سے زیادہ ہوتا ہے۔گہرے شعور اور احساس کی بدولت ہی انسانیت کے بارے میں دردمندی کا جو جذبہ ادیب کے دل میں پیدا ہوتا ہے وہ زندگی میں قدم قدم پر غور کرنے اور انسانی محرومی اور ناکامی پر کڑھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔اور یہی جذبہ ادیب کو زندگی کی اقدار بلند کرنے اور انسانیت کے غم دور کرنے کے بارے میں غور و فکر پر مجبور کرتا ہے۔اور یہی اجتماعی جذبہ اس کے ادب میں جاری و ساری نظر آتا ہے۔اور اسی کی بدولت معاشرے میں ادب اور ادیب کا منصب اور مقام متعین کیا جاسکتا ہے۔

ادبی تخلیقات کا تعلق خارجی زندگی سے ہوتا ہے اور وہ خارجی زندگی سے دست و گریباں ہوتی ہیں اور انہی کوائف کی ترجمانی پر ہی اکتفا نہیں کرتیں جو خارج میں موجود ہو بلکہ ان کی بہتری اور ترقی کی شعوری اور غیر شعور طور پر کوشش بھی کرتی ہیں۔اس بنا پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ہر فن پارے اور ادبی تخلیق کا کچھ نہ کچھ مقصد ضرور ہوتا ہے۔اور اس مقصد سے بعض اوقات مصنف یا ادیب آگاہ ہوتا ہے اور بعض اوقات اسے اس مقصد سے شعور اور آگاہی نہیں ہوتی لیکن اس کے باوجود جو کچھ تحریر کرتا چلا جاتا ہے اس کی مقصدیت تحریر کے اندر نمایاں نظر آتی ہے بعض اوقات یوں بھی ہوتا کہ مصنف اپنے مقصدِ تحریر سے آگاہ ہوتا ہے لیکن وہ اُسے پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے یا پوشیدہ رکھنے کی کوشش بھی کرتا ہے لیکن وہ مقصدیت تحریری شکل میں قاری کے ذہن تک پہنچ جاتی ہے۔بہرحال ادب میں مقصدیت کی موجودگی ناگزیر ہے۔اور ادیب اس مقصد کو قاری کے ذہن تک پہچانا بھی چاہتا ہے اور صرف پہنچانے کا ہی خواہاں نہیں ہوتا بلکہ وہ قاری سے ہمدردی بھی حاصل کرنا چاہتا ہے اور یہ ہمدردی اس وقت جیتی جاسکتی ہے جب مقصد اس صورت میں پیش کیا جائے کہ ہمارا ذہن اس مقصد کو نہ صرف سمجھ سکے بلکہ مکمل طور پر اسے قبول بھی کرنے کے لیے تیار ہو۔اور وہ مقصد اس صورت اور اسی جذبے کے ساتھ ہمارے سامنے آئے کہ وہی احساسات و جذبات ہمارے دل میں موجزن ہو جائیں جو ادیب کے دل و دماغ کو نہ صرف متاثر کرے بلکہ اُسے متحرک کرنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہو اور

قاری کے شعور میں وسعت اور گہرائی پیدا کرے۔اور وہ معاشرے کا متحرک فرد بن کر معاشرتی مسائل پر نہ صرف نظرِثانی کرے بلکہ اُن کے حل کیلئے عملی اقدامات بھی کرے۔ گویا معاشرتی انقلاب لانے کا سبب بنے۔ چونکہ ادبی موضوعات کا تعلق براہِ راست سماج سے ہوتا ہے۔اور ادب کے معانی و مفاہیم سے آگاہی حاصل کرنا اور اُسے سمجھنا مشکل نہیں ہوتا۔ہر ادیب کا بھی اپنا ایک مخصوص انداز ہوتا ہے جس کے ذریعے وہ معاشرتی مسائل کی ترجمانی اپنے انداز سے کرتا ہے۔ یہ انداز تجریدی بھی ہو سکتا ہے اور اطلاقی بھی اور بعض اوقات تحقیقی اور تنقیدی ہونے کے ساتھ ساتھ علامتی بھی ہو سکتا ہے۔الغرض اُسکا اندازِ بیان اور طرزِ تحریر کسی بھی نوعیت کا ہی کیوں نہ ہو۔اس کی تحریروں میں سماج کی جھلک واضح طور پر سمجھی اور محسوس کی جاسکتی ہے۔اور بہت جلد قاری اس کی مقصدیت تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ادب کے مفاہیم و مطالب کو چاہے جس قدر غیر متعین اور غیر حقیقی قرار دیا جائے لیکن اس کے لفظ و معانی کی بحث سماج اور معاشرے کے بغیر با معنی نہیں ہو سکتی۔ادیب کی اپنی شناخت سماج ہے۔اور سماج کا عکس ادیب کی تحریروں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ادیب اور سماج بھی لازم و ملزم ہیں اور سماجی مسائل سے آشنائی اور ان مسائل کے حل کیلئے تجاویز دینے کی ذمہ داری بھی ادیب پر عائد ہوتی ہے۔ادیب معاشرے میں فعال کردار ادا کر کے معاشرتی ترقی اور خوشحالی کا باعث بنتا ہے۔

ادب کو فرد ہی تخلیق کرتا ہے۔اور فرد سماج کا ایک متحرک اور فعال رکن ہوتا ہے۔ لہٰذا ادب ہی معاشرتی بگاڑ کو سُدھار کر اسے کامیابی اور ترقی کی سمت لے کر جاتا ہے۔ادب تخلیق کرنے والا یعنی ادیب اپنی وسعتِ نظر اور گہرے مشاہدے کے نتیجے میں اپنے خیالات کو قلمبند کرتا ہے۔ لہٰذا یہ اس کی مجبوری بن جاتی ہے کہ وہ سماج دوست بنے۔ لہٰذا معاشرتی و انسانی بھلائی کے سوا اس کی تخلیق کا اور کوئی دوسرا مقصد نہیں ہوتا۔ایک ادیب ہی اپنی نوک قلم کے زور پر انسان کے اندر سوئے ہوئے انسان کو جگاتا ہے اور اُسے معاشرے کا کامیاب ترین فرد بننے میں اس کی راہنمائی کرتا ہے۔ گویا انسان کو صحیح معنوں میں انسان بنانے کی ذمہ داری بھی ادیب کی ہوتی ہے۔اس حوالے سے عائشہ بیگم اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتی ہیں:

> "ادیب ہی کا فرض ہے کہ آدمی کو اس کی جبلی خواہشات سے بلند کر کے انسانیت کے ایسے اعلیٰ وارفع مقام پر فائز کرے جہاں اعلیٰ معاشرتی اقدار کے نظام پر عمل پیرا ہو سکے۔ادیب کی روح اپنے ملک و قوم کی بہتری کیلئے بے قرار رہتی ہے۔اور وہ اپنا قلم اسی مقصد کے حصول کے لیے وقف کر دیتا ہے۔" ۲۲

وقت گزرنے کے ساتھ اور حالات کے ردو بدل کے پیش نظر ایک ادیب اپنے قلم کو معاشرتی اصلاح اور ترقی کے لیے وقف کر دیتا ہے۔اور اُس کی ہر تحریر کسی نہ کسی مقصد کو مد نظر رکھ کر وجود میں لائی جاتی ہے۔یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ایک سچا اور با عمل قلم کار معاشرے کا مصلح ہوتا ہے۔ جس کی اپنی زندگی کا ایک مقصد ہوتا ہے اور وہ اسی

مقصد کے حصول کیلئے اپنی زندگی گزار دیتا ہے۔ تاریخ بھی اس بات کی شاہد ہے کہ بڑے سے بڑے قلمکار معاشرے میں انقلاب لانے کا باعث بنے انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے خوابیدہ قوموں کو بیدار کیا اور انہیں متحرک اور فعال رکن بنا کر معاشرتی ترقی کا باعث بنے۔

ادب انفرادی بھی ہوتا ہے اور سماجی بھی۔ انفرادی اس طرح کہ ادب انفرادی ذہن کی تخلیق ہوتا ہے اور سماجی اس لحاظ سے کہ ذہن جو ادب کی تخلیق کرتا ہے۔ سماج کا پیدا کردہ ہے۔ ادیب کو اپنی تخلیق کے لیے مواد زندگی اور زندگی کی بوقلمونی سے ملتا ہے۔ اور اس زندگی کے معاملات کو وہ اپنا مقصد تحریر بناتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ادب زندگی کی نئے سرے سے تخلیق ہے۔ ادب ایک ایسا سماجی عمل ہے جو ایک مقصد بھی ہے اور ایک اعلیٰ تر مقصد کے حصول کا ذریعہ بھی جس میں مواد اور ہیت دونوں کی حیثیت جسم اور روح کی ہے جس کا افادی پہلو بھی ہے جمالیاتی بھی۔ جو سماجی ہونے کے ساتھ ساتھ ادیب کے جذبات واحساسات کا ترجمان بھی ہوتا ہے۔ عظیم ادب تب ہی معرضِ وجود میں آتا ہے جب اُس میں زندگی کے حقائق کے ساتھ ساتھ ادیب کی وارداتِ قلبی کی سچی ترجمانی بھی موجود ہو۔ ایک ادیب زندگی کے حقائق کو صرف اُسی صورت میں پیش کر سکتا ہے جب تک وہ خود ان کو محسوس نہ کرے۔

دنیا کے کسی بھی ادب کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ادیب اپنے گرد و پیش کی زندگی سے کبھی بھی دامن نہیں بچا سکا اور اس کے زمانے کی زندگی کے نقوش اس کی تخلیقات میں نمایاں ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ اس عہد کی سیاسی، سماجی، معاشرتی اور اقتصادی مسائل اسکی تحریروں میں نمایاں ہوتے دیکھائی دیے۔ مثال کے طور پر میر درد کی غزلوں کو اگر دیکھا جائے تو ان کی غزلوں میں دنیا کی بے ثباتی کا شکوہ اور زندگی کے طوفان میں جینے کے ہاتھوں مرنے کی شکایت، اس دور کی سماجی بدحالی اور اخلاقی پستی کا نتیجہ نہیں۔؟ کیا مرزا رفیع سودا کی ہجویات اور شہر آشوب انہی حالات کی پیدوار نہیں۔ اور تو اور افسانوی ادب کے آئینے میں اس زمانے کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی کے جیتے جاگتے نقوش منعکس نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ادب برائے ادب کے داعیوں کا یہ کہنا کہ ادب تخلیقِ حسن کا نام ہے اور اس کا سماجی زندگی سے کوئی تعلق نہیں یہ بات درست نہیں کیونکہ ادیب کا کام تخلیق حُسن کے ساتھ ساتھ زندگی کے حقائق کی عکاسی کرنا بھی ہے۔ ادب ہی زندگی، معاشرے اور تہذیب کا ترجمان وعکاس اور نقاد ہوتا ہے۔ اس میں سماجی اور افادی پہلو بھی ہوتے ہیں اور فنی اور جمالیاتی بھی۔ اور اسکی یہی خصوصیت ہی اُسے زندگی سے ہم آہنگ کرتی ہے۔

ادب اور سماج کے باہمی تعلق میں سب سے نمایاں اور مثبت عنصر جو دیکھنے کو ملتا ہے وہ یہی ہے کہ سماج سازی کے ساتھ ساتھ معاشرتی و سماجی ترقی اور تنزلی میں بھی اس کا کردار نمایاں ہوتا ہے۔ ترقی پسند حوصلہ ور اور بلند نظر

ادب قوم کو جاندار، ترقی پسند، حوصلہ منداور بلند نظر بناتا ہے یا بنانے میں مدد دیتا ہے۔ادب اگر زوالی ہو یا تنگ نظر ہو اور جہالت کی طرف لے جانے والا ہو تو وہ اس سے وابستہ لوگوں کو اور زیادہ تباہ کر دیتا ہے۔بلکہ لے ڈوبتا ہے، معاشرے کی ترقی اور تنزلی میں ادب کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ سماج سازی اور اجتماعی ذہنیت کی پیدائش، نشوونما میں اور تسلسل میں اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

ادب ہماری معاشرت، ہمارے رہن سہن اور طرزِ بود و باش میں جزوِ لازم کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ادب کا تعلق زندگی کے ساتھ اٹوٹ ہے اور یہی حقیقت بھی ہے کہ ادب در حقیقت زندگی سے عبادت ہے۔ ارتقاء حیات کا جزو لازم اور معاشرتی اصلاح کا فریضہ صرف ادب ہی انجام دے سکتا ہے۔

کسی بھی ادبی تخلیق میں عصری رجحانات اور وقتی معاشرتی مسائل کا سرے سے وجود ہی نہ ہو تو ایسی تخلیق بے کار اور بے معنی سمجھی جاتی ہے ایسی تحریریں وقت کے ضیاع کے سوا کوئی حیثیت اور درجہ نہیں رکھتیں۔ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو ادیب کی ذمہ داری بہت بڑی ہوتی ہے۔ وہ انسانی فطرت کے ساتھ ساتھ معاشرے کا بہترین نبض شناس ہوتا ہے۔ وہ زندگی کی گہرائیوں اور اونچ نیچ کا مشاہدہ بہت گہرائی سے کرتا ہے۔اچھے ادب کی پہچان بھی یہی ہے کہ وہ معاشرتی زندگی کے کسی بھی پہلو کو نظر انداز نہیں کر سکتا وہ زندگی کے جملہ پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ چاہے ان کا تعلق خارج سے ہو یا داخل سے۔

داخلی اور خارجی دونوں پہلوؤں کو اپنے اندر سمونے کی صلاحیت رکھنے والا ادب ہی دراصل حقیقی ادب ہے۔ دونوں پہلوؤں میں سے کسی ایک کو خارج کر دیں تو اس ادب کی اہمیت نہیں رہتی اور نہ ہی ایسا ادب کامیاب ادب کہلا سکتا ہے مکمل اور معیاری ادب وہ ہوگا جو خارجی پہلوؤ کے ساتھ ساتھ داخلی پہلوؤں کو بھی جگہ دے۔ یہی داخلی پہلو انفرادی پہلو اور انفرادی شعور کی ترجمانی کرتا ہے۔

اختر اورینوی کا کہنا ہے کہ :

> ''سچا ادب وہ ہو سکتا ہے جو زندگی کے ہر ہر بہاؤ پر روشنی ڈالے۔ خارجی اور داخلی آئینہ سامانی ادب کا نصب العین ہونا چاہیے۔ایسا نظریہ ادب جو صرف خارجی پہلو پر زور دیتا ہے غیر صادق ہے۔' ۲۳

یہ بات بالکل درست تسلیم کی جاسکتی ہے کہ سماجی مسائل کا تعلق داخلیت کی بجائے خارج سے ہوتا ہے۔اور کوئی بھی ادب ہو کسی بھی نوعیت کا ادب ہو ان خارجی مسائل سے متاثر ہوتا ہے۔ مگر یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ اس خارج کو کوئی بھی ادیب اُس وقت تک تحریری صورت میں نہیں لا سکتا جب تک وہ داخلی طور پر ان سے متاثر نہ ہو ۔ چنانچہ معیاری ادب صرف خارجی پہلوؤں کو ہی زیرِ بحث نہیں لاتا بلکہ داخلی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ادب کو جانچنے کا معیار ان دو بنیادوں پر ہی ہونا چاہیے داخل اور خارج ۔ خارج داخل کو متاثر کرتا ہے اور ادیب کے اندایک ابال

اٹھتا ہے اور خارجی حالات ہی اُسے اندرونی طور پر مضطرب اور بے چین کرتے ہیں اور وہ اس بے چینی کو ختم کرنے کے لیے اپنا تزکیہ نفس تحریری صورت میں کرتا ہے۔ لہذا کسی بھی ایسے ادب کا تصور کرنا ممکن نہیں ہوتا جو محض خارجیت پر ذمہ دے یا تمام رداخلیت پر۔ اس لئے کہ ہم کائنات اور انسان دونوں کو جدا کرنے سے قاصر ہیں۔ اگر ادیب اور شعراء شعوری طور پر اس بات کی کوشش کریں کہ ادب کو صرف اپنے ذاتی احساسات اور ذاتی ردِ عمل کے اظہار کے لیے ہی برتیں تو ظاہر ہے کہ اس سے اس کی تخلیق میں ایک سکڑن اور چھوٹا پن پیدا ہو جائے۔ جس حد تک ادب میں داخلی اور خارجی عناصر کے درمیان توازن اور ہم آہنگی ہو گی اسی حد تک اسکا دائرہ عمل وسیع ہو گا۔ گویا کامیاب ادب وہی ہے جو داخلی اور خارجی دونوں پہلوؤں کو یکساں طور پر اپنے اندر جگہ دے۔

ادب ہمیشہ زندہ و جاوداں رہتا ہے۔ اور وقت کے ساتھ کبھی مرتا نہیں۔ بلکہ گزرتے وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ اپنے اندر تبدیلیاں لاتا رہتا ہے۔ ان تبدیلیوں میں بھی ایک تسلسل اور ربط قائم رہتا ہے۔ ادب اپنے اندر ماضی کو سمو لیتا ہے اور نئے حالات اور زمانے کو قبول کرتے ہوئے ان تبدیلیوں کو بھی اپنے اندر جگہ دیتا رہتا ہے۔ یعنی ادب ماضی کا امین اور مستقبل کا اشارہ ہوتا ہے۔ ماضی میں گزرے واقعات ادب کے اندر محفوظ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جو تاریخ کا حصہ بنتے چلے جاتے ہیں اور گزرے وقت کے ساتھ پرانا ادب برباد یا ضائع نہیں ہوتا بلکہ کتابی صورت میں اپنی حیثیت برقرار رکھتے ہوئے موجود رہتا ہے۔ اور نئی تبدیلیوں کو خوش آمدید کہہ کر پرانے ادب کے ساتھ نئے ادب کا رشتہ جوڑ دیتا ہے۔ اور اسطرح زمانی ترتیب کے ساتھ اب بھی تسلسل اور ترتیب کے ساتھ نشو نما پاتا جاتا ہے اور پھلتا پھولتا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر دیکھا جائے تو ادب ماحول سے اثر قبول کرتا بھی ہے اور اپنے اثرات کبھی ماحول پر مرتب کرتا چلا جاتا ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ سماج میں یکسانیت کا برقرار رہنا مشکل ترین امر ہے۔ کیونکہ سماج میں تبدیلی اور ارتقاء مختلف طبقات کے باہمی کش مکش کا نتیجہ ہوتی ہے۔ پرانا سماج شکست و ریخت کے عمل سے گزرتا ہے تو نئے سماج کو جگہ دیتا ہے۔ سماجی ارتقاء کا یہ عمل کبھی رکا نہیں بلکہ جاوداں رہتا ہے۔ جو گزرے کل کا سماج تھا وہ حال کا نہیں جو حال کا سماج ہے وہ آنے والے کل میں نہیں ہو گا۔ جب سماج کی صورت بدلتی رہے تو زندگی کی قدریں بھی بدل جاتی ہیں اور زندگی کی اقدار میں تلون، ادب اور فن کی تبدیلی اور تغیر کا باعث بنتا ہے۔ کیونکہ ادب خلاء کی پیداوار نہیں ہے بلکہ زندگی کی پیداوار ہے۔ اور زندگی ساکن اور جمود کا شکار نہیں ہوتی بلکہ متحرک عمل ہے اور آگے بڑھتی رہتی ہے۔

سماجی تبدیلیوں کا عمل رکنے والا نہیں یہ لگاتار سلسلہ ہے جو جاری و ساری رہتا ہے۔ موجودہ دور کے سماج نے ایک نئی شکل اختیار کر لی ہے۔ نفسا نفسی کے اس دور میں جہاں صنعتی انقلابات نے دنیا کو متحیر کیا ہے وہاں اپنے منفی

اثرات بھی معاشرے پر ڈالنے میں پیچھے نہیں رہا۔ آمرانہ اور سرمایہ دارانہ نظام نے سماجی نظام کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے جس کے نتیجے میں سیاسی و سماجی کش مکش، خود غرضی، لوٹ مار، آمرانہ طور طریقے، ناانصافی کے بول بالا نے عوام کو کاری ضرب لگائی ہے اور سماجی مسائل میں اضافہ ہوا ہے۔

اس حوالے سے ڈاکٹر اے۔ بی۔ اشرف لکھتے ہیں۔ ''جدید دور میں سماجی عمل نے ایک اور صورت اختیار کر لی ہے۔ مشینی نظام کی قوت، لامحدود صنعتی ترقی، مختلف سیاسی نظاموں کی آمرانہ روش اور منڈیوں کی تقسیم، ایک محدود طبقے کے استحصالی، ہتھکنڈوں نے سماجی عمل کی نوعیت بدل کر رکھ دی ہے۔ موجودہ دور کا ادب بھی موجودہ دور کی سماجی تبدیلیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ نئے دور کے تقاضوں کے مطابق نئے دور کے ادب کے موضوعات و عنوانات میں بھی نمایاں تبدیلیاں محسوس کی جا سکتی ہیں۔ مشینی دور کی پیداوار ادب کے موضوعات میں طبقاتی کشمکش، ظلم و جبر، سماجی بے حسی، لڑائی جھگڑے، دہشت گردی، قتل و غارت، چوری چکاری، ڈاکہ زنی، مقابلے کی دوڑ، نفانفسی کی کش مکش خاص کر اہمیت کے حامل ہیں۔ جس زمانے کا ادب ہو گا وہ اُسی زمانے کی عکاسی کرے گا۔ موجودہ زمانے کا ادب بھی موجودہ زمانے کے رنگ کو اپنائے ہوئے ہے۔ اور لاقانونیت اور غریبوں کے استحصال و قتل و غارت اور منفی رویے سماج میں جڑ پکڑتے جا رہے ہیں یہی رویے اور رجحانات موجودہ ادب کے اندر بھی اسی طرح نشو و نما پا رہے ہیں جیسے کہ سماج کے اندر، آج کا ہر فرد خود اس بھری دنیا میں اپنے آپ کو بے یار و مددگار اور تنہا محسوس کرتا ہے اور اجتماعی قدروں کو سیاسی نظاموں کا ڈھونگ تصور کر کے صرف اپنی ذات میں پناہ لینے کی کوشش کر رہا ہے۔ ادب کی صورت حال بھی اس سے مختلف نہیں۔ لایعنیت، بے معنویت، تنہائی، اجنبیت اور یاسیت و قنوطیت کے رویے موجودہ دور کے ادب میں عام ہو گئے ہیں۔ موجودہ دور کا سماجی انتشار ذہنی انتشار اور اضطراب کی شکل میں موجودہ دور کے ادب میں رواج پا رہا ہے۔

ادب کا سماجی عمل بھی یکساں نوعیت کا نہیں کیونکہ اس کا انحصار بھی سماج کی نوعیت پر ہوتا ہے۔ استحصالی معاشرے میں ادب کی صورت اور ہوتی ہے۔ اور اصلاحی اور فلاحی معاشرے میں اس کی نوعیت مختلف ہو گی۔ محکومی میں اسکا رویہ اور ہو گا۔ کیونکہ ادیب بھی انسان ہے اس کی ذہنیت بھی ایک خاص عہد کے سماج کی پیداوار ہوتی ہے اور وقتاً فوقتاً معاشرتی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ مخصوص نوعیت کی اندرونی اور بیرونی تحریکیں اسے متاثر کرتی رہتی ہیں اور اس طرح اسکا تخلیق کردہ ادب اپنے سماجی عمل میں مثبت یا منفی کردار ادا کرتا رہتا ہے۔ گویا مختلف دور میں سماج کی نوعیت نہ صرف مختلف رہی بلکہ ہر دور میں یا مختلف ادوار میں ادب کی نوعیت بھی مختلف رہی ہے۔ اور کسی بھی سماج سے تعلق رکھنے والا ادیب اپنی تحریروں میں ان سماجی عوامل کو دانستہ اور نادانستہ طور پر ضرور شامل کرتا ہے اور اس بات کا

انحصار ادیب کے سماجی شعور پر ہے۔ ایک ادیب کا سماجی شعور جتنا گہرا اور وسیع ہو گا اسکی تحریروں میں بھی اتنی ہی پختگی ہو گی اور اسکا تخلیق کردہ ادب بھی اتنا ہی پر تاثیر ہو گا۔ اور وہ اپنے معاشرے کے انداز واطوار اور ضروریات کو کامیابی کے ساتھ اپنی تحریروں میں جگہ دے سکنے میں کامیاب ہو گا۔ گویا ادیب کو معاشرتی احساسات اور تاثرات کا ترجمان ہونا چاہیے۔ ادب ایک معاشرتی فرشتہ ہوتا ہے اور اس کے اولین فرائض میں معاشرتی خدمات شامل ہے اور وہ اپنے مخصوص انداز اور طریقے سے اپنے معاشرے کی خدمت کرتا ہے۔ معاشرتی احساسات سے آزاد ادیب کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ کامیاب مصنف وہی ہوتا ہے جو اپنے معاشرے کا مشاہد باریک بینی سے کر سکتا ہو۔ وہ معاشرے سے کنارہ کشی اختیار کر کے ادب تخلیق نہیں کر سکتا۔ اس کی فنی باریک بینی عام لوگوں سے مختلف طور پر حالات کا انداز اور ادراک کی قوت رکھتی ہے۔

اچھے ادب کی بنیاد سچائی، حسن آزادی اور انسان دوستی پر قائم ہو سکتی ہے۔ سچا اور اچھا ادب وہی ہو گا جو سماجی حقائق کا ترجمان ہو گا اور اس میں نوع انسانی کیلئے نہ صرف درس موجود ہو بلکہ وہ انسانیت کی فلاح و بہود اور ترقی و خوشحالی کا باعث بھی بنے اور معاشرتی مسائل کے حل میں اپنا کردار ادا کر کے معاشرے اور افراد کا مصلح بھی ہو۔

کیونکہ ادب محض حسن تخلیق کا ہی نام نہیں بلکہ حقیقت کی تعبیر بھی ہے ادب صرف انسانی افکار و خیالات کی رنگ سازی کا نام نہیں واقعیت کی میناکاری بھی ہے یعنی انسانی خیالات کا تعلق حقیقت نگاری کرتا ہے تو وہ حقیقت پسندی پر مبنی ہوتا ہے کیونکہ اُس وقت اس کا ذہن جو کچھ اثر قبول کر رہا ہوتا ہے وہی زیب قرطاس کرتا ہے اور یہ تاثرات اُس کے اپنے معاشرے کی ہی دین ہوتے ہیں۔

ادب انسانی مسرت اور خوشی کا سامان بھی مہیا کرتا ہے۔ اور اُس کی سوچوں کیلئے رخ متعین کرتا ہے۔ سماجی مسائل میں الجھا ہوا انسان ادب سے مستفید بھی ہو سکتا ہے اور محظوظ بھی۔ اس کے علاوہ ادب انسانی افکار و خیالات کی تشہیر کا بھی باعث بنتا ہے۔ ادب محض انفرادی دریافت ہی نہیں سماجی شعور کا عطیہ بھی ہے۔ اصل ادب وہی ہوتا ہے جس کا تعلق بالواسطہ یا براہِ راست انسانی آبادی کے ساتھ جڑا ہو۔ اور انسان دوست بھی ہو۔ اور ایسی تبدیلی اور ترقی کا حامی ہو جو انسان کے درمیان استحصالی رشتوں کو ختم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور بلاشبہ ایک سچا ادب ان تمام مدارج پر پورا اترتا ہے۔

ایسا ادب جس سے ہمارا ذوق صحیح نہ ہو، روحانی اور ذہنی تسکین نہ دے سکے اور ہم میں قوت اور حرکت پیدا نہ ہو اور جس سے ہمارا جذبہ حسن نہ جاگے، جو ہم میں سچا ارادہ اور مشکلات پر فتح پانے کیلئے سچا استقلال نہ پیدا کرے وہ آج ہمارے لیے بے کار ہے اور اس پر ادب کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔ گویا ادب کو با عمل ہونا چاہیے اور جو ہمارے ذوق سلیم

کو تسکین پہنچائے اور ہماری مشکلات کا حل پیش کرنے والا ہو اور اس کے علاوہ ہمیں سماجی مسائل اور مشکلات سے نبرد آزما ہونے کے مواقع بھی فراہم کر سکے۔

ادب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے زمینی تقاضے اور تہذیبی سیاق وسباق سے اپنے وجود کا اعلان کرتا ہے۔ تمام اشیاء وقتاً فوقتاً سیاسی، سماجی، مذہبی اور تہذیبی انقلابات کے زیر اثر اپنا مفہوم تبدیل کرتی رہتی ہیں۔ اور انہی انقلابات اور تبدیلیوں میں ہی ادب اپنا اصل کام اور اپنے فرائض انجام دیتا ہے۔ ادب دور سے دوسرے دور میں داخل ہوتے ہوئے پرانی روایات کو ختم نہیں ہونے دیتا بلکہ پرانی روایات کو نیا رخ دیتا ہے اور نئی شکل میں معاشرے کے سامنے لاتا ہے۔

ادب سماج سازی کا کام دیتا ہے اور معاشرتی مسائل اور اُن تمام عناصر کا خاتمہ کرنے میں اپنا کردار ادا کرتا ہے جس سے معاشرتی شکست وریخت ہوتی نظر آئے۔

سماجی شعور:

سماج کے لفظی معنی معاشرہ یعنی "اکٹھا رہنا کے ہیں جبکہ شعور عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں عقل و سلیقہ، پہچان اور آگاہی۔ چنانچہ سماجی شعور سے مراد سماجی آگاہی / سماجی بیداری اور پہچان کے ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن نے اپنی کتاب ادبی سماجیات میں سماجی شعور کی تعریف ان لفظا میں کی ہے۔ "کسی بھی تخلیق کو اس انداز سے جانچنا جس کے ذریعے کسی بھی تخلیق کار کے تصور یا داخلی بصیرت کا اندازہ لگایا جا سکے سماجی شعور کہلاتا ہے۔" ۲۴ے

یعنی ادبیات میں سماجی شعور کو مصنف یا تخلیق کار تک محدود کر دیا جاتا ہے کہ وہ سماج کو جس نگاہ سے جانچتا اور پرکھتا ہے اور اُس جانچ پرکھ کے نتیجے میں جو تخلیق کرے وہ اس کے سماجی شعور کی عکاسی ہوتی ہے۔ یعنی انفرادی سطح پر کوئی بھی ادبی شخصیت چاہے وہ شاعر ہو یا ناول نگار، مضمون نویس ہو یا افسانہ نگار اپنے معاشرے کے بارے میں جو خیال کرے یا جو بھی رائے رکھتا ہو اپنی قوت مشاہدہ کی بنا پر وہ جو تخلیقی شاہکار تحریر کرے وہ اُس کے سماجی شعور کی ترجمانی کرتا ہے۔ ڈاکٹر افضال بٹ نے سماجی شعور کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

> "سماج ربط و تعلق کا دائروی بند حسن ہے جو بہت سے افراد کو ایک دوسرے سے جوڑے رکھتا ہے اور سماجی شعور سے مراد اس دائروی بند حسن کے مختلف زاویوں سے آگاہ ہونا اور وحدت میں موجود کثرت کو سمجھنا ہے۔" ۲۵ے

سماجی شعور سے مراد سماج کے مابین رشتوں کو پہچاننا اور باہمی تعلقات کو پرکھنا ہے۔

انگریزی میں سماجی شعور کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

> "Social awareness is defined as being aware of the problemsthat different societies and communities face on a day to day bases and to be conscious of the difficulties and hardships of society" ۲۶ے

یعنی کسی بھی کمیونٹی یا معاشرے کو درپیش مسائل سے مکمل آگاہی کا نام سماجی شعور ہے۔

> "Socially aware: refers to a pattern of responses mostly offeredby people who are community minded and socially alive. Being information vacuum cleaners: this segment is always searching for something new and different new thing to learn. ۲۷ے

یعنی مختلف علاقوں، خطوں اور سماج سے تعلق رکھنے والے افراد کے سماجی مسائل سے آگاہی کو سماجی شعور کہا جاتا ہے۔ ہر معاشرے کی اپنی ضروریات اور تقاضے ہوتے ہیں اور ہر سماج کی اقدار و روایات بھی ایک دوسرے سماج سے مختلف ہوتی ہیں لہذا ہر سماج سے تعلق رکھنے والے افراد کو روزمرہ زندگی میں جن مسائل کا سامنا رہتا ہے۔ اُن مسائل سے آگاہی کے علم کو سماجی شعور سے مراد سماجی واقفیت بھی ہے۔ کوئی بھی فرد ہو وہ اپنے سماج سے کتنا آگاہ ہے اور سماجی طور طریقوں اور رسوم و رواج کے علاوہ سماج کے اندر ہونے والی تبدیلیوں کے بارے میں کتنا شعور رکھتا ہے۔ یہ تمام باتیں سماجی شعور کے زمرے میں آتی ہیں۔

ڈاکٹر محمد حسن کے مطابق ''تحریروں کے ذریعے مصنف کی انفرادی سوچ تک پہنچنا، جس کو بنیاد بنا کر وہ تحریریں وجود میں آئی سماجی شعور کہلاتا ہے۔'' ۲۸ کوئی بھی تحریر ہو وہ مصنف کے انفرادی شعور کا نتیجہ ہوتی ہے اور وہی انفرادی شعور ہی در حقیقت سماجی شعور ہے۔ کیونکہ اجتماعی سطح ہر معاشرے کے افراد کی معاشرتی زندگی اور معاشرتی مسائل سے متعلق سوچ اور رائے مختلف ہوگی اسی طرح انفرادی سطح پر فرد واحد معاشرے اور معاشرے کے دیگر امور سے متعلق اپنی رائے اور جداگانہ فکر رکھتا ہے۔ اور اس کا یہ شعور بدلتے وقت کے تقاضوں کے ساتھ تبدیل بھی ہو سکتا ہے۔

جس طرح معاشرہ یا سماج بدلتے وقت اور تقاضوں کے تابع ہوتا ہے اور ہر طرح کی تبدیلی کو خوش دلی سے خوش آمدید کہتا ہے بالکل اسی طرح معاشرے یا سماج سے جڑے افراد کی سوچ اور رائے بھی بدلتے وقت اور تقاضوں کے مطابق تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ اس لیے سماجی شعور کی اصطلاح اپنے اندر بہت وسعت رکھتی ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ "کسی بھی گروہ کے احساسات، جذبات اور ضروریات سے آگاہی جو انہیں سماجی تسکین مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں سماجی طور پر مضبوط بنانے میں مددگار ثابت ہو سماجی شعور کہلاتا ہے۔"

سماجی شعور کے لیے دوسرا مناسب مستعمل لفظ "سماجی بیداری" ہے۔ یعنی سماج میں ہونے والی تبدیلیوں اور حالات سے آگاہی اور ان تبدیلیوں اور حالات کے اثرات کا جائزہ لینا اور سماجی تعلقات کو مضبوط اور منظم بنانے کے عمل کو سماجی شعور کہا جاتا ہے۔ یعنی معاشرہ اور معاشرے کے متعلقات جس میں سماجی زندگی کے تمام اہم امور کا بغور جائزہ لینا اور مطالعہ کرنا اور اسکے ساتھ ساتھ اس کیلئے مخصوص لائحہ عمل تیار کرنا یہی سماجی شعور یا سماجی بیداری کہلاتا ہے۔

گویا سماجی شعور سے مراد کسی بھی معاشرتی گروہ سے متعلق جاننا کہ وہ کیسا ہے اُن کی اقدار و روایات، سوچ، عمل اور رسومات نقطہ ہائے زندگی اور رہنے کے طور طریقوں سے نہ صرف آشنائی اور واقفیت حاصل

کرنا بلکہ مختلف خطوں اور علاقوں میں رہنے والے گروہوں میں شناخت کرنا اور اُن کے انداز و اطوار کو اپنی عقل و دانش کی کسوٹی پر پرکھنا سماجی شعور کہلاتا ہے۔

اردو افسانہ اور سماج

زبان وادب کے قافلے کا نہ صرف رواں ہونا بلکہ آگے بڑھتے رہنا ہی کسی زندہ معاشرے کی پہچان ہے۔ زمانی تبدیلیوں کے اثرات ادب پر بھی پڑتے ہیں۔ ادب میں بھی ان معاشرتی تبدیلیوں کے اثرات واضح طور پر دیکھے اور محسوس کیے جا سکتے ہیں دراصل یہی معاشرتی تبدیلیاں روایت کو وسعت بخشتی ہیں۔ یعنی یہی تبدیلیاں روایات کی پاسداری، ترقی اور زندگی کا سامان مہیا کرتی ہیں اور یہی معاشرتی تبدیلیاں اُن معاشرتی روایات سے انحراف کا بھی سبب بنتی ہیں۔ ادبی تاریخ میں بھی وہی باتیں اور مقامات زیادہ دلچسپی کا باعث بنتے ہیں جہاں کسی غیر معمولی رجحان کے تحت کسی مشہور ادبی شخصیت کی وجہ سے جست لگانے کی کیفیت پیدا ہو جائے اور پھر روایت سے انحراف بغاوت کی صورت اختیار کر جائے۔

اُردو ادب کی کوئی بھی صنف ہو اُسے قطعی یا حتمی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ بدلتے زمانے اور حالات کا تمام اصنافِ ادب پر واضح اثر ہوتا ہے۔ اور ادب چونکہ سماج کا آئینہ دار ہے لہذا کوئی بھی سماج جامد یا ساکن نہیں رہ سکتا۔ بدلتے وقت اور تقاضوں کے اثرات نہ صرف سماج پر اثرانداز ہوتے ہیں بلکہ ادب اور ادباء پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ کوئی بھی صنف ہو بدلتے زمانے کے زیر اثر اس کی تکنیک اور ہیت وساخت میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں یہی حال ہمارے اُردو مختصر افسانے کا بھی ہے۔ اردو افسانے کی ہیت واسلوب کے تجربے کرتا رہا ہے۔

سماجی نقطہ نگاہ کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو فنکار اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ کوئی بھی فنکار ہو اپنے ماحول سے قطع نظر کر کے ادب تخلیق نہیں کر سکتا۔ ادیب اپنے ارد گرد کے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ادب اور زندگی کے مابین رشتہ بہت گہرا ہے یہی وجہ ہے کہ کسی بھی مخصوص عہد کے ادب میں اس دور کی مکمل جھلک نظر آتی ہے۔ افسانہ نگاری کی صنف موضوعات و مواد کے لحاظ سے ہمیشہ سے آگے رہی ہے۔ بدلتے وقت کے تقاضوں اور رجحانات نے فنِ افسانہ نگاری کے موضوعات کو وسعت دی اور اس کی جہتوں میں افسانہ کیا ہے۔ ہر دور کے افسانے کو اگر دیکھا جائے تو وہ اپنے مخصوص زمانے اور عہد کے اثرات کو کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا بھی درست ہے کہ یہی وہ صنف ہے جس کے موضوعات میں تنوع ہے۔ اس حوالے سے پروفیسر قمر رئیس لکھتے ہیں:

> "افسانہ نگاری کی صنف کا ارتقاء ایک خطِ مستقیم کی صورت میں نہیں ہوا بلکہ مختلف متوازی اور کہیں متضاد لہروں کی صورت میں ہوا ہے۔ اردو افسانہ میں ابتدا ہی سے مواد موضوع اور اظہار بیان کو جو تنوع رہا ہے اور تجربے ہوئے وہ نثری ادب کے کسی دوسرے خادم میں نظر نہیں آتے یہ بھی صحیح ہے کہ گزشتہ ستر، اسی سال کی مدت

میں ہندوستان کی سماجی اور تہذیبی زندگی میں جو تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں ان کے پیچھے جو مختلف اور متضاد قسم کے حالات اور عوامل کارفرما ہے ہیں ان کا روشن، موثر اور واضح تر اظہار افسانہ ہی میں نظر آتا ہے۔"۲۹ے

اردو افسانہ کی ابتداء پریم چند سے تسلیم کی جاتی ہے اور انہیں اردو افسانے کا باوا آدم مانا جاتا ہے اردو ادب میں افسانہ نگاری کا رواج مغربی ادب کے اثر سے پیدا ہوا۔ اس حوالے سے یہ اردو افسانہ کی خوش نصیبی تھی کہ اسے ایسا ماحول ملا جس میں وہ زیادہ سے زیادہ ترقی کی منازل طے کر سکا اور ایسے فنکار اردو افسانے کو نصیب ہوئے جنہوں نے اُسے بامِ عروج تک پہنچا دیا۔

اردو افسانے کی ابتداء اور نشوونما کی کہانی بیسویں صدی کے ادبی شعور اور ذہنی ارتقاء سے گہرا ربط رکھتی ہے۔ بذاتِ خود افسانہ ایک نئے شعور کا اظہار اور نئی دریافت کا نام ہے جو اپنی تہہ در تہہ معنوی خصوصیات کی وجہ سے کہانی کی اس ہیت کا عکس معلوم ہوتا ہے۔ جس کا ارتقاء انیسویں صدی کے یورپ اور امریکہ میں ہوا۔ جہاں تک اردو کا تعلق ہے اسکا آغاز پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم کی تحریری کاوشوں سے پہلے بہت مشکل ہی سے کہا جا سکتا ہے۔ اس لیے بلاشبہ یہ کہنا درست ہو گا کہ اردو افسانے کی ابتداء ایک ایسے زمانے میں ہوئی جب ہندوستانی سماج میں سیاسی معاشرتی اور اخلاقی حیثیت سے خاصا انتشار پھیلا ہوا تھا۔

افسانہ نگاری کی ابتداء مغرب میں اگرچہ انیسویں صدی کے آخر میں ہوتی لیکن اُردو میں اس کی ابتدا پریم چند سے کچھ پہلے یلدرم کے افسانوں سے کی جا سکتی ہے۔ پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم سے پہلے اور ان کے وقت مین بھی کچھ ایسے افسانے اور خاکے پڑھنے کو ملتے ہیں جن کا شمار اردو افسانوں میں کیا جا سکتا ہے لیکن یہ صرف افسانے کی ابتدائی اور اور غیر شعوری نقوش ہی قرار دیے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ ان میں فنِ افسانہ اور اس کے تشکیل لوازمات کو صحیح معنوں میں نہیں برتا گیا۔

جب پریم چند نے مغرب کے افسانوی ادب اور خاص طور پر شاہکار افسانوں کا مطالعہ کیا تو ان کے اندر بھی ارتقاء کا دور شروع ہوا۔ اور ان کے افسانوں میں شعوری اور لاشعوری طور پر مغربی ادیبوں کے شہ پاروں کا عکس بھی نظر آنے لگا۔ اسی لیے یہ کہنا مناسب ہے کہ اردو افسانے کی ابتدا پریم چند اور ان کے معاصر افسانہ نگاروں سے ہوتی ہے۔

اردو افسانہ ناول کے بعد کی پیداوار ہے لیکن قلیل مدت میں وہ تیزی کے ساتھ ترقی کی منازل طے کرتا گیا۔ اس سے افسانہ کی فنی مقبولیت کا احساس ہوتا ہے۔ یہ افسانہ کی ہمہ گیری کی دلیل ہے کہ ادبی حلقوں میں تخلیق کاروں نے اسے گلے سے لگایا اور قارئین کے بہت بڑے طبقے نے اُسے دیگر اصناف کے مقابلے میں زیادہ پسند کیا۔ اس کی ایک خاص وجہ تو یہی ہے کہ مشینی دور کا مصروف عوامی طبقہ تفریحی مطالعے کے لیے ناول کی ورق گردانی سے بچنے کیلئے افسانہ کا مطالعہ کرتا ہے۔ نصف صدی کے اندر افسانہ نے جس تیزی سے عوامی زندگی میں داخل ہو کر بنی نوع انسان کے

دکھ درد، رنج والم خوشی ومسرت، الجھن، تفکر اور دیگر معاشرتی وسماجی مسائل کو پیش کیا ہے یہ بھی اس کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ مفلوک الحال طبقات کی دکھتی رگیں ہمارے افسانہ نگاروں نے پکڑیں ان کے مسائل کو بہت قریب سے دیکھا سمجھا اور انہیں فنی محاسن اور افسانوی اسلوب کے دائرے میں سمو کر دنیا کے سامنے پیش کر دیا اور آج جبکہ نثری ادب میں ناول اور افسانہ اپنی جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں لیکن جو عوامی مقبولیت اور ادبی اہمیت افسانہ ہی کے حصے میں آئی وہ شاید ناول یا دیگر نثری اصناف کو نصیب ہو سکی ہو۔ ایک افسانہ نگار کی صرف یہی ذمہ داری نہیں کہ وہ افسانہ تخلیق کرے اور اسے کوئی عنوان یا نام دے۔ فنِ افسانہ نگاری کیلئے یہ چیزیں کافی نہیں بلکہ افسانہ نگاری میں مصنف جب تک مقصدیت کو شامل نہیں کرتا اس وقت تک اس افسانے کی اہمیت نہیں ہوتی۔ مقصدیت صرف اسی صورت میں نظر آسکتی ہے جب افسانہ نگار زندگی اور اس کے مسائل کا قریبی مشاہدہ نہ کر سکے۔ وہ داخلی اور خارجی حالات وحادثات کے مابین توازن اور تعلق کو خوشگوار رابطہ کی شکل دے سکے اور زندگی اور مسائل زندگی میں اس کا پختہ ادراک اور اس کی نظر میں ادبی ورثے اور موجودہ ادبی رجحانات کے درمیان فاصلہ نہ ہو۔ نیز انسانی مسائل سے متعلق اسکا نقطۂ نظر منصفانہ اور ہمدردانہ ہو۔ اس نظریے پر عمل کرنے سے ایک طرف بہترین افسانوں کی تخلیق ہوگی وہیں دوسری طرف ادب کا بھی مقصد پورا ہوگا کہ وہ انسانی زندگی سے آنکھ ملا کر اپنے راستے استوار کرے۔

اُردو افسانوں میں ابتداء ہی سے سماجی عناصر کی کارفرمائی رہی ہے۔ اس کی ابتدا ہی ایسے ماحول میں ہوئی تھی جہاں انسانی زندگی مسائل اور مشکلات سے گھری ہوئی تھی۔ غرض غلامی کی وجہ سے ہر شعبۂ زندگی میں بے چینی اور انتشار کا ماحول تھا۔ انگریزوں کی ظالمانہ حکمرانی کے اصول نے ہندوستان کی معاشی، سماجی، تہذیبی، تمدنی اور مدنی غرض ہر قسم کی آزادی غور وفکر کی راہوں پر پہرے بٹھا دیے تھے۔ اسی ضمن میں ہندوستان میں قدیم زمانے سے چھوت چھات اور ذات پات کی تفریق نے اور بھی ستم ڈھایا۔ فنکار جو معاشرہ کے انصاف پسندوں کا بہترین نمائندہ تصور کیا جاتا ہے بھلا ایسے حالات سے کیسے بے خبر رہ سکتا تھا۔ غرض افسانہ نگاروں کی بڑی تعداد نے اُردو میں سماجی افسانوں کی تخلیق کی۔ انہوں نے سماجی ناہمواری، عدم مساوات و ذات پات کا امتیاز، چھوت چھات، اور رشوت ستانی، معاشرتی انتشار، غربت و افلاس، بیکاری، جہالت، گداگری، عصمت فروشی، جہیز، اور بے میل کی شادی، تعلیم نسواں، زمینداری اور جاگیر دارانہ نظام فرقہ واریت، اور غلامی جیسے مستقل اور خطرناک قسم کے سماجی مسائل کو وقفے وقفے سے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔

چونکہ فنکار یا ادیب اپنے گرد و پیش کے حالات سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتا اور اس کی فنی باریک بینی عام لوگوں سے مختلف طور پر حالات کا اندازہ اور ادراک کی قوت رکھتی ہے۔ اس لیے انہوں نے ان مسائل پر زیادہ باریکی

سے اور تفصیلی قلم اٹھایا۔افسانوی دنیا حساس انسانوں کی دنیا ہے۔اردو افسانے نے انسانی فلاح اور سماجی انصاف اور بہبود کی غرض سے ان سارے مسائل کو موضوع بنایا۔اس ضمن میں ابتدائی افسانہ نگاروں کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ سماج کے تئیں اپنی ذمہ داری سے یکسر غافل نہ تھے۔

جس طرح ادب میں ادبی محاسن کے ساتھ ساتھ عصری زندگی، مسائل اور مشکلات غرض ہر قسم کے انسانی جذبات کی عکاسی بنیادی حیثیت کی حامل ہو گئی ہے اسی طرح افسانوں میں بھی عصری مسائل کی حیثیت بنیادی ہو گئی ہے۔ کیونکہ افسانہ ادب کی وہ صنف ہے جس میں موجودہ دور میں کثرت سے انسانی معاشرے کے مسائل اور مشکلات کا عکس ادبی محاسن کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ افسانہ نگاری کا فن انسانی زندگی سے نظریں بچانے کا نام نہیں اس میں انسانیت کا درد،اس کے مسائل اور اس کی کامرانیاں سبھی کچھ ملتی ہیں۔اس حوالے سے اطہر پرویز لکھتے ہیں:

"افسانہ انسان اور اس کے سماج کے ارد گرد چکر لگاتا ہے اس لیے وہ سماج کے مسائل سے کترا کر نہیں چل سکتا یہ اور بات ہے کہ افسانہ نگار اپنے مخصوص زاویے سے اس کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔افسانہ واقعیت کا اظہار ہے۔جسے ہم شاعرانہ حقیقت بھی کہہ سکتے ہیں۔یہاں بظاہر ہر چیز فرضی ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نام اور مقام کے علاوہ کوئی چیز فرضی نہیں ہوتی۔اس لیے کہ یہ تمام واقعات زندگی کے اپنے دیے ہوئے ہوتے ہیں۔یہ تجزیہ افسانہ نگار کے یہاں جتنی سچائی اور شدت کے ساتھ پیش آئے گا۔افسانہ کی تکنیک اس کو اپنے اندر جذب کر لے گی۔" ۳۰

افسانہ وہ صنف ادب ہے جو بظاہر تو فرضی کہانی پر مشتمل ہوتی ہے لیکن در حقیقت افسانے کا نام یا عنوان اور اس میں مذکورہ مقامات ہی فرضی ہوتے ہیں اور کہانی ہمارے اپنے معاشرے کی ہی دین ہوتی ہے کیونکہ افسانہ نگار یا ادیب کسی بھی طرح سے اپنے معاشرے سے کٹ نہیں سکتا اسکی تحریروں میں اسکے سماج اور اپنی زندگی کی جھلک واضح طور پر دیکھی اور محسوس کی جاسکتی ہے۔ادب کا اصل مقصد ہی سچائی کا اعتراف کرنا ہوتا ہے اور سچائی کا اعتراف ہی اسے معاشرے کے قریب تر کرتا ہے۔یعنی من گھڑت اور فرضی کہانیوں کا سہارا لے کر بھی افسانہ نگار اور ادیب اصل میں اپنے معاشرتی رویوں اور مسائل کی ترجمانی کر رہے ہوتے ہیں۔ معاشرتی سچائیاں کسی نہ کسی صورت میں فن پاروں کے اندر موجود ہوتی ہیں۔ماضی میں لکھی جانے والی داستانوں ''سب رس،اور باغ و بہار وغیرہ اور ان جیسی دوسری داستانوں کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معاشرتی حقائق اور سچائیاں ان کے اندر بھی دیکھنے کو ملیں گی کیونکہ وہ فنکار جنھوں نے ان داستانوں کو تخلیق کیا روایت پرست ہونے کے باوجود خود کو معاشرے سے جدا نہیں کر سکے اور کہیں نہ کہیں ان کی تحریروں میں عصری حالات اور زندگی کی جھلکیاں ضرور مل جاتی ہیں۔

اُردو ادب میں حقیقت پسندی اور حقائق پر مبنی تحریروں کا سہرا ترقی پسند تحریک کے سر جاتا ہے۔ ترقی پسند تحریک ہی نے سماجی مسائل اور حقائق کو تحریروں میں جگہ دینے کیلئے پلیٹ فارم کا کام کیا۔ سجاد حیدر یلدرم، پریم چند اور اُن جیسے دوسرے افسانہ نگاروں نے اپنی تحریروں میں سماجی حقائق کو روشناس کروایا اور ان کے افسانوں کی وجہ شہرت بھی وہی سماجی مسائل اور دنیاوی حقائق بنے جن کو انہوں نے اپنی تحریروں میں جگہ دی۔

انسانی زندگی اور اس سے متعلق حادثات کے بر محل اظہار نے ہی حقیقت پسندی کے لیے راہیں ہموار کیں ایسے دور میں مزدور کسان تحریک سماجی انقلاب کیلئے سماجی شعور کو بیدار اور منظم کرنے کے لیے عملی طور پر کوشاں تھی۔ کیونکہ برصغیر کے علاوہ یورپ اور پوری دنیا میں غریب اور محنت کش انسانوں کا معاشرتی استحصال عروج پر تھا۔ اور اُن کا سماجی شعور کمزور تھا۔ لہذا غریب سماج کی آواز بلند کرنے کیلئے برصغیر کے علاوہ یورپ میں بھی مختلف تحریکوں نے سر اٹھایا۔ اردو ادب میں ترقی پسند تحریک بھی اسی مقصد کیلئے شروع کی گئی کہ غریب عوام اور مزدور کسانوں کے مسائل کو تحریروں کے ذریعے معاشرتی سطح پر منظر عام پر لایا جائے اور اُن کے مسائل حل کرنے کے لیے تجاویز اور اقدامات شروع کر کے پر امن اور انصاف پسند معاشرے کا قیام عمل میں لایا جاسکے۔ ترقی پسند تحریک کی بدولت حقیقت کے رجحان نے فنکار کو اپنی ذاتی بصیرت اور خارجی مشاہدات کو منضبط کرنے اور اسے معاصر زندگی کا ور اس کے مسائل کے بہتر طور پر پیش کرنے میں مدد دی، اور حقیقت نگاری کیلئے اعتدال اور امتزاج کا پہلو بھی نمایاں طور پر اہمیت کا حامل ہے حقیقت نگاری کے لیے اعتدال اور امتزاج کا پہلو بھی نمایاں طور پر اہمیت کا حامل ہے حقیقت نگاری کیلئے افسانہ نگار یا ادیب اپنی تحریروں میں اپنی شخصیت کا مکمل طور اپر اظہار نہیں کر سکتا اور نہ ہی مکمل طور پر خارجی حالات کی تصویر کشی کر سکتا ہے۔ حقیقت نگاری کا اصول بھی یہی ہے کہ ادیب اپنی تحریروں میں داخلیت اور خارجیت کو یکساں اور مساوی طور پر جگہ دے ورنہ تحریر اپنا مقصد کھو دے گی۔ مثبت اور اعتدال پسند ادب کی تخلیق میں مصنف کی شخصیت کی جھلک اور خارجی دنیا کے تقاضوں کے مابین ربط اور اعتدال کا ہونا لازم ہے، کیونکہ کوئی بھی تحریر مکمل طور پر خارجیت یا خارجی پہلوؤں پر زور نہیں دے سکتی اور نہ ذاتی مشاہدات اور داخلی کیفیات کو اپنے اندر سمو سکتی ہے۔ داخلیت اور خارجیت کے درمیان توازن ہی حقیقت پسندی کو عروج فراہم کرتا ہے۔

ترقی پسند تحریک حقیقت نگاری کو رواج دینے کا باعث بنی اس لیے اردو افسانے پر ترقی پسند تحریک کے مثبت اور دیرپا اثرات مرتب ہوئے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے نام سے ایک انجمن قائم ہوئی اور اسکا پہلا اجلاس ۱۹۳۶ء میں ہوا جسکی صدارت پریم چند نے کی اور اس اجلاس میں بیک وقت بہت ساری ادبی اور سیاسی شخصیات نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں پریم چند نے بدلتے ہوئے ماحول اور حالات کے ساتھ ساتھ تغیر پسند ادبی رجحان کو پیش کیا۔ اور

مصنفین اور ادباء سے استدعا کی کہ وہ اپنی تحریروں میں انقلابی آواز پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ کیونکہ پریم چند کے نزدیک وہی ادب سچا اور کھرا ہو سکتا ہے جس میں افکار و خیالات کے ساتھ ساتھ آزادی کا جذبہ بھی شامل ہو اور اس میں حقائق زندگی کو اس طرح شامل کیا جائے جو عوام میں حرکت اور ہنگامے کے ساتھ ساتھ بے چینی میں اضافہ کا سبب بنے تاکہ عملی طور پر غریب معاشرے کے مسائل کے خلاف نہ صرف آواز بلند کی جاسکے بلکہ اُن کے مسائل کے حل کیلئے تجاویز بھی دی جاسکیں۔ اس تحریک کی مقبولیت کے سبب بڑی تیزی کے ساتھ عصری مسائل اور زندگی کے موضوعات پر معیاری سنجیدہ قسم کی تخلیقات پیش کی جانے لگیں۔ ویسے بھی اردو افسانوں کی تاریخ کو اگر کھنگالا جائے تو اردو افسانے پر ترقی پسند تحریک کے اثرات سب سے زیادہ مرتب دکھائی دیتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک نے اردو ادب کی دیگر اصناف کو بھی متاثر کیا لیکن افسانوی ادب نے اس تحریک کے اثرات سب سے زیادہ جذب کیے۔ اس تحریک کے زیر اثر لکھنے والے افسانہ نگاروں نے معاشرتی زندگی کے مسائل کو نہ صرف اپنے موضوعات میں جگہ دی بلکہ معاشرتی اصلاحی پہلو بھی ملحوظِ خاطر رکھا جو اُن کا اصل مقصد تھا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر اسلم جمشید پوری لکھتے ہیں:

> "ترقی پسند افسانے جس نے سماجی زندگی کی خوبصورت عکاسی کی نہ صرف عہد نو کے تقاضوں کو پیش نظر رکھا بلکہ روایت کا بھی احترام کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند افسانے کے اندر جہاں رومان پسندی، اصلاح پسندی اور حقیقت پسندی کے واضح میلانات دکھائی دیتے ہیں وہیں موضوعات کا تنوع اور زندگی کو سنوارنے کا سلیقہ اُسے نیا رخ عطا کرتا ہے۔ اردو افسانہ ترقی پسند افسانے کے زیر اثر سماجی اقدار کی بحالی، امن و سکون کی تلاش، انسانی عظمت کے گیت، مزدوروں، کسانوں اور پسماندہ طبقات کے مسائل اور ان کے درد و غم کو اپنے اندر سمونے لگا۔ موضوعات کی سطح پر اردو افسانے میں اس قدر تغیرات دیکھنے کو ملتے ہیں کہ اس سے قبل اردو افسانے میں نہ تھے۔" (۳۱)

جب انسانی مسائل کو افسانوں میں جگہ دی گئی تو اردو افسانے کے موضوعات اور عنوانات میں بھی وسعت پیدا ہونے لگی۔ اور یہ سب ترقی پسند تحریک کی کاوشوں کا نتیجہ تھا۔ اس کی ایک بڑی وجہ ترقی پسند افسانہ نگاروں کے ہاں ایک غیر معمولی کشش تھی وہ اپنے پڑھنے والوں کو شدت سے متاثر کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ اردو افسانوں پر ترقی پسند افسانہ نگاروں کی چھاپ آج بھی نظر آتی ہے اور اتنی ہی گہری ہے۔ اردو ادب کے نئے افسانہ نگار چاہے بالواسطہ طور پر سہی لیکن ترقی پسند افسانہ نگاروں سے متاثر ضرور ہیں۔

اردو افسانے کی روایت ہی سماجی رہی ہے۔ اردو افسانے نے سیاسی غلامی، معاشرتی پسماندگی اور ذہنی و جذباتی زلزلوں اور انتشار سے معمور دنیا میں آنکھ کھولی۔ یعنی اردو افسانے کی ابتداء اس دور میں ہوئی جو سماجی ابتری اور انتشار کا زمانہ تھا۔ اس لیے اپنے آغاز ہی میں اردو افسانہ لب و لہجہ، طرز احساس اور تدبیر کاری کے اعتبار سے مختلف حصوں میں

تقسیم ہو گیا۔ اس میں ایک حصہ رومانیت کا تھا جہاں خواب و خیال اپنی رنگینیاں بانٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں فرد اپنی ذہنی وجذباتی آزادی اور فطری مسرت کی حفاظت کے لیے کوشاں دکھائی دیتا ہے جو حقیقی دنیا میں ٹکڑے ٹکڑے ہوتی دکھائی دے رہی تھیں جبکہ دوسری طرف بے بسی و مجبوری، بے چینی، اضطراب انتشار زدہ معاشرے کو پروان چڑھا رہی تھی، نو آبادیاتی نظام سے نفرت، اسکی آلہ کار قوتوں، اداروں اور کارکنوں سے بے زاری غلامی، غربت وافلاس تنگدستی محرومی احساس کمتری جہالت اور عدم طمانیت کا احساس اور دیگر معاشرتی مسائل کو تقدیر انسانی جاننے پر آمادگی سے گریز اور ماضی سے بے تعلقی، غراہٹ سے مشابہ لب ولہجہ کو پروان چڑھا رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں لکھے جانے والے افسانوں کے موضوعات آتش فشاں کی سی حیثیت رکھتے تھے۔

۱۹۳۲ء میں سجاد ظہیر کا مرتب شدہ افسانوی مجموعہ "انگارے" کے نام سے شائع ہوا جس میں مختلف افسانہ نگاروں کی فکری اور تخلیقی کاوشیں تھیں۔ یہ افسانوی مجموعہ ایک طرف تو اردو افسانے کی پر سکون دنیا میں ایک دھماکہ تھا تو دوسری طرف اس کی اشاعت سے ان حلقوں اور طبقوں میں غیض و غضب کی آگ دہک اُٹھی جن کے مفاد اور روایتی وقار کو اس عملی کاوش سے ضرب پہنچی تھی۔ انگارے کی کہانیوں میں جو گستاخانہ بے باکی برہمی، تلخی، اور سرکشی تھی وہ ایک نئی نسل، نئے طرزِ فکر اور نئے تصور فن کی آمد کا اعلان تھی۔ یہ نوجوان سماج کے فرسودہ اداروں، بوسیدہ اور بے جان روایات واقدار اور مصالحت پسندانہ سیاسی تحریکوں سے بیزار اور برہم تھے۔ سیاسی غلامی، افلاس، استحصال، بے رحم سماجی قوانین بندھے ٹکے رسم ورواج اور ان کی لایعنی قیود سے سماج میں جو کرب انگیز گھٹن پیدا ہو رہی تھی یہ نوجوان ادیب اس کی اذیت، شدت اور ہیجان کو محسوس کر رہے تھے اور اس کے اظہار کے لیے مضطرب اور بے چین تھے۔ گزشتہ سو سال کی مدت میں ہندوستان کی سماجی اور تہذیبی زندگی میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں ان کے پیچھے جو مختلف اور متضاد قسم کے حالات اور عوامل کار فرما رہے ہیں ان کا روشن موثر اور واضح اظہار افسانہ ہی میں نظر آتا ہے ،شاید اردو افسانے کے نو بہ نو موضوعات اور فنی وفکری رجحانات کے تنوع کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ وہ اپنے عہد کی زندگی کی تبدیلیوں، تحریکوں اور سماجی حقائق سے زیادہ قریب تر رہا ہے۔ یعنی اردو افسانے نے سماجی تبدیلیوں اور انقلابات کو نہ صرف اپنے اندر جگہ دی ہے بلکہ اس میں انیسویں صدی کے اختتام سے لے کر بیسویں صدی کی تمام سماجی سیاسی اور معاشی تحریکوں کی واضح شکلیں بھی فراہم کی ہیں۔ یعنی انیسویں صدی کے دوران ہونے والے انقلابات ،سیاسی معاشی اور معاشرتی تبدیلیوں کو نہ صرف سمجھنے اور محسوس کرنے میں اردو افسانہ کامیاب رہا بلکہ اپنے اندر جگہ دینے میں بھی کامیاب رہا۔

سماجی افسانے کی اصطلاح اپنے اندر بڑے گہرے معانی و مفاہیم رکھتی ہے اس لیے وہ تمام افسانے جو سماجی زندگی اور اس سے پیدا شدہ پیچیدگیوں، الجھنوں اور مسائل کو پیش کرتے ہیں سماجی کہلاتے ہیں۔

خانگی زندگی سے لے کر اجتماعی زندگی تک کے روزمرہ کے مسائل سماجی مسائل کے دائرے میں آتے ہیں۔ انسانی زندگی میں ہونے والے انقلابات اور تبدیلیاں اور حادثات اور ان انقلابات و حادثات کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل مثلاً غربت، بے کاری، معاشرتی تلاطم، باہمی کشیدگی، انفرادی اور اجتماعی زندگی میں تفاوت، ذات پات اور رنگ و نسل کی تقسیم، سماجی تقسیم، اور خواتین کے مسائل سے لے کر غریب اور مجبور مزدور کے مسائل جنم لیتے ہیں جن کا اثر خاطر خواہ معاشرے پر بھی پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ قدرتی آفات بھی سماجی مسائل کی پیداوار میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ جیسے سیلاب، خشک سالی، قحط، آتش زنی، وبائی امراض سے پورا معاشرہ متاثر ہوتا ہے۔ خاص طور پر معاشرے میں نچلے طبقات ان سے متاثر ہوتے ہیں اور معاشرے میں چوری چکاری، ڈاکہ زنی رہزنی، گداگری، جرائم پیشگی، منشیات، سمگلنگ، بھوک اور خودکشی کے واقعات بڑھ جاتے ہیں۔ جن کا اثر معاشرے پر پڑتا ہے۔ اور معاشرتی ابتری کا دور دورہ شروع ہو جاتا ہے۔

اردو افسانہ نگار کبھی بھی اپنے ماحول اور مسائل سے بے گانہ نہیں رہے۔ افسانہ نگاروں نے وقت کی آواز کو ہر دور میں سنا اور زندگی کے مسائل سے آنکھ ملانے کی کامیاب کوشش کی۔ اور مسائل زندگی سے اجتناب نہیں برتا۔ اس حوالے سے اردو افسانہ نگاروں کی ذمہ داریوں میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ اور ہر دور کے افسانہ نگار نے اپنی ذمہ داریوں کو تندہی سے پورا کیا۔ بیسویں صدی کے افسانوں کے موضوعات کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں:

> "مختلف علاقوں کی تہذیب وہاں کے رہن سہن وہاں کی مجلسی زندگی کی عکاسی کیلئے بھی افسانے کو استعمال کیا گیا۔ غرض افسانے کی دنیا زیادہ سے زیادہ متنوع ہو گئی۔ اس دور کے موضوعات کیا تھے۔ متوسط اور اعلیٰ طبقہ کی زندگی کا کھوکھلا پن، رومان اور اس کی حرماں نصیبی، مثبت اور زندگی کے مسخ کیے ہوئے کردار اور شخصیتیں اور ہنگامی اور سیاسی موضوعات، جنس اس دور کا محبوب موضوع ہے۔ اور اتفاق سے اس کی لذتیت اور اس کی چیرہ دستیاں اس کی خام کاریاں، سبھی کچھ ابھر کر اردو افسانے میں سامنے آئے۔ پھر سیاسی اور ہنگامی موضوعات کا چلن ہوا، قحطِ بنگال سے لے کر ہندوستانی بحریے کی بغاوت، فرقہ وارانہ فسادات، غرض واقعات کی ایک مکمل دستاویز ہمارے افسانے سے مرتب کی جاسکتی ہے۔ اور ان میں اچھے افسانے بھی تھے اور ناکام بھی۔"٣٢

اردو افسانہ نے ہر دور کے سماج کو اپنے اندر سموئے رکھا۔ افسانوں کے تاریخی مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ افسانوں میں نہ صرف ذات پات کی تقسیم اور تہذیب و ثقافت کو موضوع بنایا بلکہ افسانوی تاریخ متنوع موضوعات سے بھری ہوئی ملتی ہے۔ جس سے دیکھتے ہی دیکھتے افسانہ نگاروں کی فہرست میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اور

اُردو ادب میں شاہکار افسانے لکھنے والے بھی پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے افسانوں میں سماجی مسائل کی بھرپور عکاسی کرتے ہوئے اردو ادب کے علاوہ عالمی ادب میں بھی اپنا نام کمایا اور کچھ ایسے افسانہ نگار بھی تھے جن کی تعمیریں معیار کے حوالے سے اور سماجی عکاسی کے حوالے سے خاصا مقام رکھتی تھیں لیکن اپنی زندگی میں وہ مقام اور شہرت حاصل نہ کر سکے۔ الغرض زمین و آسمان کو کوئی بھی موضوع ہو افسانہ نگار کی توجہ کا مستحق ہوتا ہے۔ اس بات کا انحصار افسانے کے موضوعات پر نہیں بلکہ اس بات پر ہے کہ افسانہ نگار کا فنی برتاؤ کیا ہے؟ وہ ان موضوعات کو اچھے تخیلات کی بنا پر کس طرح برتنے میں کامیاب ہوتا ہے یہی فنی برتاؤ ہی دراصل افسانہ نگار کی پہچان ہے۔

ایک اچھا افسانہ اس بات کی تقاضا کرتا ہے کہ وہ زندگی کی حقیقتوں کو جامع اور ٹھوس انداز میں پیش کرے۔ یہی افسانے کی مقصدیت بھی ہے۔ اس کے علاوہ زبان و بیان اور اندازِ تحریر اور لفظی خوبصورتی بھی افسانے کو جاندار بنانے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ صرف تخیلات کے دھارے پر بہہ جانے کا نام ہی افسانہ یا کہانی نہیں بلکہ وہ تخیلات، احساسات اور جذبات کس حد تک معاشرتی تعلق اور وابستگی کو ظاہر کرتے ہیں خصوصیات یہی کسی افسانہ نگار اور اسکی فنی کاوش کی کامیابی اور پختگی کو ظاہر کرتی ہیں۔ گویا کوئی بھی افسانہ نگار ہو وہ معاشرے سے نہیں کٹ سکتا۔ اس کی تحریریں اسکے سماجی پس منظر کو ظاہر کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور کے افسانہ نگار نے سماجی عوامل کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ چنانچہ سماج کی زندگی اور ترقی کیلئے بغاوت اور انقلاب کی نہیں روایت اور ارتقاء کی سنجیدگی اور مہارتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے افسانہ نگار کی تحریروں کا مقصد تعمیری اور مثبت ہونا چاہیے کیونکہ ایسی صورت میں ہی افسانوی تخلیقات مثبت اور مفید ثابت ہو سکتی ہیں اور معاشرتی ترقی اور فلاح و کامرانی کیلئے مددگار بھی ثابت ہو سکتی ہیں۔ ورنہ بصورتِ دیگر سماجی اصلاح کی بجائے سماجی انتشار اور بدنظمی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہیں۔

اردوافسانہ اور عصری شعور

سماجی تقاضوں کو پورا کرنے کے حوالے سے دیکھا جائے تو اردو افسانہ ابتدائی دور سے لے کر اب تک اچھا خاصا کامیاب رہا ہے۔ زندگی سے متعلق حقائق کو جس چابکدستی کے ساتھ اور فنی مہاتوں کے ساتھ اردو افسانے میں پیش کیا گیا ہے شاید ہی کسی اور صنف ادب میں پیش کیا گیا ہو اس لیے سماجی حقائق کے بیان کے حوالے سے اردو افسانہ درجہ اول کی حیثیت رکھتا ہے۔ انسانی زندگی جن راہوں سے ہو کر گزری اور ان راہوں میں آنے والے نشیب و فراز اور تلخ تجربات کو جس حد تک اردو افسانہ سمجھنے اور پرکھنے میں کامیاب رہا وہ ناول یا ڈرامہ بھی نہیں کر سکے۔ اردو افسانے کے موضوعات سے سماجی حقائق اور تبدیلیوں کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ جو اس بات کا واضح ثبوت پیش کرتی ہیں کہ اردو افسانہ مختلف تحریکات کے ساتھ ساتھ اپنے دور کی تبدیلیوں کے زیادہ قریب رہا ہے۔

بیسویں صدی میں سب سے بڑا سیاسی واقعہ جس نے اردو افسانے کو متاثر کیا وہ تھا جلیانوالہ باغ کا سانحہ جو ۱۹۱۹ء میں پیش آیا۔ سیاسی سرگرمیوں کو محدود کرنے کیلئے برصغیر پاک و ہند حکومت نے ۱۹۱۸ء میں رولٹ ایکٹ کا نفاذ کر دیا۔ تمام قسم کی پابندیوں کے باجود ۱۳اپریل ۱۹۱۹ء کو جلیانوالہ جلسے کا آغاز ہو گیا تو جنرل ڈائر نے فوجیوں کو گولی چلانے کا حکم دیا اس انسانیت سوز واقعے میں ۳۷۹افراد ہلاک اور ۱۲۰۰ سے زائد زخمی ہوئے جس نے معاشرتی انتشار اور بدامنی کو جنم دیا۔ برطانوی حکومت نے اس واقعے کے ذریعے اپنی گھناؤنی شکل سے نقاب اٹھایا۔ اور مسلمانانِ برصغیر پر اپنی اصلیت واضح کر دی۔ اس سانحے کا اثر افسانہ نگاروں نے بھی لیا۔ اور تماشا (سعادت حسن منٹو) رینگنے والے (غلام عباس) اور اس جیسے دوسرے افسانہ نگاروں نے بھی سانحہ جلیانوالہ باغ کے موضوع پر متعدد افسانے لکھے۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں لکھے جانے والے افسانے سماجی و سیاسی انتشار اور جبریت سے متعلق تھے۔ ڈاکٹر انوار احمد بیسویں صدی کے افسانوں کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ :

> "بیسویں صدی کے تیسرے اور چوتھے عشرے میں اردو افسانے کی توانا ترین آواز ترقی پسند تحریک کی ہے جس سے وابستہ بیشتر تخلیق کاروں نے یا تو دیانت داری سے محسوس کیا کہ مطالبہ پاکستان انگریزوں کی لڑاؤ اور اقتدار بڑھاؤ کی پالیسی کا کرشمہ ہے یا پھر وہ کانگرس کے ثقافتی رنگ کے زیر اثر تھے۔" ۳۳

یعنی بیسوی صدی کے تیسرے اور چوتھے عشرے میں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر افسانے لکھے جانے لگے جن میں سماجی بھلائی خاص کر مزدور طبقہ اور غریب طبقہ کو موضوعات میں جگہ دے کر ان کی فلاح و بہبود کے پیش نظر افسانے لکھے جانے لگے۔

قیام پاکستان کے بعد اردو افسانے کے موضوعات میں تنوع اور تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ کیونکہ تقسیم ہند سے پہلے سماجی رویے اور عوامل اور طرح کے تھے اور تقسیم ہند کے بعد سماجی عوامل و عناصر میں بھی واضح فرق دکھائی دیا جانے لگا جس نے افسانہ نگاری کے فن کیلئے نئی راہیں متعین کر دیں۔

تقسیم ہند سے پہلے بھی بھوک افلاس غربت اور انسانی حقوق کی پامالی کو موضوع بنا کر افسانوں میں جگہ دی گئی اس وقت بر صغیر پاک و ہند پر برطانوی سامراج کا دور دورہ تھا جنہوں نے عیسائیت کا پرچار کیا اور مسلمانوں کے ساتھ ہر معاملے میں زیادتی کو اپنے ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ سیاسی جبریت اور عدم استحکام کے علاوہ معاشرتی ناانصافی جیسے رویوں نے معاشرے میں جنم لیا جس کا اثر سماج کے افراد کے ساتھ ساتھ ادیبوں نے بھی لیا اور خاص کر افسانہ نگاروں نے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں ایسے ہی لوگوں کو موضوع بنایا جن کو عدم استحکام اور سماجی ناانصافی جیسے مسائل درپیش تھے۔ قیام پاکستان سے قبل عورت کو آزادی حاصل نہ تھی۔ تعلیم و پیشہ ورانہ مسائل ان کیلئے عام تھے اس کے علاوہ سیاسی چپقلش، ہندو مسلم سازشیں اور ان سازشوں کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل جیسے عدم اعتماد، لایعنیت، بے یقینی اور عدم استحکام جیسے سماجی رویے جنم لینے لگے ان تمام باتوں اور حالات نے افسانہ نگاروں کے افسانوں میں جگہ بنالی۔ معاشرے کے اندر مختلف النوع عقائد، تہوار، نسلی تعصبات، زبان کی تبدیلی، مذہبی اقدار، سیاسی و سماجی اداروں کے علاوہ تہذیب و کلچر جیسے سماجی عوامل میں بھی تنوع آگیا۔ تہذیبوں اور فرقوں کے تضادات نے معاشرے کو بے حد متاثر کیا اور اس دور میں لکھے جانے والے افسانے بھی مختلف النوع رویوں کی ترجمانی کرنے لگے۔ تقسیم ہند کے بعد ان معاشرتی رویوں میں کسی حد تک تبدیلی تو آگئی کیونکہ انگریز سامراج ہندوستان کو تقسیم کرنے کے بعد خیر باد کہہ کر چلا گیا اور ہندو مسلم کے درمیان جھگڑوں کے بنیادی ستون بھی گاڑھ گیا جن میں مسئلہ کشمیر کے علاوہ دیگر معاشی و سماجی مسائل خاص طور پر قابل ذکر ہیں تحریک پاکستان کے باعث ہونے والے ہندو مسلم فسادات نے بھی اردو افسانے کو بہت متاثر کیا۔

بر صغیر کی تقسیم پر ہندو مسلم اور سکھ فسادات کے حوالے سے اس خطے میں ایسے سفاکانہ کھیل انسانیت کے ساتھ کھیلے گئے کہ جن کا سوچ کر دل کی رگیں پھٹنے لگتی ہیں۔ بر صغیر کے حساس قلم کاروں نے نسل انسانی کے اس قتل عام پر ان گنت کہانیاں، واقعات، مضامین اور تجزیے رقم کیے۔ ان فسادات کے حوالے سے افسانہ نگاروں نے بے شمار افسانے تخلیق کئے۔ سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی اور قدرت اللہ شہاب کے نام اس حوالے سے زیادہ مشہور ہیں۔ جنہوں نے ہندو مسلم فسادات پر شاہکار افسانے تخلیق کئے۔ کرشن چندر کی پوری کتاب جس کا نام 'ہم وحشی،، ہیں ایسے ہی فسانوں اور کہانیوں سے لہو تر ہے۔ سعادت حسن منٹو افسانہ "کھول دو" اور

"کالی شلوار" کے علاوہ نیا قانون اور ٹوبہ ٹیک سنگھ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔اسی طرح احمد ندیم قاسمی کا افسانہ پر میشر سنگھ اور قدرت اللہ شہاب کا "یا خدا" کے افسانوں کے علاوہ بھی بے شمار کہانیاں فسادات کے حوالے سے مشہور افسانوں میں شمار ہوتی ہیں۔

یعنی تقسیم ہند کے موضوعات پر لکھے جانے والے افسانوں میں اجتماعی بے بسی اور بے یقینی کے ملے جلے تاثرات نمایاں تھے۔اس وقت کے انسانوں کی جذباتی کشمکش کے ساتھ ذہنی تلاطم اور عدم اطمینان جیسی کیفیات کو قلم بند کیا گیا۔مایوسی اور ناامیدی جیسے موضوعات کے علاوہ ایسے افسانے بھی لکھے گئے جن میں حالات سے مقابلہ کرنے ہمت اور حوصلہ بڑھانے کے ساتھ ساتھ امید کا درس بھی دیا گیا تاکہ دل گرفتہ اور بے حال قوم میں ہمت اور استقلال و مضبوطی اور آگے بڑھنے جیسے جذبات کو فروغ دیا جائے تاکہ معاشرتی سطح پر سنبھل کر اور اطمینان اور سکون قلب کے ذریعے معاشرتی ترقی اور اصلاح میں اپنے فرائض انجام دے سکیں۔گویا انسانی جذبات کو فروغ دینے والے پر امید افسانے بھی تحریر کئے گئے۔ہندو مسلم فسادات کے نتیجے میں بہت سارے معاشرتی مسائل نے بھی جنم لیا جنھوں نے انسانی زندگی پر اپنے گہرے اثرات مرتب کئے۔جیسے مہاجرین کی آبادکاری، بے روزگاری اور دیگر معاشی و سماج مسائل نے جنم لیا۔دوسرے الفاظ میں ایسے افسانے بھی شامل ہوتے گئے جن میں مہاجرین (سرحد پار آنے والوں) سے اپنوں ہی کے غیر انسانی رویوں کو افسانوی موضوعات میں جگہ دی گئی۔

مہاجر کیمپوں میں انتظامیہ کی ناانصافی اور بے حسی، لالچ حرص اور ہوس زر کے ساتھ ساتھ خود غرضی جیسے انسانی رویے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پیچیدہ نفسیاتی مسائل کی شکل اختیار کرتے گئے۔

۱۹۴۷ء کے بعد کی سماجی صورت حال یکسر بدل چکی تھی۔ہندوستان ایک کی بجائے دو ملکوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔الگ الگ خطوں کے شہری ہونے کی بنا پر ادباء شعراء اور افسانہ نگاروں کی جغرافیائی اور نظریاتی وفاداریوں میں بھی فرق آگیا تھا۔بھارت کی سرحد سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگاروں اور پاکستان سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگاروں کے نظریات میں فرق آگیا تھا۔دونوں ملک ہر طرح کی غلامی سے آزاد ہو چکے تھے اور برطانوی سامراج کی ستم ظریفیوں کے مناظر پس پردہ چلے گئے تھے۔مگر آزادی کا دیا ابھی پوری طرح سے روشن بھی نہ ہوا تھا کہ فسادات کے نام سے برق و باد نے گھیر لیا۔قتل و غارت لوٹ کھسوٹ کے علاوہ ہزاروں گھر نے مکینوں کے ساتھ جل کر راکھ ہو گئے تھے۔آزادی کے متوالے اور وطن کے شیدائی ان قیامت خیز مناظر اور جان لیوا تجربوں سے گزر کر بھی خوش رہ لیتے لیکن ظلم یہ ہوا کہ آزادی اور جمہوریت سے جس قسم کی توقعات وابستہ کی گئی تھیں۔وہ پوری نہ ہوئیں۔اپنوں کی بے

حسی و بے غیرتی، بد نظمی و بد عنوانی لوٹ کھسوٹ اور ناانصافی اور ظلم وجور جیسے موضوعات افسانوں کا مرکز بننے لگے۔ نئے اور تازہ موضوعات کو افسانوں میں جگہ دی گئی۔ اس سے پہلے جتنے بھی افسانے لکھے جاتے تھے ان میں افسانوی کرداروں کے عمل اور رد عمل کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی لیکن فسادات کے بعد جتنے بھی افسانے لکھے جانے لگے ان میں افسانوی کرداروں کی نفسیات اور ذہنی کیفیات کو زیادہ توجہ دی جانے لگی۔ اس عہد کے افسانہ نگاروں کے افسانوی موضوعات اور کرداروں میں عصری زندگی اور اس کے مسائل کا سچا شعور اور عرفان ملتا ہے۔

تقسیم ہند اور فسادات کے بعد ۱۹۶۰ء اور ۱۹۸۰ء کے درمیان قومی اور بین الاقوامی سطح پر سیاسی و سماجی نظام میں بڑی تیزی سے تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ ان تبدیلیوں نے برصغیر کے ساتھ ساتھ پوری دنیا کو متاثر کیا۔ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں سیاسی شعور بیدار ہوا تو نئی تحریکیوں نے جنم لیا۔ جنگوں کے نظام اور طریقوں میں بھی واضح تبدیلیاں ہوئیں۔ خاص کر جنوبی ایشیاء اور افریقہ میں غلامی اور استحصال کے خلاف نئی تنظیموں نے جنم لیا۔ ویت نام اور فلسطین کے مسائل، بنگلہ دیش سے بہاریوں کا انخلاء اور برما سے مسلمان باشندوں کی ہجرت، افغانستان میں روسی فوج کی مداخلت جیسے عالمی واقعات نے جہاں دنیا کی دیگر ریاستوں اور ممالک کو متاثر کیا وہاں پاکستان اور اس کے ہمسایہ ممالک نے بھی اس گہرا اثر قبول کیا۔ بیرون ملک سیاسی و سماجی تغیرات کے علاوہ اندرون ملک بھی حالات میں بہت ساری تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ جمہوریت کی بار بار ناکامی اور مارشل لاء سے ملک سے سیاسی نظام کے علاوہ غربت، بے روزگاری، سماجی طبقات کی تقسیم طاقتور اور غرباء کے مابین فاصلہ، سماجی بے حسی و بے دلی نے مجموعی طور پر پوری قوم کو متاثر کیا۔ اسی سیاسی و سماجی انتشار کے باعث پاکستان کو دو نہایت اہم اور نازک موڑوں سے گزرنا پڑا۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ اور ۱۹۷۱ء میں سقوطِ ڈھاکہ کی وجہ سے ملکی حالات بری طرح متاثر ہوئے۔ اس دور کے حالات اور اہم واقعات کے پس منظر میں سماجی زندگی کے اور بہت گھناؤنے روپ، سیاسی افراتفری و معاشی بدحالی، لاقانونیت، بد نظمی چور بازاری، رشوت ستانی، آمرانہ نظام کی سختیاں اور عدم مساوات کی صورت میں سامنے آئے اور اردو افسانہ ان تمام حالات اور معاشرتی ناہمواریوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ان تمام حالات و واقعات کی عکاسی اردو افسانے میں کبھی مکالمہ تو کبھی کردار اور کبھی ماحول اور سماج کے حوالے سے واضح طور پر دیکھی اور محسوس کی جاسکتی ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر افضال لکھتے ہیں:

"پاکستان میں رونما ہونے والے ہر واقعہ نے بالعموم ہمارے ادب اور بالخصوص اردو فکشن (افسانہ، ناول) پر اثر ڈالا، وہ فسادات کا سانحہ ہو یا ہجرت کا کرب ۱۹۵۸ء کا مارشل لاء ہو یا ۱۹۷۷ء کا مارشل لاء ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ ہو یا سقوطِ ڈھاکہ کا المیہ، سبھی نے ہماری قومی زندگی کو متاثر کیا۔ ان واقعات سے نہ صرف ہماری تاریخ کا راستہ متعین ہوتا ہے بلکہ ہمارے تخلیقی ادب کا مزاج بھی پروان چڑھتا دکھائی دیتا ہے۔" ۳۴

پاکستانی افسانہ نگاروں نے ہر عہد کے تغیرات کو افسانوی شکل میں ریکارڈ کیا لہذا سقوطِ ڈھاکہ کے سماجی حالات پر اثرات اور مارشل لاء کے نتیجے میں ہونے والے سماجی حالات واقعات کو بھی افسانہ نگاروں نے اپنی تحریروں میں جگہ دی بلکہ پاکستان ادب اور عوام کو ایک نئے سماجی شعور سے بھی متعارف کروانے میں کامیاب ہوئے۔ گویا سیاسی تغیرات ہوں یا سماجی یا تہذیبی اثرات اردو افسانہ نگاروں نے ہر طرح کے تغیر و تبدل کو خوش آمدید کہا اور اپنے اندر سمو کر اسے تاریخ کا حصہ بنانے میں اپنا خاص کردار ادا کیا ہے۔ زمان و مکان کے درمیان کھڑے افسانہ نویس اپنے اطراف وجوانب سے لاتعلق نہیں رہے۔ اور اپنے شعور اور آگاہی کی بنیاد پر معاشرتی حقائق اور صداقتوں کو قلمبند کرنے میں دیانتداری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔

اردو افسانے نے ہماری ادب کو جو کچھ بھی دیا ہے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہماری زندگی میں جو تغیر رونما ہوتے آئے ہیں اور جو نئے خمیر اٹھ رہے ہیں ان کی صحیح معنوں میں نمائندگی کرنے میں اردو افسانہ بڑی حد تک کامیاب نظر آتا ہے۔ جدید دور میں اسے اس مقام سے بھی آگے جانا ہے اسے اور ترقی کی منازل طے کرنا باقی ہیں۔ جدید دور کے افسانے کو آگے بڑھنے کیلئے اعتدال کے راز معلوم کرنا ہوں گے اور افراط و تفریط سے بچ نکلنا ہوگا۔ اگر جدید افسانہ اس سلسلے میں کامیاب رہا تو اپنا تاریخی مرتبہ برقرار رکھ سکنے میں کامیاب ہوگا۔ اور ہر دور میں اس کی اہمیت تسلیم کی جاتی رہے گی۔ قصہ مختصر اردو افسانہ ہر دور میں اپنے سماج کا عکاس رہا ہے۔ اور اس نے روزمرہ زندگی کے عمومی مسائل سے لے کر خصوصی مسائل اور قومی و بین الاقوامی سطح پر تغیرات و تبدل کی نمائندگی کی ہے۔ اور مستقبل میں بھی اردو افسانے سے ایسی امیدیں وابستہ ہیں۔

اردو افسانے کی روایت میں سماجی شعور کے حامل افسانہ نگار

ہر دور کے افسانہ نگاروں نے اپنے اپنے عہد میں اپنے سماج کی ترجمانی کی ہے۔ اور اُن کے افسانوں میں ان کے دور کے سماجی پس منظر کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے لیکن کچھ افسانہ نگاروں نے اپنی تحریروں مخصوص سماج اور طبقات کے حوالے سے بات کی ہے۔ جیسے کچھ افسانہ نگاروں نے دیہاتی پہلوؤں تک اپنے دائرہ کار کو محدود رکھا اور کچھ نے شہری سماج کو اپنی تحریروں میں جگہ دی جبکہ کچھ افسانہ نگار ایسے بھی گزرے جنہوں نے سماج کے ہر پہلو کو احاطۂ تحریر میں لایا۔ اور چھوٹے چھوٹے سماجی عوامل اور مسائل کو افسانوں میں جگہ دے کر قارئین میں سماجی شعور کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔

سماجی پہلوؤں پر لکھنے والوں میں پریم چند کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ پریم چند کا کا دور ۱۸۸۰ء سے ۱۹۳۶ء تک عہد بنتا ہے۔ انہوں نے اپنے عہد کے سماج کی ترجمانی اپنے افسانوں میں کی۔ انہیں پہلا سماجی افسانہ نگار بھی کہا جاتا ہے۔ پریم چند کا عہد تحریک آزادی کا عہد بنتا ہے جہاں پورے ہندوستان میں سیاسی د معاشرتی ابتری اور انتشار کا دور دورہ تھا۔ ذہنی انتشار، غربت د افلاس کے علاوہ معاشرتی زبوں حالی اور مزدوروں اور کسانوں کا استحصال لوٹ کھسوٹ عدم اطمانیت اور دیگر سماجی مسائل عروج پر تھے۔ پریم چند کے افسانوں میں معاشرے کی زبوں حالی اور مسائل کو موضوع بنایا گیا خاص کر ان کے افسانوں میں دیہاتی سماج رسم و رواج، تقریب و تہوار کی سچی تصویر کشی کی ہے۔ پریم چند اپنے عصری سماجی مسائل اور مختلف طبقات کے مابین ہونے والے باہمی تنازعات اور ان سے پیدا کردہ مسائل سے اچھی طرح آشنا تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے عہد کوئی بھی ایسا مسئلہ نہیں جن پر انہوں نے قلم نہ اٹھایا ہو، اُن کی تحریروں میں فنی گہرائی نظر آتی ہے۔ پریم چند کے دور کے افسانے آج بھی اتنی ہی اہمیت کے حامل ہیں جتنے پریم چند کے اپنے عہد میں۔ پریم چند نے مختصر افسانے اور اسکے تکنیکی لوازمات کو پہلی مرتبہ مروج اور مقبول عام کیا۔ اور کفن و پنچائیت، زیور کا ڈبہ اور اس جیسے دیگر لاتعداد افسانوں میں افراد کے باہمی عمل اور رد عمل کیلئے دیہاتی زندگی کے مسائل کو اپنی تحریروں میں جگہ دے کر سماجی شعور کو بیدار کرنے کا درس دیا۔ پریم چند ارتقاء پذیر تھا۔ اور ان کا فنِ افسانہ نگاری حالات کے ساتھ ترقی کر رہا تھا۔ اور ان کے خیالات نے واقعات اور وقت کی رفتار اور سماجی شعور کا ساتھ دیا۔ وہ اپنے عہد کی عوام کی روح میں اتر کر اُن کے دکھ درد، ان کے کرب و اضطراب، ان کی مایوسی اور امید اور اُن کی کشمکش اور شخصی ٹوٹ پھوٹ کو اچھی طرح دیکھ اور سمجھ سکتے تھے، ان کی تحریروں کا مقصد صرف اور صرف عوامی اصلاح تھا۔

راجندر سنگھ بیدی کا شمار اُردو ادب کے ابتدائی افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں کے موضوعات کا تعین کرنے کے لیے روزمرہ زندگی اور اپنے ماحول کا گہرا مشاہدہ کیا ہے۔ یعنی اُن کے افسانے اُن کے

ماحول کی عکاسی کرتے ہیں۔ قومی آزادی، سیاسی و سماجی بیداری، بچوں کے نفسیاتی مسائل اور الجھنوں کے ساتھ ساتھ عورت کی زندگی کے مسائل کی ترجمانی بھی انھوں نے اپنے افسانوں میں کی ہے۔ بیدی کے افسانوں میں خواتین اور خاص طور پر ایک واحد عورت کا سماجی کردار مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے افسانوں میں فرد کی نفسیات کے ساتھ ساتھ سماجی معنویت کا عنصر بھی واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں مردوں، عورتوں ،بچوں اور بوڑھوں کو موضوع بنا کر اُن کے انسان ہونے کی عظمت واہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ جن کے اندر کچھ کر گزرنے کے جذبات اور حوصلے موجود ہیں۔ اور اپنے آپ کو معاشرے کا فعال رکن بنانے کے لیے محنت و مشقت کے ذریعے معاشرتی اصلاح اور ترقی میں اپنا خاص کردار ادا کر سکتے ہیں۔ گویا راجندر سنگھ بیدی نے عام انسان کی خامیوں اور کمزوریوں کے ساتھ ساتھ اُن کی توانائی و طاقت کے جذبات کو بھی اپنے افسانوں کے ذریعے فروغ دیا۔ بیدی سماجی و سیاسی حالات کے پیش نظر سماج میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں سے بھی غافل نہیں رہے۔ لہذا انھوں نے تقسیم ہند کے وقت ہونے والے فسادات کو بھی اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ اُن کے افسانوی موضوعات اُن کی سماج سے گہری وابستگی اور سماجی شعور کی عکاسی کرتے ہیں۔ اُن کے افسانوں میں جہاں تخریبی اور قوتیں سر اُٹھاتی نظر آتی ہیں وہاں تعمیری پہلو بھی خاص طور نمایاں ہیں۔

احمد ندیم قاسمی معاشرتی اقدار کے ترجمان ہیں۔ معاشی و معاشرتی ناہمواریوں اور انسانی رویوں کے تضادات ان کے افسانوں کے خاص موضوع رہے انھوں نے اپنے افسانوں میں دیہاتی زندگی اور دیہاتی ماحول کے نشیب وفراز کی سچی اور حقیقی عکاسی کی ہے۔ اپنے افسانوں میں انہوں نے اپنے عہد کے سماج، خاص طور پر دیہاتی سماج کی ترجمانی بہت عمدہ انداز میں کی ہے۔ معاشرتی قوانین، سرمایہ دارانہ نظام، سیاسی و سماجی انتشار اور ابتری کے علاوہ دیہاتیوں کے مسائل اور ظلم و ستم کا ذکر بھی ان کے افسانوں میں ملتا ہے۔ پریم چند کی طرح ان کے افسانوں میں زیادہ تر گاؤں کی زندگی کی جھلک نظر آتی ہے۔ ظلم و جبر کی چکی میں پستا ہوا دیہاتی مزدور کسان اور دیگر مظلوم انسانوں کے مسائل زندگی کو انہوں نے اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ ان کا سب سے پہلا افسانوی مجموعہ چوپال تھا جس کے تمام افسانے دیہاتوں کی معصومانہ زندگی اور چھوٹے چھوٹے مسائل سے لے کر اُن پر کئے جانے والے ظلم کی داستان سناتے ہیں۔ انہوں نے دیہاتی سماج کی علاوہ وہ عام انسانی زندگی اور اُن سے متعلقہ مسائل پر بھی قلم اٹھایا۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں چوپال، بگولے، نیلا پتھر، گھر سے گھر تک اور سناٹا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جو سماجی زندگی کی مکمل تصویر لیے ہوئے ہیں۔ ان کے افسانوں کا مطالعہ کرنے سے ان کا سماجی شعور ابھر کر سامنے آتا ہے اور ہمیں سماجی حقائق سے روشناس کرواتا ہے۔

، سقوطِ ڈھاکہ، قومی اتحاد کی تحریکیں، گھیراؤ جلاؤ، بھٹو کی پھانسی اور جنرل ضیاالحق کا مارشل لاء جیسے ملکی حوادث نے ہر سطح پر بے چینی اور اضطراب کے رویوں کو جنم دیا۔ایک حساس فنکار کی حیثیت سے انہوں نے اپنے عہد کے سماجی و سیاسی نشیب و فراز کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ان کے چند افسانوی مجموعوں میں "بھاگے ہے بیاباں مجھ سے"، "ریت پر گرفت"، "تمنا بے تاب" اور "ایک عام آدمی کا کوخواب" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جن میں انھوں نے سماجی تبدیلیوں اور حقائق کو ایمانداری کے ساتھ بیان کر کے اپنے سماجی شعور کو ظاہر کیا ہے۔اور ساتھ ہی عوام کے سماجی شعور کو بیدار بھی کیا ہے۔

"منشا یاد" اُردو ادب کی افسانوی صنف میں نمایاں مقام رکھتے ہیں آپ کا تعلق دیہات سے تھا۔پریم چند کی طرح آپ نے بھی دیہاتی ثقافت اور روایات کو اپنی تحریروں میں جگہ دی۔ دیہاتی زندگی کی نفسیات و روایات کے ساتھ ساتھ وہاں کے لوگوں کے جذبات و خیالات اور روز مرہ زندگی کے مسائل و امور بھی انہوں نے ہمیں آگاہی دلائی ہے۔ آپ کے افسانوں کی سب سے بڑی خصوصیت محسوسات کا استعمال ہے۔آپ کے افسانوی کردار نہ صرف آپ کے ذاتی تجربات و مشاہدات کا نچوڑ ہیں بلکہ آپ انہیں تخلیق کرتے وقت ہر زاویے اور ہر انداز سے انہیں محسوس کیا اور پھر کاغذ کی زینت بنایا۔یعنی حواس خمسہ کا استعمال کر کے آپ نے انھیں زندہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

آپ کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد منشا یاد اپنے عہد کی سماجی زندگی کا نباض اور انسانی نفسیات سے واقفیت رکھنے ولا انسان ہے۔آپ انسانی نفسیات کو سمجھتے ہوئے معاشرتی زندگی کی باریکیوں کو نہ صرف خود سمجھنے اور محسوس کرنے میں کامیاب ہوئے بلکہ دوسروں کو بھی اس سے آگاہی دلانے میں بھی خاصا کمال اور مہارت رکھتے ہیں۔ وہ عام انسانوں کی جگہ خود کو رکھ کر اُن کے جذبات کا اظہار کرنے میں کامیاب ہوئے اور یہی ایک اچھے افسانہ نویس کی خصوصیت ہے کہ جب تک وہ عوامی جذبات کو خود پر طاری نہ کرے وہ اُن کے جذبات واحساسات کی عکاسی کرنے سے عاری نظر آئے گا۔ محمد منشایاد کے افسانوں میں خاصا تنوع ہے۔ان کے افسانوی موضوعات میں غریب اور مفلوک الحال و مجبور لاچار لوگوں کے مسائل، خاص کر بھوک، افلاس اور جبر و تشدد شامل ہیں۔اس کے علاوہ دیہی ماحول میں پرورش پانے والے لوگوں کے ماحول اور مسائل کو انہوں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا جو ان کے گہرے سماجی شعور کی عکاسی کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

آپ کی تحریروں میں "بانجھ،، " ہوا میں سانس"، "رکی ہوئی آوازیں"، "اوور ٹائم"، "نئی دستک"، "دنیا کا آخری بھوکا آدمی" اور "کہانی رات" خاص طور پر اہمیت کی حامل ہیں جو ہمارے سماجی ڈھانچے اور سرکاری حکمت عملی کے تضادات کو بھگتنے اور برداشت کرنے والی عوام کے کرب اور دکھ کو محسوس کرواتی ہیں۔اُن کا افسانہ تماشا دین کے

نام پر یا روپے پیسے کی کشش کے عوض بڑھتی ہوئی خون ریزی اور گھٹتی معصومیت کی المناک داستان پیش کرتا ہے۔ جو اُن کے گہرے سماجی شعور کا عکاس ہے۔

اُردو افسانے کی تاریخ میں سماجی شعور کا جائزہ لینے سے یہ بات واضح طور پر نظر آتی ہے کہ اردو افسانے کی ابتدا سے لے کر موجودہ دور تک تمام افسانہ نگاروں نے کسی نہ کسی انداز میں اپنے اپنے عہد اور سماج کی عکاسی کی ہے وہ سماج چاہے شہری سماج ہو یا دیہاتی سماج، امیر طبقے کا سماج ہو یا مفلوک الحال اور غریب طبقے کا سماج۔ افسانہ نگاروں نے اپنی تحریروں کے ذریعے سماجی حقائق اور تلخیوں کو بیان کرنے کے لیے اپنی کاوشوں کا لا متناہی سلسلہ جاری و ساری رکھا، اور معاشرتی مسائل اور دیگر معاشرتی عوامل کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے سماجی شعور کا اظہار کیا۔

"صادق حسین" بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہیں جنھوں نے اپنے افسانوں میں سماج خاص کر دیہاتی سماج اور اس سے متعلقہ مسائل اور حالات کو موضوع بنا کر سماجی افسانہ نگاروں کی فہرست میں نمایاں مقام حاصل کیا۔

زیرِ تحقیق عنوان "صادق حسین کے افسانوں میں سماجی شعور" (تجزیاتی مطالعہ) ہے جس میں صادق حسین کے تین افسانوی مجموعے بالترتیب "پھولوں کے محل" اور "شہر اند شہر" اور " گلاب کے آنسو "، کے علاوہ دیگر متفرق افسانوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اگلے ابواب میں صادق حسین کے افسانوں میں سماجی شعور کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔

حوالہ جات

۱۔ نگینہ جبیں۔ اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ(۱۹۴۷ءاوراس کے بعد): (الہ آباد:(405اے دریاآباد)، ص۲۔

۲۔ محمدافضال،اردو ناول میں سماجی شعور(اسلام آباد: پورب اکادمی،۲۰۰۹ء) ص۵

۳۔ اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ،ص۳۔

۴۔ ایضاً،ص۳۔

۵۔ اردو ناول میں سماجی شعور،ص۷

۶۔ اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ،ص۴۔

۷۔ ڈاکٹر طارق سعید۔اردو ادب کا تہذیبی پس منظر(لاہور: دارالشعور،۲۰۱۵ء)،ص۲۶

۸۔ ایضاً،ص۲۷۔

۹۔ ایضاً،ص۲۹۔

۱۰۔ شکیل احمد۔اردو افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی،(گورکھپور: آف سیٹ پرنٹر، ۱۹۸۴ء)،ص۵۷۔

۱۱۔ اردو ادب کا تہذیبی پس منظر،ص۔۲۶

۱۲۔ ایضاً،ص۲۸۔

۱۳۔ اطہر پرویز۔ادب کا مطالعہ(علی گڑھ :اردو گھر،۱۹۲۶ء)،ص۱۷۔

۱۴۔ فیروز سنز،اردو انسائیکلوپیڈیا(لاہور: تیسرا ایڈیشن ۱۹۸۴ء)۔

۱۵۔ اردو ناول میں سماجی شعور،ص۱۰

۱۶۔ صالحہ زریں۔اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ(مطالعہ ابتدا سے ۱۹۴۷تک) (لکھنو: نصرت پبلشرز،۲۰۰۰ء)ص۴۶۔

۱۷۔ ایضاً،ص۴۸۔

۱۸۔ سید نورالحسن۔ادب کا مقصد (لکھنو: سرفراز پریس۔۱۹۵۶ء)،ص۱۳۔

۱۹۔ احمد صدیق مجنوں۔ادب اور زندگی(لکھنوء: کتب خانہ دانش،۱۹۴۴ء)،ص۳۔

۲۰۔ اردو افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی،ص۴۸۔

۲۱۔ محمد حسن۔ادبی سماجیات(دہلی:فروغِ اردو،۲۰۱۱ء)ص۱۱۔

۲۲۔ عائشہ بیگم۔تاریخ اور سماجیات(مطبع العربیہ۱۹۹۹ ء)ص۱۷۔

۲۳۔ اردو افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی،ص۴۹۔

۲۴۔ ادبی سماجیات(دہلی:فروغِ اردو،۲۰۱۱ء)ص۲۸۔

۲۵۔ اردو ناول میں سماجی شعور،ص۱۲۹۔

۲۶۔ www.sun as.za/englishsociety/students.societies social awareness.societies

۲۷۔ www.sun as za/English society/students.societies social awareness.societies

۲۸۔ ادبی سماجیات(دہلی:فروغِ اردو،۲۰۱۱ء)ص۸۱۔

۲۹۔ قمر رئیس۔اردو میں بیسویں صدی کا افسانوی ادب (دہلی:آف سیٹ پرنٹر۔ ۲۰۰۴ء)،ص۲۵

۳۰۔ اردو افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی،ص۵۹

۳۱۔ اسلم جمشید۔ترقی پسنداردو افسانہ اور افسانہ نگار(دہلی:ماڈرن پبلشنگ ہاوس،۲۰۰۲ء) ،ص۲۲۔

۳۲۔ اردو افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی۔ص۷۵

۳۳۔ انواراحمد۔اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ(فیصل آباد:مثال پبلشرز،۲۰۱۰ء)، ص۴۶۴۔

۳۴۔ اردو ناول میں سماجی شعور،ص۳۲۔

باب دوم:

صادق حسین کے افسانوں میں سماجی شعور
(تجزیاتی مطالعہ) بحوالہ موضوع

صادق حسین اردو افسانہ نگاری میں منفرد اور معتبر مقام رکھتے ہیں۔ آپ انسان دوست افسانہ نگار کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ کیونکہ آپ نے اپنی تحریروں میں نہ صرف انسانی فطرت کے مطالعے کو باریک بینی سے پیش کیا ہے بلکہ آپکی تحریریں زندگی سے بھرپور ہیں۔ آپ انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور سماجی اضطراب و بے چینی پر گہری نظر بھی رکھتے ہیں۔ صادق حسین نے اپنے نوک قلم سے معاشرتی مسائل خاص کر دیہاتی زندگی اور متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کے مسائل کو نہ صرف محسوس کیا ہے بلکہ خود پر طاری کر کے افسانوی شکل میں نظرِ عام پر لانے میں بھی کامیاب ہوئے ہیں۔ اپنی وسعت نظر اور عمیق سماجی شعور کی بدولت انہوں نے بہت سے سماجی اور نفسی حقائق کو منکشف کیا ہے۔ بالخصوص دیہات اور اس میں بسنے والے لوگوں سے اُن کی بے پناہ محبت کا اظہار اُن کے افسانوں میں ملتا ہے۔ اور جتنی باریکی اور جزئیات کے ساتھ وہ دیہاتی سماج کی عکسبندی کرنے میں کامیاب ہوئے اس حوالے سے انھیں احمد ندیم قاسمی کے مقابل ٹھہرایا جا سکتا ہے ڈاکٹر انور سدید اس حوالے سے رقم طراز ہیں۔

> "دیہات سے اس کی محبت بھی بے لوث نظر آتی ہے۔ چنانچہ اس نے دیہات کی روح کو اپنے افسانوں میں ڈھال کر اس کے بہت سے پہلوؤں کی نمائندگی کی ہے۔ اور خوبی کی بات یہ ہے کہ اس نے انسان کی احتیاج کا مقصد پروپیگنڈا نہیں کیا بلکہ کسی غرض کے بغیر فنکار کی طرح اس ماحول کی خارجی عکاسی اور داخلی تصویر کشی میں جزئیات اور مشاہدے کی صداقت کا خلوص مندانہ ثبوت دیا ہے۔ اس نے اُن چھپے ہوتے جذبات کو بھی گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے جنھیں ایک عام افسانہ نگار بیان کرنے کی قوت نہیں رکھتا۔"[1]

صادق حسین نے افسانوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے سماجی حقائق کو تخلیق نہیں کیا بلکہ اُسے تلاش کیا ہے۔ اور دیہاتی ماحول اور سماج کو سمجھنے اور پرکھنے میں اچھے خاصے کامیاب رہے ہیں۔ آپ کا فنی سفر ۳۵ سالوں پر محیط ہے۔ انھوں نے فنی سفر کا باقاعدہ آغاز ۱۹۵۵ء میں کیا۔ اُن کے تین افسانوی مجموعوں کے علاوہ دو افسانے جو کسی افسانوی مجموعے کا حصہ نہیں رہے لیکن مختلف میگزین اور رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ کلیات کی شکل میں منظر

عام پر آچکے ہیں۔اُن کا پہلا افسانوی مجموعہ "پھولوں کے محل" کے نام سے ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا جو چودہ افسانوں پر مشتمل ہے۔"شہر اندار شہر" تیرہ افسانوں پر مشتمل اُن کا دوسرا مجموعہ ۱۹۸۸ء میں ادارہ فروغ اردو نے شائع کیا۔ تیسرا افسانوی مجموعہ "گلاب کے آنسو" کے نام سے ۲۰۰۸ء میں منظرِ عام پر آیا جس میں کل ۱۱ افسانے اور ۴ ناولٹ شامل ہیں۔

زیرِ نظر تحقیق اُن کے تینوں افسانوی مجموعوں کے علاوہ متفرق افسانوں کو بھی احاطہ کرتی ہے۔اس باب میں اُن کے متفرق افسانوں سمیت تینوں افسانوی مجموعوں کا تجزیاتی مطالعہ بحوالہ موضوع پیش کیا جارہا ہے۔

"پھولوں کے محل" میں سماجی شعور (بحوالہ موضوع):

"پھولوں کے محل" موضوعات میں تنوع اور رنگا رنگی کے باعث صادق حسین کی تخلیقی صلاحیتوں کا بہترین اظہار ہے۔

"پھولوں کے محل" کا پہلا افسانہ پو ہنچیاں ۱۹۷۳ء میں پنجاب بورڈ کے میٹرک کے نصاب میں شامل رہا۔اس افسانے کا انگریزی میں ترجمہ ۱۹۸۱ء میں آر۔سی۔ڈی کلچرل/انسٹیٹوٹ کی مطبوعہ کتاب "Modern Urdu Short Stories" میں شائع ہوا۔یہی افسانہ ادبیاتِ پاکستان کی مطبوعہ کتاب "پاکستانی لٹریچر" میں ۱۹۹۳ء میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

"پو ہنچیاں" موضوع کے اعتبار سے ایسے سماج کی عکاسی کرتا ہے جو دیہات سے تعلق رکھتا ہے۔غریب دیہاتی جو اپنی معصوم خواہشات اور آرزوؤں کی تکمیل کیلئے اپنی پوری زندگیوں کو خواہشات کے نام منسوب کر دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔اور یہ خواہشات پھر اُن کی حسرت کی شکل اختیار کر جاتی ہیں۔

صادق حسین کا سماجی شعور اس حوالے سے بڑا گہرا ہے۔انھوں نے نہایت باریکی کے ساتھ نچلے اور مزدور طبقہ سے تعلق رکھنے والے افراد اور ان کی ضروریات، رسوم ورواج، روایات رہن سہن اور خواہشات کا مشاہدہ کیا ہے۔ افسانہ پو ہنچیاں کا موضوع بھی ایسے ہی طبقے کی نمائندگی کرتا ہے جس میں آرزو کی تکمیل اور شکست آرزو کے لمحات گھریلو مجبوریاں انسان کی خواہشات کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔اور انسان کو اس حد تک مجبور اور بے بس کر دیتی ہیں کہ انسان رشتوں سے بندھی ڈوریوں کے آگے خود کو بے بس اور مجبور سمجھنے لگ جاتا ہے۔

اس افسانے میں شکست اور آرزو کے لمحات کو صادق حسین جس انداز میں بیان کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔اسکی نظیر نہیں ملتی۔مذکورہ افسانے میں والدین کے خلوص اور پیار کے علاوہ اُن کی قربانیوں کو فنکارانہ انداز میں

پیش کر کے پدرانہ شفقت ورحمت کے بے لوث جذبے کی نمائندگی کی گئی ہے۔اور ساتھ ہی ان تلخ حقائق سے بھی پردہ اٹھایا گیا ہے جو محنت کش اور مزدور طبقہ کی معصوم اور نہ ختم ہونے والی خواہشات گزرتے وقت کے ساتھ نیا روپ دھار لیتی ہیں۔افسانہ "پوہنچیاں" کے حوالے سے ڈاکٹر انور سدید اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"شکست اور آرزو کا یہ لمحہ بے حد نازک ہے لیکن صادق حسین کی فنکارانہ قوت نے اسے تکمیل آرزو کی صورت دے کر عالمگیر صداقت عطا کر دی ہے۔"[۲]

افسانہ پوہنچیاں کی کہانی ایک ایسے کنبے کے گرد گھومتی ہے جس کا سربراہ اپنے کنبے کی کفالت کے لیے ہر طرح کے سرد و گرم سے گزر جاتا ہے۔اور اپنی اہلیہ کی ایک چھوٹی سی خواہش کو پورا کرنے کیلئے اپنی پوری زندگی بتا دیتا ہے۔"ازدواجی زندگی کے ابتدائی ایام میں فریداں نے پوہنچیوں کی فرمائش کی تھی۔" مستری خداداد خان کو اپنی بیوی کی چھوٹی سی خواہش پوری کرنے کے لیے پوری زندگی محنت کرنا پڑتی ہے۔وقت اور حالات کی ستم ظریفیاں اس کی راہ میں حائل ضرور ہوتی ہیں لیکن وہ ہمت نہیں ہارتا۔روزانہ کام پر جاتے ہوئے مستری خداداد خان جب اپنے سسرالی گاؤں کے رستے کی طرف دیکھتا تو اسے اپنی اہلیہ کی فرمائش یاد آجاتی۔"[۳]برسوں پہلے دنداسے سے رنگے ہوئے ہونٹوں سے نکلی کنواری فرمائش پھر اس کے کانوں میں گونجنے لگتی۔"اور وہ دل ہی دل میں تہیہ کرتا کہ وہ فریداں کے لیے پوہنچیاں ضرور خریدے گا۔صادق حسین نے اس افسانے میں غریبوں کی چھوٹی چھوٹی خواہشات کی راہ میں آنے والی مشکلات کا جہاں پر ذکر کیا ہے وہاں پر ان صاحبِ اختیار افراد کی سنگدلی اور سفاکی کو بھی بے نقاب کیا ہے جو غریبوں کا حق وقت پر ادا نہیں کرتے۔ جیسے افسانے میں ٹھیکیدار مستری خداداد کو پوری اجرت نہیں دیتا۔"ٹھیکیدار جب اجرت بانٹتا تو خداداد خان کی روزانہ مزدوری سے آنہ دو آنے کاٹ لیتا۔"[۴]ٹھیکیدار کے اس رویے پر خداداد کو بہت افسوس ہوتا لیکن مجبوری کے مارے اپنی زبان کو بند رکھتا اور کچھ نہ کہتا۔اور یوں اس کی روپے اکٹھے کرنے اور پوہنچیاں خریدنے کی خواہش حسرت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔لیکن وہ حوصلہ نہیں ہارتا۔چار تولے سونے کی پوہنچیاں خریدنے کے لیے اور روپیہ پیسہ اکٹھا کرنے کے لیے اُسے ساری زندگی محنت کرنا پڑتی ہے تب جا کر وہ اپنی بیوی کے لیے پوہنچیاں خریدنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔لیکن عین اُس وقت اُسکی بیٹی اس خواہش کی تکمیل میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔اور یوں بے بس خداداد وہ پوہنچیاں بیوی کی بجائے بیٹی کی کلائیوں میں دیکھ کر خوش ہو جاتا ہے۔"جب خداداد خاں نے اپنے گھر کے آنگن میں قدم رکھا تو پلنگڑی پر بیٹھی ہوئی سکینہ نے دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کر دیے۔اس کی بھری بھری کلائیوں کو پوہنچیوں نے نکھار دیا تھا" [۵]

افسانہ پوہنچیاں کا موضوع گاؤں والوں کی ضروریات، تمناؤں اور آرزوؤں کے بارے میں آگاہی دلاتا ہے۔اور دیہاتی سماج سے تعلق رکھنے والے افراد کے بارے میں بتاتا ہے کہ ان کی خواہشات کی دنیا بڑی معصوم اور محدود

ہوتی ہے۔ وہ بڑے بڑے خواب نہیں دیکھتے۔ یہی وجہ ہے جب مستری خداداد خان بازار کی بلند و بالا عمارات کو دیکھتا ہے تو دل ہی دل میں سوچتا ہے کہ یہ سب دولت ہی کے کرشمے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اسے خیال آتا ہے کہ مجھے ان سب کی ضرورت نہیں۔ اس کی تمنا تو بس اتنی ہے کہ وہ اپنی شریکِ سفر کی پونہچیوں کی آرزو پوری کر دے۔ "اسے دھن دولت کی ضرورت نہیں۔ اسے تو چار تولے سونا مہیا کرنا ہے۔"٦ صادق حسین نے بتایا ہے کہ حالات کی ستم ظریفی کا نشانہ بھی غریبوں کی معصوم اور نہ پوری ہونے والی خواہشات ہی بنتی ہیں۔ غریب اور محنت کش طبقے کے افراد ساری زندگی محنت مزدوری میں بسر کر دیتے ہیں لیکن خواہشات کی تکمیل کے لیے روپیہ پیسہ جمع کرنے کے لیے پوری زندگیاں بسر کر دیتے ہیں اور جب تھوڑا بہت سرمایہ جمع ہو جاتا ہے تو کوئی نہ کوئی ایسی افتاد آن پڑتی ہے کہ انسان کو اپنی ساری پونجی خرچ کرنا پڑ جاتی ہے اور روپیہ جمع کرنے کا عمل از سرِ نو شروع ہو جاتا ہے۔

"روپیہ بڑی کاوشوں سے آہستہ آہستہ اکٹھا کیا جاتا اور پھر اچانک بجلی کی سی تیزی کے ساتھ خرچ ہو جاتا۔ ہر چھے مہینے کے بعد کوئی نہ کوئی بپتا آن پڑتی۔ بچے بچائے پیسے اڑ جاتے۔ بات پھر از سرِ نو شروع ہوئی، امیدوں کی کونپلیں پھوٹنے لگیں پھر خوابوں کی محل ایک بیک وقت ڈھے پڑتے اور یونہی زندگی چکر کاٹتی رہی۔"۷

اگر دیکھا جائے تو افسانہ پونہچیاں پدرانہ شفقت کا عمدہ نمونہ پیش کرتا ہے۔ جہاں والدین اپنی خواہشات پر بچوں کی خواہشات کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اولاد کی محبت ایک بڑی مجبوری کی صورت میں خواہشات کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ جیسے افسانے میں جب مستری خداداد خان اپنی اہلیہ کی فرمائش پوری کرنے کے قابل ہوتا ہے تو اس کی بیٹی اسے اپنا حق سمجھتے ہوئے بہت خوشی کا اظہار کرتی ہے۔ اور اس طرح نہ چاہتے ہوئے بھی مستری خداداد کو پونہچیاں بیٹی کو دینا پڑ جاتی ہیں۔ اور یوں بیوی کی تمنا پوری کرنے کی خواہش اس کے دل میں ہی رہ جاتی ہے۔ "سکینہ کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی اور پھر گھڑے وہیں چھوڑ کر پونہچیاں ہاتھوں میں لئے گھر کی طرف بھاگ پڑی۔"۸ مجموعی طور پر افسانہ "پونہچیاں" میں دیہی معاشرت سے تعلق رکھنے والے افراد کی مجبوریوں اور روزمرہ زندگی کے مسائل کی عکاسی بہت خوبصورت انداز میں تمام تر جزئیات اور باریکیوں کے ساتھ کی گئی ہے۔

افسانہ پتھیرا میں بھٹہ مزدوروں کے معاشی و سماجی استحصال کو موضوع بنایا گیا ہے۔ صادق حسین نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ بالادست قوتوں کے ہاتھوں زیردست قوتوں کا استحصال انسانی زندگی میں ابتداء ہی سے موجود ہے۔ کیونکہ طاقت ہی سب کچھ ہے۔ طاقتور اور صاحبِ حیثیت افراد کو ہی معاشرے میں بلند مقام حاصل ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے یہی طاقتور یا بالادست قوتیں ذاتی مفادات کی خاطر غریبوں کی مجبوریوں سے کھیل جاتی ہیں۔ اس افسانے کا موضوع بھی ظالم سماج کی بے رحم سفاکیاں ہیں۔

"ٹھیکیدار بولا: اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ میرے پاس اینٹوں کا اچھا خاصا ذخیرہ ہو جائے گا اور پھر اس لالچ میں دوسرے بھٹوں کے کاریگر کم از کم ایک دن کے لیے میرا کام کریں گے۔ اور پھر ہو سکتا ہے کہ وہ کاریگر لوٹ کر دوسرے بھٹوں پر نہ جائیں۔ اور یہ تو میں جانتا ہوں کہ اس علاقے میں ایسا کوئی جوان پیدا ہی نہیں ہوا جو کم سے زیادہ اینٹیں بنا سکے۔ اس لیے سمجھ لو کہ اگلے اتوار دو سو روپے کی رقم تمھارے پاس پہنچ گئی۔" ۹

صادق حسین نے افسانہ پتھیرا میں بھٹہ مزدور کلچر کی عکاسی کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ہمارے معاشرے میں بھٹہ مزدوروں کا سماجی و معاشی طور پر جتنا استحصال کیا جاتا ہے اتنا شاید ہی کسی اور طبقے کے مزدوروں کا کیا جاتا ہو۔ بھٹہ مزدوروں کو سب سے زیادہ حقیر سمجھا جاتا ہے۔ ان سے جانوروں کی طرح کام لیا جاتا ہے اور اس کے عوض انہیں بہت تھوڑی اجرت ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے وہ تاحیات غربت کی چکی میں پستے رہتے ہیں اور اپنی چھوٹی چھوٹی معصوم خواہشات کی تکمیل کے لیے بعض اوقات اپنی جانوں سے بھی کھیل جاتے ہیں۔ پتھیرا اپنے بیٹے کی پیدائش پر بہت خوشی کا اظہار کرتا ہے اور اُس کے ختنے کرانے کیلئے بھی مکمل طور پر ایک رسم ادا کرنا چاہتا ہے۔ جو اسکی بساط سے بڑھ کر ہے اور اس کے لیے اُسے کافی رقم درکار ہوتی ہے۔ پتھیرا ٹھیکیدار سے تھوڑی سی رقم ادھار لینے کا مطالبہ کرتا ہے لیکن ٹھیکیدار اسے وہ رقم ادھار دینے پر بھی راضی نہیں ہوتا بلکہ الٹا اُس کی مجبوری سے فائدہ اُٹھا کر اس سے اینٹیں بنانے کا مقابلہ کرواتا ہے کیونکہ اُسے معلوم ہے کہ پتھیرا جتنا محنتی کوئی اور نوجوان نہیں ہو سکتا۔ لہذا انعام کا حقدار بھی وہ ٹھہرے گا اسطرح ٹھیکیدار پتھیرے کو راضی کرتا ہے اور پس پردہ اپنا ذاتی مفاد زیادہ یعنی زیادا سے زیادہ کام نکلوانے کا متمنی ہوتا ہے اور نتیجتاً کامیاب بھی رہتا ہے۔ لیکن پتھیرا اینٹیں بنانے کا مقابلہ جیت کر زندگی کی بازی ہار جاتا ہے۔

" بیگم جان کی ایک چیخ سنائی دی اور وہ پتھیرے کے ٹھنڈے جسم سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگی" ۱۰

اس افسانے میں جہاں سماجی بے حسی کو موضوع بنایا گیا ہے وہاں بھٹہ مزدور کی روزمرہ زندگی کے معمولات کو بھی سامنے لیا گیا ہے۔ محنت و مشقت تو ان کی زندگی کا جزِ لازم ہے ہی لیکن غربت اور تنگدستی کے باوجود غیرت مندی ان کی شخصیت کا خاصا ہوتی ہے۔ یہ لوگ چاہے جتنے ہی غریب ہوں اور حقیر طبقہ سے تعلق کیوں نہ رکھتے ہوں اپنی عزت و ناموس پر حرف نہیں آنے دیتے اور اپنی عزتوں کا تحفظ کرنا جانتے ہیں۔ پتھیرا غربت کے باوجود اپنی بیوی کو گھر صرف اس لیے بٹھا دیتا ہے کہ بھٹے پر کسی نئے آنے والے مزدور نے اس پر آوازہ کسا تھا۔ اور اس پر پتھیرا شدید ردِ عمل کا اظہار کرتا ہے۔" اس دن ایک نووارد نے اس پر آوازہ کسا تھا۔ اس دن اگر ٹھیکیدار بیچ بچاؤ نہ کرتے تو پتھیرا نووارد کی تکا بوٹی کر دیتا۔" ۱۱

بے شک افسانے کا موضوع سماجی استحصال ہے۔ لیکن اس افسانے میں صادق حسین نے انسانی زندگی کے باریک سے باریک اور نازک معاملات کو بھی بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ جیسے کامیاب ازدواجی زندگی کا راز اسی

بات میں مضمر ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے جذبات اور احساسات کو سمجھیں اور ایک دوسرے کی پسند و ناپسند کا خیال رکھیں۔ جیسے بیگم جاں پتھیرا کے مزاج کو سمجھتے ہوئے سمجھداری کا مظاہرہ کرتی ہے۔ اسی طرح چھوٹی چھوٹی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے جوش، ولولہ اور محنت کے ساتھ لگن کو غریب طبقے کے افراد اپنا شعار بنا لیتے ہیں اور مقاصد کے حصول کے لیے تن من دھن کی بازی لگا دیتے ہیں۔ "جب پتھیرا اور بیگم جان مل کر کام کرتے تو معلوم ہوتا تھا جیسے مٹی، پانی، حرکت اور پسینے نے سارے میدان میں فتح پالی ہو۔"[۱۲]

صادق حسین کے افسانوں میں ایک اور رنگ جو سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ ہے سماجی بندھن، سماج کی بیڑیوں نے انسان کو پوری طرح سے اپنے شکنجے میں لیا ہوا ہے۔ اور اس سے چھٹکارا پانا انسان کے اپنے بس میں نہیں۔ یہ بات بھی سچ ہے کہ انسان خواہشات کا منبع ہے اور خواہشات کی تکمیل کے لیے انسان جس طرح چاہے وہی راستہ اختیار کر سکتا ہے۔ مثلاً کچھ لوگ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے غلط ذرائع جیسے؛ لوٹ کھسوٹ مار کٹائی، چھینا جھپٹی اور حق تلفی وغیرہ اختیار کر لیتے ہیں۔ جبکہ کچھ لوگ اس کے برعکس جائز ذرائع کا استعمال کرنا جانتے ہیں۔ صادق حسین کے افسانوں میں خواہشات کی تکمیل کے عمل میں بغاوت کی بجائے نیک نیتی خلوص اور سچی لگن نمایاں ہے جو ہر لحاظ سے خیر کا درس دیتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا سماجی وانفرادی شعور وسیع النظری کے باعث انسان دوستی کا درس دینے کے ساتھ ساتھ معاشرتی اصلاح کا بھی ضامن ہے۔ جیسے مذکورہ افسانے میں پتھیرا اپنے بیٹے کی خوشی منانے کے لیے روپیہ ادھار لینا چاہتا ہے۔ لیکن اس راہ میں بھی رکاوٹ ڈال کر اُسے محنت اور مقابلے کے لیے آمادہ کیا جاتا ہے۔ جسے پتھیرا خوش دلی سے قبول کر لیتا ہے۔ "پتھیرا زمین پر چت لیٹا ہوا تھا اس کی آنکھیں بند تھیں۔ بیگم جان خوشی سے پاگل ہوئی جارہی تھی وہ جنجھوڑ جنجھوڑ کر پتھیرے کو اٹھا رہی تھی"[۱۳] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صادق حسین کے افسانوں میں جہاں محنت زندگی کی علامت بن کر سامنے آتی ہے وہاں وہ محنت کو موت کے ساتھ وابستہ کر کے خوشیوں کے حصول اور آرزوؤں کی تکمیل کے لیے انسانی کی کاوشوں اور جذبات کی عکاسی بھی واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے ۔اس حوالے سے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

"صادق حسین نے بعض افسانوں میں محبت کا رشتہ موت کے ساتھ بھی وابستہ کیا ہے لیکن یہ کیفیت متوازن اور معتدل فضا میں پیدا نہیں ہوتی اور اس کے پس پشت بھی خوشیاں حاصل کرنے کا جذبہ ہی کارفرما ہے"[۱۴]

افسانہ "جب قوس قزح کی آنکھ کھلی،، موضوع کے اعتبار سے پڑھے لکھے سماج کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ افسانہ خطوط کی صورت میں عورت کی نفسیات اور محبت کے بارے میں لکھا گیا افسانہ ہے۔ جس میں صادق حسین نے عورت اور مرد کی نفسیات کا موازنہ کیا ہے۔ بنیادی طور پر یہ کہانی ایک پڑھی لکھی خاتون ''رخسانہ'' کے گرد گھومتی ہے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت زیادہ حساس طبیعت کی مالک ہے۔ اور پشاور سے تعلق رکھنے والے کھلاڑی کی

محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے لیکن تقسیم ہند کے بعد وقت کے ہاتھوں مجبور رخسانہ مشرقی پاکستان میں رہ جاتی ہے اور گل نواز مغربی پاکستان (پشاور) آ جاتا ہے۔ اور والدین کی رضامندی کے مطابق اپنا گھر بسا لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لیکن ادھر رخسانہ کی محبت نہ مٹنے والی ہے اس کی محبت میں وارفتگی اور والہانہ پن برقرار ہے۔ وہ اپنی زندگی کے ایام یادوں کے سہارے کاٹ رہی ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی عمر ڈھل رہی ہے۔ ایک انگریزی کا پروفیسر رخسانہ میں دلچسپی رکھتا ہے لیکن رخسانہ کے نزدیک "عورت صرف ایک بار ہی محبت کر سکتی ہے۔ اگر وہ دوسری بار محبت کر لے بھی تو وہ سمجھوتہ ہو سکتا ہے۔ محبت نہیں"۔ لہذا رخسانہ محبت کے خول سے باہر نہیں آتی اور ساری زندگی محبوب کی یادوں کے لیے وقف کرنے کو تیار ہے۔

> "اداس تنہائیوں کے لمحات روز بروز خوفناک ہوتے جا رہے ہیں۔ جوں جوں عمر بیت رہی ہے موت کا خیال قریب آ رہا ہے۔ کاش اس وقت تم میرے پاس ہوتیں اور میں تمھاری گود میں اپنا سر رکھ کر آرام سے سو جاتی۔ آٹھ سال گزر گئے۔ طویل رینگتے ہوئے بے کیف سال۔"[۱۵]

صادق حسین عورت کی نفسیات سے بخوبی آشنا ہیں۔ عورت کی نفسیات کو ہی انھوں نے افسانے کا موضوع بنا کر ہم پر یہ واضح کیا ہے کہ محبت کا جذبہ ہر ایک عورت کے سینے میں موجزن ہوتا ہے اور عورت صرف ایک بار ہی دل کی اتھاہ گہرائیوں سے محبت کر سکتی ہے۔ عورت چاہے فلسفی ہو یا سائنسدان، مصنفہ ہو یا سیاست دان، محبت جیسے لطیف جذبے سے کٹ کر نہیں رہ سکتی۔" عورت ہمیشہ عورت ہے خواہ وہ فلسفی ہو یا سائنسدان، مصنفہ ہو یا سیاستدان۔ دراصل یہ آگ عورت کے دل میں ایک بار ضرور سلگتی ہے۔"[۱۶] اس افسانے میں انہوں نے عورت کی فطرت کو حقیقت پسندی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور اسکے علاوہ انہوں نے اس سماجی پہلو کی طرف ہماری توجہ مبذول کروائی ہے کہ عورت چاہے جیسی بھی ہو اُسے مرد کے سہارے کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے کیونکہ ہمارا معاشرہ مردوں کا معاشرہ ہے اور ایسے معاشرے میں تنہا عورت کا گزارہ مشکل ہو جاتا ہے۔ مرد کے سہارے کے بغیر عورت کی زندگی بے رنگ اور بے رونق ہو جاتی ہے۔ رخسانہ بھی اس حقیقت سے باخوبی آشنا ہے۔ اور اپنی سچی محبت کا ثبوت دینے کے لیے جب اپنی دوست چندرا کو خط لکھتی ہے تو اس بات کا بھی برملا اظہار کرتی ہے کہ مرد کے بغیر عورت کی زندگی بے معنی ہو جاتی ہے۔ صادق حسین نے بتایا ہے کہ قوانین فطرت کے خلاف ورزی کرنے سے کبھی دل کو سکون اور سچی مسرت حاصل نہیں ہو سکتی۔ افسانے میں رخسانہ بھی اپنے معمولات زندگی سے اکتا چکی ہے اور تنہائی اور اداسیوں کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں گرتی جا رہی ہے۔ تنہائی کے لمحات اُس پر گراں گزر رہے ہیں اور گل نواز سے ملنا اس کے لیے اب ممکن نہیں رہا کیونکہ وہ اس کی ہنستی بستی خوشگوار ازدواجی زندگی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ آتی ہے۔ لہذا اب وہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ وہ انگریزی کے پروفیسر کے لیے اپنی

رائے دے سکے۔" تو میری چندرا! کل رات کو میں یہاں سے چل پڑوں گیاور ڈھاکے پہنچ کر اتوار کاانتظار کروں گیاور جب وہ دن آئے گا تو ساڑھے چار بجے اپنے مقدر کا فیصلہ کرنے کی کوشش کروں گی۔"۱۷

اگر دیکھا جائے تو سماجی بھلائی کا عنصر اس افسانے میں بھی نمایاں ہے۔رخسانہ اپنی قسمت کا فیصلہ وقت کے ہاتھوں مجبور ہو کر صرف اس لیے کرتی ہے کہ گل نواز کا ہنستا بستا گھر تباہ نہ ہو یہاں بھی سماجی بندھن اور رشتے خواہشات کی راہ میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔اور انسان اُن کے سامنے مجبور ہو کر اپنے ہی ہاتھوں اپنے جذبات اور خواہشات کا قتل کر دیتا ہے۔افسانے کاایک اقتباس اس حوالے سے ملاحظہ ہو:

''اب تم ہی بتاؤ کہ اس گھر میں اس پر سکون گھر میں معصومیت اور زندگی سے بھر پور گھر میں آکر ایک ہلکی سی لرزش بھی آجائے تو کہ کتنا بڑا ظلم ہوگا۔تو میری چندا! کل رات کو میں یہاں سے چل پڑوں گی"۱۸

اس افسانے کے ذریعے جہاں قربانی کے جذبات اور دل کے ہاتھوں مجبوری جیسی کیفیات کا ذکر کر کے صادق حسین نے عورت کی نفسیات کو بیان کیا ہے وہاں انھوں نے مردوں کی نفسیات کو بھی سامنے لایا ہے۔بلکہ کسی حد تک وہ عورت اور مرد کی نفسیات کا موازنہ بھی کرتے ہیں۔مردوں کی نفسیات کے حوالے انہوں نے جو نکتہ اجاگر کیا ہے وہ یہی ہے کہ مرد کی فطرت میں یکسانیت ہے۔وہ ایک عورت سے محبت کا دعویدار تو ہو سکتا ہے لیکن آئیڈیل کو اپنانے کی تمنا عمر بھر اس میں موجود ہوتی ہے۔

"آئیڈیل عورت نہ ابھی تک پیدا ہوئی ہے نہ کبھی پیدا ہو گی۔اس لیے کہ ایک نسوانی چہرہ دوسرے نسوانی چہرے سے مختلف ہوتا ہے اور مرد کی نگاہ ہر اس عورت کو جسے اس نے پہلے نہ دیکھا ہو دلچسپ پاتی ہے۔" ۱۹

مرد کی نفسیات ہر دور میں یکساں رہتی ہے اس میں کوئی ردوبدل نہیں آتا۔جبکہ اس کے برعکس عورت کے دل میں محبت کی آگ دوبارہ نہیں سلگ سکتی۔

صادق حسین نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ ہمارے معاشرے میں مردوں کو کھلم کھلا گھومنے کی اجازت ہوتی ہے جبکہ عورتوں کی ایسی حرکات کو معاشرے میں معیوب سمجھا جاتا ہے۔صرف وہی خواتین آزاد ہوتی ہیں جو پیشہ ورانہ زندگی گزارنے پر مجبور ہوتی ہیں لیکن بے شک ان کا اٹھنا بیٹھنا ملنا جلنا مردوں سے بھی ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود انہیں اپنی حدود کا خیال ہوتا ہے اور وہ ایک خول میں رہ کر مردوں سے بات چیت کرتی ہیں۔بحیثیتِ مجموعی پورے افسانے میں صادق حسین نے اونچے اور آزاد خیال طبقے سے تعلق رکھنے والی تنہا عورت کی نفسیات اور دیگر مسائل کو بہت منفرد انداز میں پیش کیا۔

افسانہ" مولا پہلوان "کا موضوع رومان،محبت اور مقصدیت کے گرد گھومتا ہے۔یہ افسانہ دیہاتی سماج کی ترجمانی کرتا ہے۔اس افسانے کی کہانی دیہاتی سماج سے تعلق رکھنے والے باوقار اور مستحکم مزاج پہلوان کے گرد گھومتی

ہے۔ جو اپنی محبت کو اپنی انا پر قربان کر دیتا ہے۔ فرد واحد یعنی اپنی محبت کی وجہ سے وہ پوری برادری والوں کے دلوں کو ٹھیس نہیں پہنچا سکتا۔ اس کی ذات سے منسوب باقی تمام رشتے اُسے کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں۔ لہذا وہ اپنے مقصد کو ہر حال میں پورا کرنا چاہتا ہے اور اس میں کامیاب بھی رہتا ہے۔ لیکن اپنی محبت ریشماں سے کئے ہوئے وعدے کی پاسداری میں ناکام رہتا ہے۔ اور محبت کے امڈتے جذبات اور شدت کو بھلا کر جیت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ "مولا پہلوان ایک بھوکے شیر کی طرح رحیا کی طرف بڑھا پھر بڑی پھرتی سے رحیا کو اپنے فولادی بازوؤں میں سمیٹ کر پٹک دیا۔ "٢٠؎

یہ افسانہ اس عہد کے سماج کی عکاسی کرتا ہے جب تفریح طبع کے ذرائع اور مواقع بہت محدود تھے۔ اور لوگ میلوں ٹھیلوں میں شریک ہو کر تفریح طبع کے لمحات سے لطف اٹھاتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے تہذیبی ورثے اور کلچر کو زندہ رکھنے کے لیے مختلف تہواروں میں شرکت کو یقینی بناتے تھے۔ اس افسانے میں صادق حسین نے محبت جیسے لطیف جذبات کو بہت عمدگی سے بیان کیا ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ محبت ایک فطری عمل ہے۔ دیہات سے تعلق رکھنے والے افراد من کے کھرے ہوتے ہیں اور اپنے رشتوں کو نبھانا جانتے ہیں۔ مولا پہلوان محبت میں سچا ہونے کے باوجود محبت اور مقصدیت کے درمیان ہونے والی جنگ میں شکست کھاجاتا ہے۔

سماجی بندشن کے ہاتھوں مجبور ہو کر مولا پہلوان اپنی محبت کو قربان کر دیتا ہے۔ صادق حسین نے مولا پہلوان کے دلی جذبات اور کیفیات کو جس فنی چابکدستی کے ساتھ بیان کیا ہے اسکی مثال نہیں ملتی۔ خاص کر اس کشمکش کی کیفیت میں جب ریشماں اُسے کُشتی میں ہار جانے کا وعدہ لیتی ہے تو مولا پہلوان سے فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اسکا حریف اُسکی محبوبہ یعنی ریشماں کا بھائی ہوتا ہے۔ " تم بہادر ہو اور بہادر اپنا قول ہارا نہیں کرتے۔ ریشماں کی آواز مولا کے کانوں میں گونجنے لگی "۔ ٢١؎ عموماً تو یہی ہوتا ہے کہ انسان محبت کی جنگ میں انا اور مقصدیت کا گلا گھونٹ کر محبت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن مولا پہلوان کا معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے یہاں محبت کی شکست اور فتح انا کی ہوتی ہے۔ کیونکہ اس انا کے کے ساتھ خاندانی وقار اور بہت سے لوگ وابستہ ہوتے ہیں۔ اس لیے انا اور محبت کی جنگ میں مولا پہلوان انا کی جیت کو محبت پر ترجیح دیتا ہے۔

اس افسانے میں دیہاتی کلچر سے تعلق رکھنے والے مشاغل کو بھی سامنے لایا گیا ہے کشتی لڑنا اور کبڈی جیسے میچ عموماً دیہاتوں میں کھیلے جاتے ہیں۔ مولا پہلوان کشتی لڑنے میں ماہر ہوتا ہے لہذا تمام رشتہ دار اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور اُس کی فتح کے لیے دعائیں بھی مانگتے ہیں۔ ذہنی کرب سے دوچار مولا پہلوان جب اکھاڑے میں رحیا کے مدمقابل آتا ہے تو ریشماں کی محبت راہ میں رکاوٹ بنتی ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو بے حد مجبور اور کمزور سمجھتا ہے۔

رحیما کی آنکھیں ہو بہو ریشماں کی آنکھوں سے ملتی تھیں۔ مولا پہلوان کی بے بسی یہی ظاہر کرتی ہے کہ وہ محبت کے آگے ہار مان جائے گا لیکن عین اُس وقت جب وہ مقابلہ ہارنے کے قریب ہوتا ہے اُسکے استاد کی ایک آواز اور تسلی آمیز کلمات اُس کے لیے توانائی کا کام کر جاتے ہیں اور یک لخت ریشماں کی محبت کو جھٹک کر وہ پوری طاقت کے ساتھ رحیما پر ٹوٹ پڑتا ہے "سنبھل کر پٹھے۔۔۔۔ یکا یک مولا پہلوان کے استاد کی آواز گونجی "۲۲۔

صادق حسین یہ باور کروانے میں کامیاب رہے ہیں کہ داد و تحسین سے انسان کے جوش و جذبات کو نہ صرف تقویت ملتی ہے بلکہ ایسے کلمات کامیابی سے ہمکنار کرنے میں بھی معاون ثابت ہوتے ہیں۔ جیسے مولا پہلوان کا استاد اسے جیتے رہو پٹھے کہہ کر پکارتا ہے یا اُسے تھپ کاتا ہے تو اس کے بازوؤں کی مچھلیاں ابھر آتی ہیں اور وہ جوشیلے انداز میں کشتی لڑتا ہے۔ اور حریف کو شکست سے دوچار کر دیتا ہے۔

صادق حسین نے "مولا پہلوان" افسانہ کے ذریعے دیہاتیوں کی ایک خاص صفت کو واضح کیا ہے۔ اور وہ ہے روایات کی پاسداری۔ دیہاتی مذہبی اور دینی امور کی انجام دہی میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرتے جیسے افسانے کی ابتداء میں اذان کی آواز سنتے ہی مولا پہلوان خاموش ہو جاتا ہے۔

> "مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی تو اذان کی تیسری کڑی پر پہنچا تو اس نے دونوں کلمے کی انگلیاں انگوٹھوں سے ملا کر ہونٹوں سے لگا لیں اور پھر اس انداز سے انہیں چوما کہ ہونٹوں کے ملنے اور کھلنے سے ایک شریں اور پر خلوص بوسے کی نہایت واضح آواز پیدا ہوئی۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور انگوٹھوں سے ملی ہوئی کلمے کی انگلیاں اسی حالت میں پپوٹوں پر پھیر کر کلمہ کا ورد کرتا ہوا پھر ڈنڈ پیلنے لگا۔"۲۳۔

پورا افسانہ خالصتاً دیہی سماج کی سچی تصویر پیش کرتا ہے۔

"کلیوں کی پکار" موضوعاتی اعتبار سے غریب طبقے کی نفسیاتی اور ذہنی کش مکش کے علاوہ پدرانہ شفقت کی عکاسی کرتا ہے۔ صادق حسین نے اس افسانے کے ذریعے واضح کیا ہے کہ غربت اور بے بسی ہنستے بستے گھرانوں کی خوشیوں کی قاتل بن جاتی ہے۔ اس افسانے میں صادق حسین نے ایسے درمیانے اور غریب طبقے کی نمائندگی کی ہے جہاں بیٹیوں کی پیدائش کو دل سے قبول نہیں کیا جاتا۔ بلکہ ناپسندیدگی اور نحوست کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ بیٹے کی پیدائش پر خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ "جوں جوں لڑکیاں پیدا ہوتی گئیں جمیلہ کی مسرتوں پر اوس پڑتی گئی۔ "کلیوں کی پکار میں بھی بیٹے کی تمنا میں کنبہ بیٹیوں سے بھر جاتا ہے۔ فطرت کے قوانین کو آج تک کوئی نہیں توڑ سکا۔ قدرت جو چاہتی ہے وہی ہو کر رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کاموں میں کسی بھی انسان کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ اس کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں۔ لہذا انسان کو ہر حال میں اللہ تعالیٰ کو رضا میں خوش رہنا چاہیے۔ بیٹیوں کی پیدائش پر دلگرفتہ اور پریشان ہونے کی بجائے خوش دلی سے اُسے قبول کرنا چاہیے۔

صادق حسین نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ انسان کو اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے چاہیں۔ اولاد کی خواہش ہر فرد کو ہوتی ہے اور یہ فطری عمل ہے لیکن اگر غربت اور تنگدستی ہو تو زیادہ بچوں کی تمنا کرنے سے انسان اور زیادہ پریشان ہو جاتا ہے۔ جیسے افسانے میں اسلم بیٹے کی چاہ میں اپنا کنبہ بیٹیوں سے بھر لیتا ہے اور اس طرح بڑے کنبے کی کفالت کرتے کرتے اس کی پریشانیوں میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ "ہنس مکھ اور زندہ دل اسلم یکسر بدل گیا۔ تفکرات نے اس کے چہرے کی آب وتاب کو جھنجھوڑ ڈالا۔" ۲۴

اس افسانے میں چھوٹے کنبے اور بڑے کنبے کا موازانہ کر کے بتایا گیا ہے کہ چھوٹے کنبے کی کفالت بڑے کنبے کی نسبت بہت آسانی سے کی جاسکتی ہے۔ مذکورہ افسانے میں اسلم کے دفتر میں کام کرنے والے محمود کے صرف دو بچے ہوتے ہیں اور وہ اسلم کے ہم پلہ ہونے کے باوجود اس سے کہیں بہتر اور خوشحال زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے۔ اسے ہر طرح کی آسائش میسر ہوتی ہے۔ "محمود اس سے کم تنخواہ پاتا تھا مگر ٹھاٹ کی زندگی بسر کر رہا تھا۔" ۲۵ صادق حسین نے اس موازنے کے ذریعے معاشرتی مسائل میں اضافے کی ایک وجہ شرح آبادی میں اضافہ بھی ہے کی طرف اشارہ کر کے معاشرے کے مسائل کو کم کرنے کی شعوری کوشش کی ہے اور اس حوالے سے معاشرے کے افراد کو آگاہی دلانے میں بھی کامیاب ہوئے ہیں۔

ایک اور اہم نکتہ جو صادق حسین نے اجاگر کیا ہے وہ یہ کہ نیک نیتی اور حلال رزق کمانے والوں کے لیے معاشرے میں عرصہ حیات تنگ ہو جاتا ہے جبکہ ہمارے معاشرے میں چالباز اور رشوت خور افراد کامیابی کے ساتھ پر تعیش زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس کے برعکس ایماندار شخص کے لیے دو وقت کی روٹی کا انتظام کرنا مشکل ہو جاتا ہے جیسے کلیوں کی پکار میں اسلم معاشی تنگدستی کا شکار ہو جاتا ہے اور وقت سے پہلے بوڑھا نظر آتا ہے۔

جو لوگ صرف دنیاوی آسائشوں اور خواہشات کو ترجیح دیتے ہیں ان میں آخرت کا خوف اور اللہ تعالیٰ کا ڈر نہیں رہتا وہ اپنے ضمیر کو اپنے ہی ہاتھوں مار دیتے ہیں۔ اس کے برعکس متقی اور ایماندار افراد ہر حال میں قناعت اختیار کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل کے سہارے اپنی زندگیاں گزار لیتے ہیں۔ جیسے افسانے میں اسلم ایسے ہی ایماندار طبقے کی نمائندگی کرتا ہے غربت تنگدستی اور سماجی مجبوریوں کے باوجود سود خوری اور رشوت کی طرف راغب نہیں ہوتا۔ "رشوت کے متعلق بھی اس نے مہینوں سوچا مگر جیل کے خوف نے مٹھی گرم نہ ہونے دی۔" ۲۶

صادق حسین نے ہمیں بتایا ہے کہ غربت ایک ہنس مکھ اور چاک و چوبند انسان کے خون کو اس طرح چوس لیتی ہے کہ وہ وقت کے ہاتھوں مجبور غربت کی چکی میں پستا رہتا ہے اور وقت سے پہلے بوڑھا اور نڈھال دکھائی دیتا

ہے۔ "آئینے میں اسے اپنا چہرہ خوفناک طور پر زرد دکھائی دیا۔ کنپٹیوں کے بال بالکل سفید اور سامنے کے کھچڑی، آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے۔" ۲۷

صادق حسین نے یکے بعد دیگر پیدا ہونے والی بچیوں کے والد اسلم کی نفسیات کو موضوع بنایا ہے۔ جو ان کی پیدائش سے نالاں رہتا ہے اور اُن کے مستقبل کے لیے پریشاں رہتا ہے۔ یہی سوچیں اور پریشانیاں اسے پریشاں حال بد مزاج اور چڑچڑا بنا دیتی ہیں۔ اور وہ اپنی بیوی اور بچیوں سے متنفر ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ نئے آنے والے مہمان کے خاتمے کے منصوبے بناتا ہے۔ "اس نے سوچا کیوں نہ بچہ پیدا ہوتے ہی میں اس کا گلا گھونٹ دوں۔" ۲۸ کبھی وہ بچے کو ختم کرنے کے منصوبے بناتا ہے تو کبھی بیوی کو مارنے کی الٹی سیدھی سوچیں اس کے دماغ میں گھر کرنے لگتی ہیں۔ "پھر اس کے دل میں ایک اور خیال نے سر اٹھایا تھا کیوں نہ جمیلہ ہی کا کام تمام کر دوں۔" ۲۹ مگر اچانک سے پدرانہ شفقت غالب آجاتی ہے اور اسے ایسے فعل سے روک لیتی ہے اور یک لخت اس کے رویے مثبت تبدیلی رونما ہوتی ہے اور وہ اپنی بیٹی کی زندگی کے لیے پریشان ہو جاتا ہے۔

"اسلم کا تنفس رُک گیا۔ جیسے اس لمحے سے پہلے اس کا سانس آخری سانس تھا۔ اور دوسرے سانس کا اعتبار جاتا رہا ہو۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے نوازئیدہ بچی کے کولھوں کو تھپتھپایا۔ ننھے ننھے پھیپھڑوں نے حرکت کی۔ سرخ سرخ ہونٹ ہے۔ اور پھر آناً فاناً وہ معصوم جان رو رو کر زندگی کا ثبوت دینے لگی۔ اس نے محسوس کیا کہ جیسے اس میں زندگی عود آئی ہو۔" ۳۰

انسان اپنے لیے بہت سارے مسائل خود اکٹھے کر لیتا ہے۔ اگر انسان چاہے تو ان پریشانیوں سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔ جو مسائل کلیوں کی پکار میں بیان ہوئے۔ اسلم نے بیٹے کی چاہ میں کنبہ بیٹیوں سے بھر لیا۔ اگر وہ صبر شکر کر کے اللہ تعالیٰ کی رضا میں خوش ہو جاتا اور بیٹیوں کی پیدائش پر خفا نہ ہوتا تو شاید تقدیر اس پر مہربان ہو جاتی اور اللہ تعالیٰ اسے اولادِ نرینہ کی دولت سے مالا مال کر دیتا۔

صادق حسین نے حساس موضوع اُٹھا کر انسان کو فطرت کے قوانین کو سمجھنے کی تلقین کی ہے اور اس کے علاوہ انسانی سوچ کے دائرے کو وسعت بخشنے میں بھی کامیاب رہے ہیں۔

افسانہ " دادو" کا حقیقی موضوع دیہاتی زندگی کی پیچیدگیاں اور مسائل ہیں۔ اس افسانے کے ذریعے صادق حسین نے انسانی نفسیات کے مسائل اور باریکیوں کو منظرِ عام پر لایا ہے۔ صادق حسین نفسیاتی پیچیدگیوں کو سمجھنے والے حساس افسانہ نگار ہیں انھوں نے اس افسانے میں دادو کی نفسیات کو بہت باریکی سے پیش کرتے ہوئے ان معاشرتی عوامل کی نشاندہی کی جیسے جو اُسے منفی روپ اختیار کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ وبائی مرض چیچک کی وجہ سے والدین کا انتقال اور بھائی کا ناحق خون یہ تمام وجوہات ہیں جس نے دادو کی شخصیت کو بدل دیا۔

"اس نے اپنے ماں باپ اور انھوں کے چیچک سے مسخ شدہ چہرے دیکھ کر ایک چیخ ماری تھی۔ اور وہ چیخ آج تک اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ بندوق کی گولی سے تو دلی نفرت کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ بندوق بزدل چلایا کرتے ہیں۔ مردانگی کے جوہر لٹھ بازی میں کھلتے ہیں۔ درخت کے آڑ لے کر کسی کو گولی مارنا اول درجے کی بزدلی ہے"۴۱

زمانے کے ستم ظریفیاں اور انتقام کی آگ وہ عوامل ہیں جو اُسے سفاک اعمال کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

صادق حسین نے انسانی نفسیات کی ترجمانی کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ ظالم اور سخت گیر اور پتھر دل انسان بظاہر تو ہمیں سفاک نظر آتے ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے۔ ظاہری سخت گیری کا لبادہ اوڑھ کر وہ اس روپ کو اپنے لیے ڈھال بنا لیتے ہیں اور یہی چیزیں انہیں معاشرتی سطح پر زمانے کی ستم ظریفیوں سے مقابلہ کرنے میں مدد کرتی ہیں۔ دادو کو ناپسندیدگی سے دیکھنے کی وجہ بھی اُس کے اعمال وافعال تھے کیونکہ وہ اپنے علاقے کا مشہور ڈاکو تھا۔

اس افسانے میں صادق حسین نے ایک اور نکتہ بھی اٹھایا ہے وہ یہ کہ دیہاتی لوگ روایات کی پاسداری کو بعض اوقات وہ اپنی انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ جیسے افسانے میں دوسرے گاؤں سے آنے والی بارات کو یہ کہہ کر بیچ راستے میں روک لیا جاتا ہے کہ ہم نے ہمیشہ اپنی روایات پر وقت کو قربان کیا ہے۔اور یہ ان کی روایت کا حصہ ہے کہ وہ باراتیوں کو کھلا پلا کر بھیجیں۔"آپ لوگ رکے بغیر چلے گئے تو ہماری ناک کٹ جائے گی۔" ۴۲

صادق حسین نے اپنے ہر افسانے میں دیہاتی کلچر کو اپنے ہر افسانے میں اچھوتے انداز میں بیان کیا ہے۔ انہوں نے جن موضوعات پر بھی قلم اٹھایا اُن سے صادق حسین کی گہری وابستگی ہے اور وہ خوردبینی نگاہ سے دیہاتی معاشرے کی جزئیات، اکائیوں اور مسائل کو مجموعی طور پر نرالے انداز میں عکس بند کرتے ہیں۔ صادق حسین نے اس افسانے میں دیہاتیوں کی شخصیت، مزاج اور ان کے وضع و اطوار کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ دیہاتی لوگ جہاں خلوص کا پیکر ہوتے ہیں وہاں انا پرست بھی ہوتے ہیں۔ بعض اوقات وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو انا کا مسئلہ بنا کر بڑی بڑی خطائیں سرزد کر جاتے ہیں۔اور قتل جیسے جرم میں ملوث ہو کر نسل در نسل خاندانی دشمنیوں کے بیج بو جاتے ہیں جس پر اگنے والی فصل سدا بہار ہوتی ہے۔ جیسے دادو نمبردار کے بیٹے کو اس لیے قتل کرتا ہے کیونکہ اس نے دادو کے بھائی کا قتل کیا تھا۔"نمبردار کے بانکے صاحبزادے نے درخت کی آڑ لے بندوق کی لبلبی دبائی تھی۔ سنسناتی ہوئی گولی دادو کے بھائی کے سینے کے باہر ہو گئی تھی۔"۴۳ یہی خاندانی دشمنی دادو کو قاتل بنا دیتی ہے۔اس کے علاوہ صادق حسین انسانی رویوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ دیہاتی عورتوں کی عزت کرنا جانتے ہیں اور ان میں عورت کی عزت سانجھی ہوتی ہے۔ اگر کوئی باہر کا انسان اُسے میلی نگاہ سے دیکھے تو یہ اُن کی آنکھیں نکال دینے کا جذبہ بھی رکھتے ہیں اور فوراً حمیّت

کاروائی پر اُتر آتے ہیں۔ جیسے افسانے کا مرکزی کردار "دادو" منفی خصوصیات کا حامل اور بدنام زمانہ ہونے کے باوجود گاؤں کی بیٹی مریم کی عزت کا محافظ بن کر ظاہر ہوتا ہے۔ اور اپنی گاؤں کی لاج رکھ کر جان کی قربانی دے جاتا ہے۔ آخر میں ہر آنکھ دادو کے لیے اشکبار ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ گاؤں عزت کو بچاتے ہوئے جان کا نذرانہ پیش کرتا ہے۔ ''مریم غیر نہیں۔۔۔۔وہ میرے گاؤں کی بیٹی ہے۔'' ۳۴؎

بحیثیت مجموعی دادو افسانہ دیہاتی معاشرت کا عکاس اور مٹی سے وفا کی عمدہ ترین مثال پیش کرنے والا شاہکار افسانہ ہے۔

کسی بھی ادبی تخلیق میں ادیب کے شعور، ارادہ اور انتخاب کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے اندر جہاں موضوع اور فکر کو جگہ ملتی ہے وہیں شعور و فن کو بھی۔ ادیب یا مصنف کی شخصیت کی تعمیر کچھ ایسے عناصر سے ہوتی ہے جو خارج میں اپنا وجود رکھتے ہیں اور افکار و خیالات پر مسلسل ان کا دباؤ پڑتا رہتا ہے۔ اردو کے افسانوی ادب کی تعمیر و ترقی میں دوسرے افسانہ نگاروں کی طرح صادق حسین کا نام بھی خاص طور پر اہمیت کا حامل ہے انہوں نے اپنے افسانوں میں انسان دوستی کا جو نصب العین اور حقیقت پسندی کا جو معیار پیش کیا اسکی نظیر نہیں ملتی۔

افسانہ "خون اور پانی" پاکستان ٹیلی ویژن سے کاسٹ بھی ہو چکا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ افسانہ ایسے رشتوں کی عکاسی کرتا ہے جو خود غرضی اور بے حسی کی انتہا کو چھوتے نظر آتے ہیں۔ جہاں اپنوں کے خون سفید ہوتے نظر آتے ہیں۔ یہی خون کے رشتے جن کے لیے انسان اپنا تن من دھن قربان کرتا ہے لیکن مشکل گھڑی اور حالات میں یہی خونی رشتے منہ موڑ لیتے ہیں۔

"خون اور پانی" کی کہانی بھی ایک ایسے شخص کے گرد گھومتی ہے جو اپنا معاشرتی وقار قائم رکھنے اور بچوں کی بہتر پرورش کے لیے ہر جائز ناجائز کام کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اور نتیجتاً "جھوٹے قتل کے الزام میں جیل چلا جاتا ہے۔ ۱۴ سال بعد جب وہ رہا ہو کر لوٹتا ہے تو باہر کی دنیا بدل چکی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اسکی سگی اولاد اُسے قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔

سماجی بے حسی کے حوالے سے روبینہ کنول لکھتی ہیں۔

"معاشرے کے نام نہاد شریف اور مہذب افراد اپنی عزت اور ناموس کے غلاف کی چمک دمک کو برقرار رکھنے کے لیے حقیقی اور سچے رشتوں سے انکاری ہو جاتے ہیں۔" ۳۵؎

''خون اور پانی'' میں صادق حسین نے اسی تلخ حقیقت کی نشاندہی کی ہے۔ معاشرے کے بے حس افراد اپنے حقیقی رشتوں کو صرف اس وجہ سے نظر انداز کرتے ہیں کہ وہ ان کی عزت و ناموس کو نقصان نہ پہنچا سکیں۔ اور اُن سے واسطہ یا تعلق ان کے معاشرتی مورال اور عزت کو کم کرنے کا باعث نہ بنے۔ لہذا وہ ایسے رشتوں کے وجود سے ہی منکر

ہو جاتے ہیں۔ اور ذاتی مفاد، انا پرستی اور عزت کے تحفظ کی خاطر اپنوں کے جذبات کا قتل کر دیتے ہیں۔ سماجی بے حسی کی اس سے بڑھ کر اور کیا حقیقت ہو گی۔ جیسے افسانے میں امانت میاں رہائی کے بعد جب اپنی بیٹی سے ملنے کے لیے اس کے گھر جاتا ہے تو وہ اسے بتاتی ہے کہ اس نے اپنے خاوند کو یہی بتا رکھا ہے کہ آپ اس دنیا میں نہیں رہے۔ "وہ نہیں جانتے کہ آپ جیل میں تھے۔ انہیں یہی بتایا گیا ہے کہ آپ اس دنیا میں نہیں رہے۔ شبنم رک رک کر بولی۔" یہ سب سنتے ہی امانت میاں لڑکھڑاتے قدموں سے واپس آجاتا ہے۔

صادق حسین نے اس افسانے میں یہ بھی واضح کیا ہے کہ شریف اور مہذب کردار جتنے باطن کے کچے ہوتے ہیں اتنے ہی غیر مہذب اور بد کردار افراد باطن کے سچے اور کھرے ہوتے ہیں۔ جہاں شریف اور مہذب افراد معاشرتی حقائق اور صداقتوں کو ماننے سے انکاری ہوتے ہیں وہیں غیر مہذب اور بد کردار افراد زندگی کے تمام تلخ حقائق کو صدقِ دل سے قبول کرنے کے لیے ہر وقت آمادہ اور تیار ہوتے ہیں۔ جیسے افسانے میں امانت میاں جیل کی سزا بھگتنے کے بعد لوٹتا ہے تو اسکی بیٹی شبنم صرف اس وجہ سے اُسے قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ صرف اس وجہ سے کہ اسکا ہنستا بستا گھر برباد نہ ہو جائے۔ جبکہ اس کے برعکس ظفر جو غلط صحبت کی وجہ سے غنڈہ گردی شروع کر دیتا ہے اپنے باپ کو پہنچاننے میں ایک منٹ نہیں لگاتا اور پرتپاک انداز سے والد کو خوش آمدید کہتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ امانت میاں ظفر کو بیٹا ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔ ذیل میں مکالماتی اقتباس ملاحظہ ہو:

> "میرے ابا: استاد نے چیخ کر کہا اور پھر دوڑ کر امانت میاں سے لپٹ گیا۔
> کون؟ امانت میاں نے روکھے پن سے دریافت کیا۔۔۔۔ میں ہوں ظفر۔۔۔۔ آپکا بیٹا۔
> نہیں استاد تمہیں غلطی ہوئی ہے۔ میں تمھارا باپ نہیں۔۔۔۔۔۔ امانت میاں نے نچلا ہونٹ اوپر کے دانتوں تلے دبا کر کہا۔ اور پھر ظفر کو سامنے سے ہٹا کر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔"۳۶

صادق حسین نے اس افسانے میں دو متضاد کیفیات کو نرالے انداز سے پیش کیا ہے۔ بحوالہ موضوع اگر دیکھا جائے تو صادق حسین کا یہ افسانہ انسانی نفسیات کو سمجھنے اور واضح کرنے کی اچھوتی مثال پیش کرتا ہے۔ اور معاشرتی سطح پر ٹھکرائے ہوئے افراد کی ذہنی و نفسیاتی کش مکش کا عکاس بھی ہے۔

صادق حسین نے اس افسانے میں اہم بات جو بیان کی وہ یہ کہ ماں باپ کی پرورش اور کمائی بچوں کی تربیت پر خاطر خواہ اثرات مرتب کرتی ہے۔ حلال کی کمائی کے اثرات مثبت ہوتے ہیں۔ مذکورہ افسانے میں بھی امانت میاں نے ابتدا ہی سے اپنی اولاد کو حرام کا نوالہ کھلایا ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ بھی یہی نکلتا ہے کہ اس کا سب سے چھوٹا بیٹا غلط لوگوں کی صحبت میں چلا جاتا ہے۔ "ملازمت کے دوران غرض منداُس کی مُٹھی گرم رکھتے۔ وہ جوڑ توڑ کر کے فائل اوپر بھجوا دیتا۔" اس طرح حرام کی کمائی بچوں کی تربیت پر بھی منفی اثرات مرتب کرتی ہے۔ ساری اولاد میں سے کوئی نہ کوئی

ایک بچہ ایسا ہوتا ہے جو اُن کی نیک نامی کا بھرم قائم نہیں رہنے دیتا۔ اور غلط صحبت کا شکار ہو کر والدین کی ذہنی الجھنوں میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ جیسے زیرِ مطالعہ افسانے میں امانت میاں کا بیٹا ظفر غلط صحبت اختیار کرنے کی وجہ سے بدنامِ زمانہ ہو جاتا ہے۔ "انتہائی کوششوں کے باوجود ظفر سیدھی راہ سے ہٹ کر اس پگڈنڈی پر چلنے لگا جو نگمے اور آوارہ لڑکوں کی پٹڑی کی سمت نکل گئی تھی۔ "[۷۳] صادق حسین نے اٹل حقیقت کو اس افسانے میں واضح کیا ہے کہ یہ دنیا گول ہے۔ اور مکافاتِ عمل بھی، انسان جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے۔ امانت میاں نے جو بویا اس کا پھل بھی پالیا۔

مجموعی طور پر یہ افسانہ انسان دوستی اور سماجی فلاح و نفسیات اور معاشرتی رویوں کی نمائندگی بھی کرتا ہے۔

افسانہ "سورج مکھی" اعلیٰ طبقے کے افراد کی نمائندگی کرتا ہے۔ صادق حسین نے اپنے افسانوں میں ہر طرح کے سماج سے تعلق رکھنے والے افراد کے سماجی و نفسیاتی مسائل کو پیش کیا ہے۔

اس افسانے کے ذریعے صادق حسین نے مہذب طبقہ سے تعلق رکھنے والی لڑکی کو موضوع بنا کر سماج میں جنم لینے والی معاشرتی برائیوں اور ان برائیوں کا سبب بننے والے افراد پر کاری ضرب لگائی ہے۔ اسکے علاوہ عورت کی نفسیات کو واضح کرتے ہوئے انہوں نے اعلیٰ طبقے کی طرز بود و باش کو بھی بیان کیا ہے۔

صادق حسین کے موضوعات میں یکسانیت کی بجائے تنوع اور رنگا رنگی ہے چھوٹے چھوٹے انسانی مسائل اور خواہشات کے ساتھ ساتھ انہوں نے بڑے سے بڑے معاشرتی المیے کو اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے۔

افسانہ "سورج مکھی" میں انھوں نے اس حقیقت کو واضح کیا کہ غلط صحبت اور آزاد خیالی انسان کو غلط راہوں پر چلا دیتی ہے اور شریف سے شریف انسان بھی اس دلدل میں پھنستا چلا جاتا ہے۔ انہوں نے اس افسانے کے ذریعے یہ بھی باور کرایا ہے کہ بنیادی طور پر کوئی انسان برا نہیں ہوتا۔ افسانہ خون اور پانی کے ظفر کی طرح ''سورج مکھی'' کی تباہ حالی کا ذمہ دار بھی معاشرہ ہے۔ انسان کا اچھا اور برا بنانے میں ماحول کا خاصا کردار ہوتا ہے۔

لالہ رُخ یعنی "سورج مکھی" کا تعلق بھی ایک مہذب اور کھاتے پیتے تعلیم یافتہ خاندان سے تھا۔ سورج مکھی انتہائی خوبصورت اور شریف لڑکی تھی جو والدین اور خاندانی ملازمہ کے انتقال کے بعد شدید تنہائی کے اندھیروں میں گھر جاتی ہے۔ "ابا کے انتقال کے بعد جب امی اور آیا نے بھی ہمیشہ کے لیے ساتھ چھوڑ دیا تو اس نے کالی چادر اوڑھ کر اپنی وسعتِ ادراک کو گمبھیر تاریکی کے سپرد کر دیا۔ "[۳۸] اس طرح وہ اپنی اس تکان آمیز زندگی سے تنگ آجاتی ہے اور اپنی تنہائی کو دور کرنے کیلئے اپنی سہیلی کے ساتھ کلب کا رخ کرتی ہے اور وہاں کی چکا چوند رنگینیاں اسے اپنی طرف مائل کرتی ہیں نتیجتاً "وہ ایسی دلدل میں پھنس جاتی ہے جس کا اُس سے پہلے اس نے تصور بھی نہیں کیا ہوتا۔ کلب جاتے ہی اسکی زندگی کا تاریک باب شروع ہو جاتا ہے۔ اور وہ اپنی خوشیوں اور خواہشات کے حصول کے لیے مردوں کی ہوس کا

نشانہ بن جاتی ہے۔ سب سے نمایاں پہلو جو اس افسانے میں صادق حسین نے متعارف کروایا وہ یہ کہ تنہا عورت ہمارے معاشرے میں ہمیشہ عدم تحفظ کا شکار رہی ہے۔ اور وہ معاشرے میں تنہا اور پر سکون زندگی بسر نہیں کر سکتی۔ کیونکہ یہ مردوں کا معاشرہ ہے مرد کے بغیر عورت بے سہارا رہ جاتی ہے۔ یا پھر اس کے والدین یا بزرگ ہی چھپر بن کر اُسے سایہ فراہم کرتے ہیں اور دنیاوی تمازتوں سے بچانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں لیکن جب یہ سایہ بھی اٹھ جائے تو تنہا عورت کو معاشرہ نوچنے لگتا ہے۔

اور ایسے میں وہ احساس محرومی اور احساس کمتری کا شکار ہو جاتی ہے۔ سورج مکھی والدین کے انتقال کے بعد بے مایہ ذرہ بن کر رہ گئی تھی جب وہ آفس سے گھر واپس آئی تو احساس تنہائی اُسے ڈسنے لگتا اور وہ عدم تحفظ کا شکار ہو جاتی۔

"دفتر کی وضع دارانہ رواداری میں وقت تیزی سے گزر جاتا۔ لیکن جب وہ لوٹ کر گھر آتی تو در و دیوار کی ویرانی اس کی سوچ کو اپنے شکنجے میں کس کر نڈھال کر دیتی" سہارے اور تحفظ کی متلاشی سورج مکھی کو ظالم سماج اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے اور وہ مردوں کی ہوس کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اسکا دیوانہ اور سچا عاشق آفتاب بھی اُسے ہوس کا نشانہ بنانا چاہتا ہے۔" سورج مکھی آجاو میرے قریب۔ آفتاب نے آہستہ سے کہا اور پھر ساٹن کی رضائی سے ٹانگیں ڈھانپ کر آنکھیں بند کر لیں۔"[۳۹] آفتاب کے اس رویے پر سورج مکھی پیچ و تاب کھا کر رہ جاتی ہے کیونکہ اس نے آفتاب کی اس حرکت کے بارے میں کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوتا کہ وہ بھی اس کے ساتھ ایسا کر سکتا ہے۔" سورج مکھی نے حقارت سے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا۔ اس کے انگ انگ میں چنگاریاں دوڑنے لگیں۔"[۴۰] یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ تنہا عورت کا اس معاشرے میں کوئی ساتھ نہیں دیتا۔ یہی ہمارا معاشرتی المیہ ہے کہ سچے اور تحفظ فراہم کرنے والے افراد تو کم ہیں لیکن اس کے برعکس دوسروں کی مجبوریوں کو خریدنے والے افراد کی اس معاشرے میں زیادتی ہے۔

سورج مکھی پر یکے بعد دیگرے تجربات کے بعد جب حقیقت منکشف ہوتی ہے تو وہ مرد ذات کے لیے دل ہی دل میں شدید نفرت محسوس کرتی ہے اور انتقامی کاروائی پر اتر کر آفتاب کا قتل کر دیتی ہے۔

> "اس کا دماغ کھول اُٹھا، کنپٹیاں پھڑکنے لگیں۔ رخسار تپ گئے، رگ رگ سلگ اٹھی۔ وہ مجسم شعلہ بن گئی۔ وہ شعلہ جوہر جولیس کے نقش و نگار کو جلا کر راکھ کرتا ہوا میز کی طرف لپکا۔ اُس نے بغیر سوچے سمجھے جیب میں سے چاقو نکال کر دائیں ہاتھ کی گرفت میں لے لیا اور بجلی کی طرح کوند کر اس نے آبدار پھل آفتاب کے سینے میں گھونپ دیا۔"[۴۱]

صادق حسین نے اس افسانے میں عورت کی نفسیات کو موضوع بنا کر جہاں عورت کی نفسیات سے آگاہی دلائی ہے وہاں مردوں کی نفسیات سے بھی روشناس کروایا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ خواتین کو اپنے دفاع کے حوالے سے احتیاط برتنے کا بھی درس دیا ہے۔ صادق حسین نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ انسان کی بنیادی ضروریات میں محبت بھی لازمی درجہ رکھتی ہے۔ اور مکمل اور کامیاب زندگی گزارنے کے لیے عورت کو مرد کا تحفظ اور محبت دونوں درکار ہوتی ہیں۔

مختصراً یہ افسانہ اعلیٰ اور آزاد خیال طبقے کی نمائندگی کرتے ہوئے اُن کے اوضاع واطوار اور زندگی کے مشاغل سے آگاہی دلاتا ہے۔ کلبوں میں مردوں کے ساتھ ناچنا، بیر پینا اُس معاشرے میں معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن یہی آزاد خیالی، گمراہی اور سماجی برائیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ وقت گزر جانے کے بعد انسان اپنے اعمال پر پچھتاتا ہے اور نفسیاتی مریض بن جاتا ہے۔ صرف معاشرتی اعتدال پسندی اور میانہ روی میں ہی انسان کی کامیابی کا راز مضمر ہے۔

"دو چھٹانک چاول" طبقاتی تقسیم کا عمدہ ترین عکاس اور شاہکار افسانہ ہے جس کا موضوع غربت اور مفلسی کے ہاتھوں انسانیت کی تذلیل ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے بنگال کے کلچر کو سامنے لاتے ہوئے غریب اور مفلوک الحال لوگوں کی بے بسی کو موضوع بنایا ہے۔ بھوک کا دیوا اس قدر ظالم ہوتا ہے۔ جسے مٹانے کے لیے انسان کو بعض اوقات اپنی عزت وناموس کو بھی داؤ پر لگانا پڑ جاتا ہے۔ حالات کا ستایا ہوا انسان بھوک کے شکنجے سے نکلنے کے لیے اپنی عزتِ نفس اور خودداری کو بیچ دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

صادق حسین نے غربت اور بے چارگی کے عنوان پر بہت سارے افسانے لکھے لیکن موضوع کی نزاکت اور سنجیدگی کے حوالے سے اُن کا یہ افسانہ شاہکار افسانہ ہے۔ صادق حسین کی تحریروں میں مصالحت اور بے رحم حقیقت کی آویزش ملتی ہے۔ اس افسانے میں انہوں نے ایسے ماحول کو سامنے لایا جہاں انسانیت کی غربت وافلاس کے ہاتھوں شکست وریخت دیکھ کر انسانی آنکھ اشکبار اور نوحہ کناں ہوتی نظر آتی ہے۔ نچلے طبقے کے افراد اور اُن کا ماحول صادق حسین کی خصوصی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ "دو چھٹانک چاول" کے حوالے سے روبینہ کنول لکھتی ہیں:

> "یہ افسانہ شروع سے آخر تک ایک گھمبیر اور المناک فضا میں ڈوبا ہوا ہے۔ جسے پڑھتے ہوئے انسان شدید کرب اور دکھ کا شاہکار ہو جاتا ہے۔ پورے افسانے کے پس منظر اور تناظر کو سامنے رکھ کر اس کا مفہوم تلاش کیا جائے تو یہ ہماری طبقاتی اونچ نیچ اور معاشرتی ناہمواریوں پر گہرا طنز ہے۔ اس کی تہوں میں جھانکا جائے تو یہ مرتی ہوئی انسانیت اور ہماری اخلاقی بے حسی پر نوحے سے کم نہیں۔ [۲۴]

موضوع کے اعتبار سے یہ افسانہ طبقاتی فرق وامتیازات کی واضح جھلک دکھاتا ہے۔ جہاں امیر اور طاقتور طبقہ مجبور اور مفلوک الحال طبقے کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر ان کا سماجی ومعاشی استحصال کرتا دکھائی دیتا ہے۔

صادق حسین نے اس افسانے کو تحریر کر کے ادیب ہونے کے فرائض انجام دیے انہوں نے معاشرتی مسائل کو خاص کر ان معاشرتی مسائل کو اپنا موضوع قلم بنایا جن پہلوؤں پر بہت کم لوگوں نے توجہ دی۔

بنگال کے قحط زدہ علاقے اور جھونپڑیوں میں رہنے والے افراد اور اُن کے کلچر کو موضوع بنا کر انھوں نے سماجی ناانصافی اور بے حسی کی عمدہ مثال پیش کی ہے۔ پوری کہانی مانگو اور اسکی بیٹی راجو کے گرد گھومتی ہے جو قحط سالی کے باعث دو وقت کی روٹی کیلئے ترستی اور بلکتی نظر آتی ہیں۔ اور پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے ہر حربہ اپناتی ہیں۔

" بوڑھی مانگو تھوڑے سے چاولوں کے حصول کے لئے دربدر کی ٹھوکریں کھاتی ہے، کبھی اسٹیشن ماسٹر کے پاس جاتی ہے تو کبھی منصف کے پاس، لیکن ہر بار اسے شکست سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔"۴۳؎

صادق حسین نے افسانے کے ذریعے یہ بھی واضح کیا ہے کہ دنیا کی رونق اور زندگی کی سچی خوشیاں تبھی میسر آتی ہیں جب انسان کا اندر مطمئن ہو اور اس کے ساتھ اسکی بنیادی ضروریات کی تکمیل اچھے طریقے سے ہوتی رہے تو دنیاوی معاملات پر انسان توجہ دے سکتا ہے لیکن جس انسان کے لیے دو وقت کی روٹی کا حصول ہی عذابِ جاں بن جائے تو اسکی ساری سوچیں مقید ہو جاتی ہیں اور اسکا ذہن بوڑھی مانگو کی طرح دنیا کی ہر شے سے مٹ کر چاول مہیا کرنے کے خیال پر مرکوز ہو جاتا ہے۔ ذیل میں اقتباس ملاحظہ ہو:

"چھوٹا موٹا گہنا بیچ کر چاول خریدا جاسکتا تھا۔ اور وہ اس کے پاس نہ تھا۔ وہ بھیک مانگ سکتی تھی مگر آج تو کوئی بھیک نہ دے گا۔ وہ جانتی تھی طغیانی کی وجہ سے چاول کا بھاؤ تیز ہو جائے گا۔"۴۴؎

صادق حسین نے افسانے کے ابتدائی حصے میں انسانی خودداری کو عمدہ انداز میں پیش کیا اور ہمیں سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ انسان کا تعلق چاہے جس بھی طبقے سے ہو عزت اور خودداری اسکی متاعِ حیات ہوتی ہے جسے انسان کسی بھی قیمت پر ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ جیسے بوڑھی مانگو غریب اور کمزور جان ہونے کے باوجود اپنی بیٹی کی عزت کی حفاظت کرنا جانتی ہے اور بھوکے بے حس بھیڑیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتی ہے۔ کمزور نظر ہونے کے باوجود وہ معاشرتی اونچ نیچ کو بخوبی سمجھ سکتی ہے۔" اس نے ہر بار چاندی کے کالے دل پر تھوک دیا۔ ہر مرتبہ بوڑھی مانگو کا سونٹا اس تیزی سے بلند ہوا کہ نئے دیوتا کو سر پر پیر رکھ کر بھاگنا پڑا۔"۴۵؎

صادق حسین نے اس افسانے میں خانگی زندگی کے مسائل کو بھی سامنے لایا۔ مانگو کا خاوند جب تک زندہ تھا وہ روکھی سوکھی کھا کر بھی خوش رہتی تھی لیکن تمام مسائل جن میں بھوک، غربت اور عدم تحفظ شامل ہیں ان سب نے اس کے خاوند کے انتقال کے بعد سر اٹھایا۔ بوڑھی مانگو بھوک کے ہاتھوں شکست کھانے پر مجبور ہو جاتی ہے اور اپنی انا اور خودداری تک کو بیچ ڈالتی ہے اگر اسکا خاوند زندہ ہوتا تو راجو کی ذات کی پامالی کبھی نہ ہوتی۔ یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ جس کنبے کا سربراہ باقی نہ رہے وہ گھرانہ زمانے کی سفاکیوں کی نذر ہو جاتا ہے۔

"بوڑھی مانگو کی روح سمٹ کر اس کی آنکھوں میں آگئی اور پھر وہ بھوک سے دیکھنے لگی۔ بھوک سے سوچنے لگی۔ بھوک سے محسوس کرنے لگی۔ اس کا چاہا کہ وہ ہنڈیا پر جھپٹ پڑے۔ اس میں بھوک کا عقاب پر تولنے لگا۔"٦٢

پورا افسانہ معاشرتی پیچیدگیوں کی عمدہ مثال پیش کرتا ہے۔

''خون کی پگڈنڈی" موضوع کے لحاظ سے دیہاتی متوسط طبقے کا عکاس ہے۔ یہ افسانہ دیہاتی سماج کے پس منظر میں خاندانی رقابت اور انتقام کی آگ کو ظاہر کرتا ہے جو دیہاتی کلچر میں بہت زیادہ رواج پا چکی ہے۔ خاندانی دشمنی سلسلہ در سلسلہ اور نسل در نسل دیہاتیوں میں چلتی ہے اور پروان چڑھتی ہے۔ چاہے اس خاندانی دشمنی اور انتقام کے بدلے پورے کا پورا خاندان ہی کیوں نہ تباہ ہو جائے۔ صادق حسین نے یہی بات منظر عام پر لائی ہے کہ دیہاتی لوگ بہت زیادہ انا پرست ہوتے ہیں ان کے سینوں میں سلگنے والی انتقام کی آگ بہت ظالم ہوتی ہے اور وہ اپنی اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اور اپنی انا کی تسکین کی خاطر چھوٹی چھوٹی باتوں کو انا کی بھینٹ چڑھا کر خاندانوں کے خاندان تباہ کر دیتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے مسائل کے پیچھے نہ ختم ہونے والے خونی مستقبل کی بنیاد ڈال جاتے ہیں۔ دیہاتیوں کے سینوں میں سلگنے والی یہی آگ انتقام کارروائی تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ دیہاتیوں کے انتقامی رویوں کے حوالے سے اس افسانے اقتباس ملاحظہ ہو۔

"یہ گاؤں میں آئے دن ہی ہوتا رہتا تھا۔ ایک خون دوسرے خون کی وجہ بن جاتا تھا اور دوسرا خون تیسرے خون کی۔ اس طرح انتقام کا یہ سلسلہ پشت در پشت چلتا رہتا تھا۔ اسی قبیل کی خوفناک کڑیوں نے سجاول اور فضلو کے خاندان کو بھی جکڑ رکھا تھا۔ دو سال پہلے فضلو کے بڑے بھائی کو سجاول کے منجھلے بھائی کریم نے قتل کیا تھا۔ اس لیے کہ فضلو کے بڑے بھائی نے چار برس پہلے کھیت میں سجاول کے بڑے بھائی کی بوٹی بوٹی کر کے رکھ دی تھی۔"٧٢

اس افسانے میں جہاں انھوں نے انتقامی آگ کو موضوع بنا کر خاندانی دشمنوں کے سلسلے کو واضح کیا وہاں انہوں نے محبت کے آگے اس انتقامی آگ کو شکست سے دوچار ہوتے بھی دکھایا ہے۔ وہی سجاول جو انتقامی آگ میں سلگتا ہوا فضلو کے بھائی نیازو کے جوان ہونے کا انتظار کرتا ہے کہ کب وہ جوان ہو اور وہ اپنی انتقام کی آگ کو نیازو کے قتل سے ٹھنڈا کر سکے اُسی سجاول پر جب یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ اُسکی گونگی بیٹی نیازو سے محبت کرتی ہے تو اسے اپنا ماضی یاد آجاتا ہے اور ایک دم سے ہی اسکا انتقامی جذبہ ماند پڑ جاتا ہے اور اُسے بے جان کر دیتا ہے اور محبت جیسے لطیف جذبے کے ہاتھوں مغلوب ہو کر شکست تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

" یکایک سجاول کے ہاتھ کانپنے لگے۔ نجانے کیوں یکدم اس کا گلا بھر آیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے دو بڑے قطرے چمکے اس نے چھوی کو زور سے پرے پھینک دیا اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چاندنی سے نکل کر درختوں کے طویل سائے میں گم ہو گیا۔"٨٢

اس افسانے میں صادق حسین نے محبت اور انتقام جیسی دو متضاد کیفیات کو بیان کیا ہے اس کے علاوہ انھوں نے دیہاتیوں کے طرزِ زندگی کو واضح کرتے ہوئے چند حساس پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے جیسے بیٹیاں جب جوان ہونے لگتی ہیں تو والدین کی فکروں اور پریشانیوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ جیسے اس افسانے میں سجاول کی بیٹی گلشن میٹھا سال جب پار کر لیتی ہے تو والدین اس پر پابندیاں لگاتے ہیں اور اُسے گھر میں رہنے کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں۔

صادق حسین نے اس افسانے کے توسط سے یہ واضح کیا کہ دنیا مکافاتِ عمل ہے اور انسان کو اپنے کئے کی سزا مل کر رہتی ہے۔انسان بعض اوقات اس قدر بے حس ہو جاتا ہے کہ وہ بے زبان مخلوق پرندوں اور جانوروں پر ظلم ڈھانا شروع کرتا ہے اور وقتی طور پر لذت اور ذاتی انا کی تسکین حاصل کرنے میں کامیاب تو ہو جاتا ہے لیکن یہ بات بھول جاتا ہے کہ قدرت جب انتقام لینے پر آتی ہے تو اس کے سامنے کسی کا زور نہیں چلتا۔اور قانونِ قدرت کے آگے ناقص العقل انسان کی تمام اکڑفوں ختم ہو جاتی ہے۔اور ظالم سے ظالم انسان قدرت کے انتقام کے آگے بے بس اور مجبور ہو جاتا ہے۔اور اُسے اپنے کئے کی سزا مل کر رہتی ہے۔ جیسے سجاول کی بیوی جب امید سے تھی تو وہ اُس کے سامنے ایک فاختہ کو زخمی کر دیا تھا اور قدرت اس معصوم زخمی پرندے کا انتقام اسکی بیٹی گلشن سے لیتی ہے جو پیدائشی طور پر گونگی تھی۔" گاوں کی بڑی بوڑھیوں کے لیے یہ اچنبھے کی بات تھی۔اس علاقہ میں دو چار اور بھی پیدائشی گونگے تھے جو ساتھ ہی بہرے بھی تھے مگر گلشن صرف گونگی تھی۔"سجاول اپنی گونگی بیٹی کی پیدائش کے بعد اس سرمئی فاختہ کو نہ بھلا سکا جسے اس نے زخمی کیا تھا اور اس کے گلے میں کنٹھا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اپنے اس فعل کو یاد کر کے پچھتاتا ہے۔" اس کی آنکھوں کے سامنے وہی سرمئی فاختہ گھوم رہی تھی جس کے گلے میں کنٹھا تھا جس کا برسوں پہلے اس نے خون کیا تھا۔"۴۹ اپنی گونگی بیٹی کو دیکھ کر وہ اکثر مضطرب ہو جاتا اس کا دل چاہتا تھا کہ اس کی پیاری اور اکلوتی بیٹی اس سے ہم کلام ہو لیکن قدرت کے فیصلوں کے آگے کسی کی پیش نہیں جاتی۔اور یوں بیٹی کے بولنے کی خواہش اس کے دل میں حسرت بن جاتی ہے۔ جب بھی وہ اپنی گونگی بیٹی کے بارے میں سوچتا تو اداس ہو جاتا اور اسے دنیا کی ہر چیز ہی بے رونق لگتی۔"جب گرمیوں کی رات میں اس کی آنکھ کھل جاتی تو چارپائی پر لیٹے لیٹے تاروں بھرے آسمان کی طرف دیکھتا تو اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے چاند تارے بھی گونگے ہیں۔"۵۰

صادق حسین نے دیہاتیوں کے رویوں کا ذکر کرتے ہوئے اُن کی روایات اور اعتقادات کے ساتھ ساتھ توہمات کو بھی سامنے لایا۔اور انہیں اپنے افسانوی موضوعات میں بڑے سلیقے سے جگہ دی۔انھوں نے اس افسانے میں بتایا ہے کہ دیہاتیوں میں یہ رویہ بہت عام ہے کہ وہ توہمات پر یقین رکھتے ہیں۔ مثلاً سفر کے لیے گھر سے نکلو اور کالی بلی رستہ کاٹے یا گھر سے نکلتے وقت کوئی پیچھے سے آپ کو آواز لگائے تو اُسے بدشگونی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

"پاؤں کی چاپ سن کر بلی منڈیر سے کود کر گلی میں چلی گی، زیناں کا کلیجہ دھک سے رہ گیا ایسے وقت کالی بلی کا نظر آنا بدشگونی تھی۔ صبح سے اس کی بائیں آنکھ بھی کئی بار پھڑکی تھی" ۵۱

صادق حسین نے انسانی رویوں میں اچانک تبدیلی کے حوالے سے بتایا ہے کہ بعض اوقات انسان چاہا کر بھی بہت سارے کام کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ کوئی نہ کوئی بڑی مجبوری اُسکی راہ میں حائل ہو کر بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے اور وہ بے بس ہو کر اپنے ہی فیصلوں کو بدلنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جیسے افسانے کے آخر میں سجاول جیسا پتھر دل انسان پدرانہ شفقت کے آگے شکست کھا کر اپنے ہی دشمن کو معاف کردینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

مجموعی طور پر یہ افسانہ دیہاتی سماج کے ساتھ انتقامی آگ پر پدرانہ محبت کے غلبے کی بہترین اور اچھوتی مثال پیش کرتا ہے جو صادق حسین کے گہرے سماجی شعور کی نمائندگی کرتا ہے۔

"اینٹ کی بیگم "صادق حسین کے پہلے افسانوی مجموعے ''پھولوں کے محل'' کا گیارہواں افسانہ ہے۔ موضوع کے حوالے سے یہ علامتی افسانہ ہے جس میں عورت کے لیے لفظ ''اینٹ کی بیگم'' استعمال کیا گیا ہے۔ یہ افسانہ عورتوں کے بارے مردوں کے نظریات واحساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔ پورے افسانے کا مرکز و محور "اینٹ کی بیگم "یعنی عورت ذات ہے ۔اس افسانے میں چار مسافر عورت کے حوالے سے اپنی اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ ہر فرد عورت کے حوالے سے الگ نکتہِ نظر رکھتا ہے۔

مردوں کے نزدیک عورت کٹھ پتلی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ مرد عورت کی خواہشات اور احساسات کا خیال نہیں کر سکتا اور جو مرد عورت کی نفسیات اور حساسیت کو سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں اُن کی زندگی مشکلات میں گھر جاتی ہے

خواتین کی نفسیات کی اگر بات کی جائے تو خواتین بہت زیادہ حساس ہوتی ہیں اگر خاوند ان کی خواہشات کا احترام کرلے تو اُن کی ازدواجی زندگی کامیاب گزرتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس اگر مرد عورت پر زبردستی اپنی مرضی ٹھونسے تو نتیجتاً عورت نفسیاتی مریض بن جاتی ہے اور ہیلن کی طرح حالات کا مقابلہ کرنے سے بے بس اور مجبور نظر آتی ہے اور خودکشی کرنے پر مجبور کردی جاتی ہے۔ افسانے میں انجینئر اپنی بیوی ہیلن کو اپنی مرضی کے تابع کرنا چاہتا ہے لیکن ہیلن آزاد خیال ہوتی ہے وہ چاہتی ہے کہ اس کا خاوند اس کی خواہش کا احترام کرے لیکن لاکھ کوششوں کے باوجود جب اسکا شریکِ سفر اس کی نفسیات کو نہیں سمجھتا اور نہ اس کی خواہش کا احترام کرتا ہے تو مجبوراً وہ زندگی سے چھٹکارا پانے کی غرض سے زہر کھا کر خودکشی کرلیتی ہے۔ "شام کو واپس آکر دیکھا کہ ہیلن نے اپنی بچی کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا اور خود پوٹاشیم سائنائڈ چکھ کر ٹھنڈی ہو گئی۔" ۵۲ صادق حسین کے نزدیک ازدواجی زندگی سمجھوتوں کا نام ہے۔

افسانے کے مجموعی تاثر سے جو بات سامنے آتی ہے۔ وہ یہی ہے کہ عورت کا کردار مرد کی زندگی میں بہت اہمیت کا حامل ہے اور اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ وجودِ زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ۔ یعنی عورت کے بغیر مرد کی زندگی بے رنگ اور بے معنی ہو جاتی ہے۔ اُسے قدم قدم پر عورت کے سہارے کی ضرورت رہتی ہے لیکن انا پرستی اُس کے جذبات کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ اور وہ اُسی انا پرستی سے مجبور ہو کر عورت کی نفسیات کو سمجھ کر بھی نا سمجھی کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے۔ اور اس کے جذبات کی قدر نہیں کرتا۔

یہ افسانہ مہذب طبقے کی نفسیات کی ترجمانی کرتا ہے اور افسانے کی تمام کہانی ریل کے سفر تک محدود ہے۔ جس میں صادق حسین نے نہ صرف مردوں بلکہ عورتوں کی نفسیات کے ساتھ ساتھ کامیاب ازدواجی زندگی گزارنے کے اصولوں کو بھی بیان کیا ہے۔

صادق حسین کے افسانوں میں تنوع اور رنگا رنگی نظر آتی ہے۔ اُن کے افسانوں میں عام آدمی کے مسائل کا تذکرہ ملتا ہے۔ اُن کے افسانوں میں بڑی یکسوئی اور دردمندی سے عام آدمی کے مسائل اور خواہشات کا احاطہ کیا گیا ہے جو پوری ہونے سے پہلے دم توڑ جاتی ہیں۔ اور انسان غربت اور تنگدستی کے باعث اپنے ہی ہاتھوں اپنی خواہشات کا گلا گھونٹ دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس حوالے سے صادق حسین نہ صرف انسان دوست اور حساس دل رکھنے والے دردمند افسانہ نگار کی صورت میں ابھر کر سامنے آئے بلکہ معاشرے کے بہترین نبض شناس بھی ہیں۔

افسانہ ''اترن" ایک ایسے نچلے متوسط طبقے کی نمائندگی کرتا ہے جہاں انسان کی نہ پوری ہونے والی چھوٹی چھوٹی خواہشات حسرت کا روپ اختیار کر لیتی ہیں۔ اور ان حسرتوں تک کے سفر میں انا اور خودداری مجبوری اور رکاوٹ کی صورت میں کھڑی ہو جاتی ہے۔

غریب اور متوسط طبقے کے افراد انا پرست اور خوددار ہوتے ہیں۔ زمانے اور حالات کے ہاتھوں چاہے ہو کتنے ہی مجبور کیوں نہ ہوں وہ خودداری کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اُن کی غیرت یہ بات گوارہ نہیں کرتی کہ وہ دوسروں کے سامنے اپنی چھوٹی چھوٹی مجبوریوں اور ضروریات کے لیے دستِ سوال دراز کرتے پھریں۔ یہی وجہ ہے کہ افسانہ اترن میں رانجھے کی بیوی کشور لنڈے کے کوٹ پہننے کی بجائے سردی سے ٹھٹھرنے کو ترجیح دیتی ہے۔ اس کی غیرت یہ گورا نہیں کرتی کہ وہ ایک مری ہوئی انگریز میم کا اترن پہن لے۔" اُس نے کسی مردہ میم کے جسم سے اُتارا ہوا کوٹ پہن رکھا ہے۔ یہ تصور ایک بگولہ بن کر لوہے کے کٹہرے پر ناچنے لگا۔"۵۳ کشور لنڈے کو کوٹ اتار کر رانجھے کے شانے پر رکھ دیتی ہے اور خود سردی سے ٹھٹھرتی ہوئی گھر کے راستے کو ہو لیتی ہے۔

صادق حسین نے اس افسانے میں معاشرتی زندگی کی اونچ نیچ کو بہت گہرائی اور وسیع النظری کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔اور یہ بھی واضح کیا ہے کہ انسان کی زندگی میں ایک سا وقت نہیں رہتا حالات میں اتار چڑھاؤ اور نشیب وفراز آتے رہتے ہیں۔انسان کو ہر حال میں صبر واستقامت کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ جیسے رانجھا اپنے ماضی کو بھلا کر حال میں خود کو مست ومگن رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔" رانجھے کا خیال تھا کہ اس کا نیا نام رومان پرور ہے کیونکہ آج کل کی تیز رفتار دنیامیں ذہنی طور پر اپنے آپ کو رانجھا محسوس کرنااور ماضی کو بھول جانا غنیمت ہے۔"۵۴

صادق حسین نے یہ بھی واضح کیا کہ زندگی زندہ دلی کا نام ہے۔انسان اگر وقت اور حالات کے ہاتھوں شکست تسلیم کر لے تو وہ معاشرے کامیاب زندگی نہیں گزار سکتا۔لیکن اس کے برعکس اگر وقت اور حالات کا مقابلہ ڈٹ کر کر لے اور معاشرتی اونچ نیچ اور حالات کے ردوبدل اور تغیرات کو خود پر طاری نہ کرے تو خوشگوار اور مطمئن زندگی بسر کر سکتا ہے۔حالات چاہئے کیسے ہوں وہ روکھی سوکھی پر صبر وقناعت کر لیتا ہے۔اس افسانے کے ذریعے صادق حسین نے ایک اہم نکتہ بھی معاشرتی زندگی کے حوالے سے اٹھایا کہ میاں بیوی زندگی کے ساتھی ہوتے ہیں وہ بظاہر ایک دوسرے سے لاپرواہی برتیں مگر ایک دوسرے کے احساسات وجذبات سے بخوبی آشنا ہوتے ہیں۔اور کامیاب ازدواجی زندگی کا راز اسی بات میں پوشیدہ ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے جذبات کو سمجھنے والے ہوں۔ذیل میں اس حوالے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

"کشور کھلی فضا اور تازہ ہوا کو اتنا ہی پسند کرتی تھی جتنا رانجھا اس کے جذبات کا احترام کرتا۔وہ اپنی بیوی کی خاموش گفتگو کو سمجھتا تھا۔اسکی مسکراہٹ کو وہ پہچانتا تھا۔اس کے ابرو کے ہر خم کی ترجمانی کر سکتا تھا۔قربت اس مقام پر پہنچ چکی تھی کہ کشور کے ہونٹ ہلنے سے پہلے وہ اس کے دل ہر بات کہہ دیتا تھا۔"۵۵

صادق حسین نے افسانے کے اختتامی حصے میں بھینس اور کٹڑے کا ذکر کر کے ہم پر یہ واضح کیا کہ جانور بھی اترن سے نفرت کرتے ہیں۔اصلی اور نقلی کی انھیں بھی شناخت ہوتی ہے۔جب بھینس کا کٹڑا مر جاتا ہے تو اس کا مالک کٹڑے کی کھال کے اندر بھوسہ بھر کر بھینس کے سامنے لاکر رکھتے ہیں تو بھینس اسے تسلیم نہیں کرتی اور سینگوں سے اٹھا کر پرے پھینک دیتی ہے۔"بجلی کی سی تیزی کے ساتھ بھینس نے اپنی گردن آگے بڑھائی اور پھر کٹڑے کی اترن کو سینگ پر اُٹھا کر پرے پھینک دیا۔"۵۶ مجموعی طور پر یہ افسانہ صادق حسین کی معاشرتی نبض شناسی اور سماجی شعور کی عمدہ مثال پیش کرتا ہے۔

افسانہ "کچنار" کا موضوع ایک بیوہ عورت اور اُس کے سماجی وگھریلو مسائل ہیں۔اس کے علاوہ انھوں نے اس افسانے میں بیوہ عورت کے نفسیائی مسائل کو بھی واضح کیا ہے۔ہمارے معاشرے میں بیوہ عورت کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔بیوہ عورت روایات کی پاسداری کے ہاتھوں مجبور اپنی جوانی رنڈاپے میں گزار دینے پر مجبور کر دی

جاتی ہے۔ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ عورت کا نفسیاتی اور سماجی استحصال ہے۔افسانے کے ابتدائی حصے میں صادق حسین نے عورت کی نفسیات کے حوالے سے جو بات واضح کی ہے وہ مردوں کے حوالے سے عورت کی حساسیت ہے۔ عورت جیسی بھی ہو وہ اپنے مرد کے حوالے سے حساس ہوتی ہے۔اور اپنے مرد یعنی خاوند کی شراکت ناپسند کرتی ہے۔ جیسے افسانے کا مرکزی کردار بلقیس اپنے میاں کی محبت اور توجہ حاصل ہونے کے باوجود اُسکے دوسری عورتوں سے بات چیت کرنے کو سخت ناپسند کرتی ہے اور شکوک وشبہات کا شکار ہو جاتی ہے۔ بلقیس کی حساسیت اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ اپنے خاوند کے دوستوں کو لٹیرا سمجھنا شروع کر دیتی ہے۔ کیونکہ کمال کا وہ وقت جو وہ دوستوں کے ساتھ گزارتا ہے بلقیس اُسے صرف اپنا حق سمجھتی ہے۔ "یہاں تک کہ جب کبھی کمال اپنی ماں سے راز دارانہ انداز میں گفتگو کرتا تو بھی بلقیس کو سخت کوفت ہوتی"۵۷ صادق حسین نے اس افسانے میں سماجی پہلوؤں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ عورت چاہے کتنی ہی خود مختار مضبوط اور باکردار کیوں نہ ہو مرد کے سہارے کے بغیر اس کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ تنہا بیوہ عورت کبھی سماج کے ہاتھوں جائیداد، دولت اور وراثت کی وجہ سے ذلیل ہوتی ہے تو کبھی نفس کے ہاتھوں مجبور جو اسے شیطانی وسوسوں میں مبتلا کر کے اُسے کھوکھلا اور کم ہمت بنا دیتا ہے کہ عورت کے قدم ڈگمگانے لگتے ہیں۔ جیسے افسانے میں بلقیس اپنی جوانی کے ہاتھوں مجبور ہوتی ہے اور قدم قدم پر اس کے جذبات اسے جنجھوڑتے ہیں۔ جب اس کی چھوٹی بہن ثریا اور اس کا خاوند اس کے گھر رہنے کے لیے آتے ہیں تو اس وقت بھی بلقیس کے دل کی حالت عجیب ہو جاتی ہے۔ اسے اپنا ماضی یاد آنے لگتا ہے۔اور اپنے ہی جذبات کی شدت اسے بے بس کر دیتے ہیں۔"بلقیس قدم قدم چلتی ہوئی اس کمرے میں داخل ہوئی جس میں گزشتہ شب ثریا اور اس کا خاوند سوئے تھے۔ وہ پلنگ پر بیٹھ گئی۔"وہ سنگار میز کی طرف غور سے دیکھتی ہے تو عجیب کیفیت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ "اس کے چہرے کا عکس اُس سے بہکی بہکی باتیں کرنے لگا۔" ۵۸ بلقیس وہاں سے فوراً اُٹھ جاتی ہے اور اپنا دھیان بٹانے کی غرض سے کچن کا رخ کرتی ہے۔ کیونکہ اس وقت اسے اپنے جذبات کی شدت پر کنٹرول نہیں ہوتا۔"جسم کے ترشے ہوئے بالائی حصے کا گرم گرم عکس خود بلقیس کو سینک دینے لگا۔"۵۹ اس طرح افسانے میں بار ہا مقامات پر بلقیس کے اس طرح کے احساسات کو صادق حسین نے بیان کر کے تنہا، جوان بیوہ عورت کی نفسیات کو بیان کیا ہے مثلاً افسانے میں جب بلقیس ڈاکٹر کے پاس معائنے کی غرض سے جاتی ہے تو جب ڈاکٹر اس کی آنکھوں کے معائنے کی غرض سے اس کے قریب آتا ہے تو بلقیس کے جذبات ہلچل مچا دیتے ہیں اور یکدم وہ اس صورتحال سے پریشان ہو جاتی ہے۔"لمحات چنگاریاں بن کر اندھیرے میں بکھرنے لگے ۔ بوٹی بوٹی میں کچنار کے پھولوں کا رس بجلی بن کر دوڑنے

لگا۔"٦٠؎ الغرض اس طرح کی نفسیاتی کیفیات کا تذکرہ کر کے صادق حسین نے تنہا عورت کے مسائل اور نفسیات کی تصویر کشی بہت عمدہ انداز میں کی ہے۔

صادق حسین نے اس معاشرتی المیے کو بھی سامنے لایا ہے کہ ہمارے معاشرے میں تنہا عورت کی عزت محفوظ نہیں رہ سکتی شرافت کا لبادہ اوڑھ کر گھناؤنے کام کرنے والوں کی حقیقت کو بھی صادق حسین نے بے نقاب کیا ہے جو مجبور ،لاوارث اور بیوہ عورتوں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں تنہا عورت کا کوئی مقام نہیں۔ اس افسانے میں صادق حسین کا سماجی شعور اور باریک ہو جاتا ہے جب وہ معاشرتی باریکیوں اور نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والی خواتین کے رویوں اور عادات سے پردہ اٹھاتے ہیں۔

راجو ایک کم ذات عورت ہے جو ہمدردی کا لبادہ اوڑھ کر بلقیس کو غلط مشورے دے کر اُسے اکرم کے پاس جانے کے لیے اکساتی ہے اور بعد میں وہی اُسکی عزت پر بٹا لگانے میں کسر نہیں چھوڑتی اور محلے بھر میں بلقیس کے حوالے سے جھوٹی افواہیں پھیلا کر اسے بدقماش ظاہر کرتی ہے۔

> "تیسرے دن خبر ملی کہ راجو گلی چھوڑ کر دوسرے محلے میں چلی گئی۔ جاتے جاتے وہ ایک شوشہ چھوڑ گئی۔ جسکی بھنک بلقیس کے کان میں پڑی تو دل پاش پاش ہوگیا۔ محلے کی عورتیں انگلیاں نچانچا کر باتیں کرنے لگیں۔ کمال کو مرے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں۔ اللہ کی پناہ یہ بلقیس دیدے مٹکاتی میاں اکرم کے ہاں جا پہنچی اور لگی بچارے سیدھے سادے دیندار پر ڈورے ڈالنے۔"٦١؎

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صادق حسین گلی محلے کی عام عورتوں کی نفسیات کو بھی بخوبی سمجھتے تھے۔ اور وہ ایک موضوع کے اندر ذیلی موضوعات کو تراشنے کا فن بھی جانتے تھے۔ جو اُن کے گہرے سماجی شعور کی دلیل پیش کرتا ہے۔ تنہا عورت کی بے بسی اور نفسیاتی کش مکش کو سماجی رویوں کے ساتھ ملا کر صادق حسین نے انسانی رویوں پر گہرا طنز بھی کیا ہے۔ یہ افسانہ موضوعاتی اعتبار سے معاشرے پر کڑی طنز ہے جہاں بیوہ عورت کے لیے زندگی کا دائرہ تنگ کر دیا جاتا ہے۔

افسانہ "بوئے" پھولوں کے محل کا آخری شاہکار افسانہ ہے جو پاکستان ٹیلی ویژن سے ٹیلی کاسٹ بھی کیا جا چکا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ افسانہ مغربی تہذیب کے دلدادہ لوگوں کی طرزِ بود و باش اور کلچر کی نمائندگی کرتا ہے۔ صادق حسین نے واضح کیا ہے کہ انگریزوں کے برصغیر سے چلے جانے کے بعد بھی اُن کے اثرات قائم ہیں ۔اونچی سوسائٹیہ سے تعلق رکھنے والے مشرقی لوگ مغربی تہذیب کے اب بھی دلدادہ ہیں اور انھی کے اثرات قبول کئے ہوئے ہیں۔ پورے افسانے میں انگریزی کلب کے مناظر اور اس میں چہل پہل کی تصویر کشی کرتے ہوئے صادق حسین نے مشرقی لوگوں کو گہری تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ ایسے لوگ جو آزادی حاصل کر لینے کے بعد بھی انگریزوں کے

غلام ہیں۔ اس افسانہ میں صادق حسین نے جس کلب کا ذکر کیا ہے وہ بقول صادق حسین انگریزوں کے دور میں قائم ہوا تھا۔ ہمارے لئے یہ بات انتہائی تکلیف دہ ہے کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد بھی ہم ان کے حصار سے نہیں نکل سکے۔ یہ ایک شرمناک حقیقت ہے کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد بھی ہم ان کی روایات کو نہ صرف زندہ کئے ہوئے ہیں بلکہ ان کے اپنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

"تقسیمِ ہند سے پہلے یہ کلب فرنگیوں کے لیے مخصوص تھا لیکن وہ تو غلامی کا زمانہ تھا۔ اب ہم آزاد ہیں اب اس کلب میں پاکستانیوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ اب یہاں ریشمی غراروں، ساٹن کی چمکیلی شلواروں، جارجٹ کی رنگ برنگی ساڑھیوں اور کالی شیروانیوں کی بہار ہے۔" ۶۲؎

صادق حسین نے پاکستانیوں پر کھلا طنز کیا ہے اس کے علاوہ وہ تقسیم ہند کے بعد آنے والی اس تبدیلی سے نا خوش ہیں۔ جو پاکستانیوں کو مغرب زدہ کر رہی ہے اور اپنی روایات سے دوری کا سبب بن رہی ہے۔ اس حوالے سے انوار احمد لکھتے ہیں:

"آزادی کے بعد بھی صورتِ حال میں جس قدر تبدیلی آئی وہ ممکن ہے مقتدر طبقات کیلئے خوش آئندہ ہو مگر اس ملک کے باشعور طبقے کیلئے مسلسل اور متواتر اذیت کا سامان فراہم کرتی ہے۔" ۶۳؎

صادق حسین نے افسانہ "بوفے" کے ذریعے یہ باور کروایا ہے کہ مغربی تہذیب بظاہر چمک دمک والی ہے اور اس کی رنگینیاں آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی ہیں لیکن یہ تہذیب اندر سے اتنی ہی کھوکھلی ہے۔ یہ ظاہری چمک دمک صرف اُن لوگوں کو متحیر کر سکتی ہے جو اس تہذیب کے پروردہ ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جو لوگ اس تہذیب کو اپنانے کی غلطی کر چکے ہیں وہ اس کا خمیازہ اٹھا رہے ہیں۔ اور اسے ناپسند بھی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ افسانے میں مشرقی تہذیب کا دلدادہ نوجوان انعامی ٹکٹ کے ذریعے کلب میں داخل ہوتا ہے تو وہاں کا منظر، رنگینیاں اور ظاہری رکھ رکھاؤ اور کھلے انداز سے مردوں عورتوں کا آپس میں ملنا اور گپ شب لگانا۔ اُسے بے حد مرعوب کرتا ہے۔ "تنہائی کی تاریکیوں سے نکل کر دفعتاً اس رنگ و بو کی دنیا میں پہنچ کر وہ متحیر کھڑا تھا۔" ۶۴؎ اسی لیے کلب کی فضا میں اُسے بلا کشش اور تازگی محسوس ہوتی ہے۔ "حفیظ سوچنے لگا کہ کلب کی زندگی ہے تو بڑی دلچسپ، یہاں ہر شخص دوسرے سے کھلم کھلا بات چیت کر سکتا ہے۔" ۶۵؎ اسی کلب میں اسکی ملاقات اپنی بچپن کی ساتھی سے ہو جاتی ہے۔ وہ مغرب زدہ لوگوں سے متاثر ہو کر بے اختیار کہہ اٹھتا ہے کہ "جینا تو یہ لوگ جانتے ہیں" ۶۶؎ مگر اس کے بچپن کی دوست منور یہ کہہ کر اُسکی تردید کر دیتی ہے کہ "نہیں یوں کہو کہ وہ اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں۔" ۶۷؎

منور کا یہ جملہ اس نوجوان کو حیرت میں مبتلا کر دیتا ہے مگر جونہی منور اُسے اپنی روزمرہ زندگی کا شیڈول بتاتی ہے تو حفیظ پر اچانک بظاہر خوش اور رکھ رکھاؤ والے مغرب زدہ لوگوں کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ اور وہی حفیظ جو

تھوڑی دیر پہلے کلب کے لوگوں سے متاثر ہوتا نظر آتا ہے اور خود احساس کمتری میں مبتلا ہو کر انجانے خوف اور ڈر کا شکار ہو جاتا کہ کہیں اسکی اصلیت نہ کھل جائے اور کوئی اُس سے اس کے سوشل اسٹیٹس کے بارے میں سوال نہ کر لے اُسی حفیظ کی سوچ اچانک کروٹ بدل لیتی ہے۔ اور وہ دل ہی دل میں سوچتا ہے کہ کاش وہ زمانہ لوٹ آئے۔ یا وہ اپنے گاؤں جا کر منور کی مشکل ترین اور غموں سے بھری زندگی کے متعلق گاؤں والوں کو آگاہ کر سکے۔ منور کی زندگی کے حوالے سے اقتباس ملاحظہ ہو۔

"میری زندگی گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ چکر کاٹ رہی ہے۔ مجھے ہر روز وقت پر ناشتہ کرنا پڑتا ہے۔ دن کے ٹھیک ایک بجے لنچ، ٹھیک چار بجے شام کی چائے۔ ٹھیک نو بجے رات کا کھانا اور پھر ایک معین وقت پر جچاتُلا ٹھنڈا مکینکل خاوند کا پیار۔ بر تھ ڈے پر پھولوں کے ساتھ قیمتی تحفے ہر عید پر ایک جڑاؤ زیور۔"٦٨؎

مغربی تہذیب کی چکا چوند گھما گھمیوں سے متاثر ہونے والے حفیظ پر مغربی تہذیب کی اصلیت اور کھوکھلا پن آشکار ہوتا ہے تو وہ اسی مغربی تہذیب سے متنفر ہو جاتا ہے۔

صادق حسین نے اس افسانے میں جہاں مغربی تہذیب کو موضوع بنا کر اس کے کھوکھلے پن کو بے نقاب کیا ہے وہاں مشرقی تہذیب کی خصوصیات اور پر سکون زندگی سے بھی آشنا کروانے میں کامیاب رہے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اس افسانے میں مغربی اور مشرقی تہذیب کا موزانہ بھی کیا گیا ہے۔ مشرقی تہذیب میں خلوص اور اپنائیت کے جذبات ہیں جبکہ مغربی تہذیب ان سب سے بے بہرہ ہے۔ ظاہری جاہ و جلال مقام و مرتبہ دکھاوا، جنس اور تہذیبی آزادی، اعلیٰ لباس روپیہ پیسہ اور شاندار کھانا یہ سب سچی خوشیاں، محبت اور تحفظ نہیں دے سکتیں جو سچی محبت اور سچی خوشی مشرقی تہذیب اور خاص کر گاؤں کی معاشرت اور تہذیب دے سکتی ہے۔ بحیثیت مجموعی افسانہ دو تہذیبوں کے باہمی ٹکراؤ کی عمدہ ترین مثال پیش کرتا ہے۔

سماج میں ہونے والی تبدیلیاں صادق حسین کی تحریروں پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکیں۔ افسانہ بونے کے مطالعے کے بعد کہنا درست ہے کہ ہر دور کی بے چینی اور انتشار و تغیرات جہاں عام انسانی شخصیت پر اثر انداز ہوتے ہیں وہاں اس دور کے ادیب اور شعراء کو بھی متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

معاشرتی رویوں کے ساتھ ساتھ تغیراتِ زمانہ بھی ادباء اور شعراء کے ذہن کو متحرک اور فعال بنانے میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ اس حوالے سید محمد عقیل کا کہنا ہے کہ :

"یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہیے کہ ہر سماج کے حالات ادیب اور فنکار سے اس دور کے ذہنی خلفشار کو منعکس کرنے یا ان کا جواب سننے کیلئے تخلیقات میں ڈھلتے رہتے ہیں۔ ہر دور کی بے چینی ہر دور کے سوالات ذہن کو کسی جذبے کے تحت متحرک کرتے ہیں اور تب ادب وجود میں آتا ہے۔"٦٩؎

افسانہ بوفے کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ تغیراتِ زمانہ کا اثر صادق حسین کی شخصیت اور تحریروں پر بھی ہوا۔ اگر دیکھا جائے تو اس افسانے کے ذریعے انہوں نے ہمیں بڑا گہرا سبق دیا ہے۔ کہ جو قومیں اپنی اصلیت کو بھلا کر دوسری تہذیب کے اثرات قبول کر لیتی ہیں وہیں سے ان کا معاشرتی و سماجی زوال شروع ہو جاتا ہے۔ دو تہذیبوں کے ٹکراو کا نتیجہ سماجی انہدام کی صورت میں نکلتا ہے۔ اس لیے ہم پاکستانیوں کو چاہیے کہ اپنی تہذیب کی رکھوالی کریں اور جس مقصد کے تحت اس خطۂ ارضی کا حصول ممکن ہوا تھا اس مقصد کو فراموش نہ کریں اور خالص اسلامی تہذیب کی ترویج و اشاعت کو جہاں تک ہو سکے ممکن بنائیں۔

"شہر اندر شہر" کے افسانوں میں سماجی شعور (بحوالہ موضوع)

تیرہ افسانوں پر مشتمل "شہر اندر شہر" صادق حسین کا دوسرا افسانوی مجموعہ ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔ دوسرے افسانوی مجموعے میں بھی ان کے بیشتر افسانے دیہاتی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ دیہاتی ماحول سے پسندیدگی اور فطرت سے لگاؤ کے علاوہ دیہی زندگی سے وابستہ لوگوں کی ضروریات محسوسات، معاشرتی رویے، اقدار، تہذیب و ثقافت کے علاوہ اُن معاشرتی مسائل کا تذکرہ شہر اندر شہر کے افسانوں میں خاص کر "برگد کا پیڑ"، "دشمن"، "حمید اکرُیل"، "انسان" اور "کرموں" میں ملتا ہے۔ زمانی حوالے سے اگر دیکھا جائے تو اُن کے پہلے اور دوسرے افسانوی مجموعوں کی اشاعت میں لگ بھگ ۲۵ سال کا وقفہ نظر آتا ہے۔ یہاں پر یہ سوال ذہن میں ابھرنا لازم ہے کہ آیا زمانی تغیرات نے کس حد تک صادق حسین کے فن کو متاثر کیا؟ اس بات سے قطع نظر کہ ہر مصنف کا اپنا مخصوص اندازِ بیاں اور فکر و شعور ہوتا ہے جس کی بنا پر وہ اپنے خاص نکتہ نظر کو تحریری صورت میں بیان کرتا ہے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فنی پختگی اور مہارت بھی یقینی ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ زمانی تغیر و تبدل کے اثرات صادق کے افسانوں پر بھی مرتب ہوئے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ دیہی معاشرت کے حوالے سے ان کا شعور پختہ اور گہرا ہے لیکن ان کے دوسرے افسانوی مجموعے" شہر اندر شہر "کے بیشتر افسانوں میں دیہی زندگی پر شہری زندگی کے اثرات نمایاں طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ اور اسکی وجہ وہ شعور اور آگہی ہے جو انسان کو ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے اُن کو آگے بڑھنے اور مقابلے کا درس دیتی ہے۔ ان کے ابتدائی افسانوں میں دیہاتی زندگی کے سادہ اور معصوم پہلوؤں اور جذبات و احساسات کا ذکر ملتا ہے لیکن "شہر اندر شہر" میں انہوں نے دیہی سماج سے تعلق رکھنے والی دو نسلوں کا تضاد اور اُن کی فکر اور سوچ میں فرق کو واضح کیا ہے۔ ایک طرف روایتی سوچ کے حامل بزرگ اور دوسری طرف جدید تعلیم سے آراستہ نوجوان شامل ہے جن کے افکار اور خیالات اور احساسات کا موازنہ ان کے دوسرے افسانوی مجموعے "شہر اندر شہر" میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

صادق حسین ایک حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے جس حقیقت پسندی سے زندگی کے تلخ تجربات کو بیان کیا ہے وہی اُن کے فن کا بہترین گواہ ہے دیہات کو موضوع بنا کر جس طرح انہوں نے دیہاتیوں کے مسائل اور خواہشات کو بیان کیا ہے۔ اسی طرح انھوں نے دیہاتی زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں پر گہری تنقید بھی کی ہے۔

صادق حسین کے دیہی سماج سے تعلق اور دلچسپیوں کے حوالے سے ڈاکٹر انوار احمد رقمطراز ہیں۔

"دیہی معاشرت سے وابستگی اور آگاہی کا دعویٰ تو بہت سے افسانہ نگاروں کو ہے۔ مگر صادق حسین کسی بلند بانگ دعوے کے بغیر بھی ہماری دیہی زندگی کا سچا رفیق اور محرم دکھائی دیتا ہے" ۰ے

بلاشبہ ڈاکٹر انوار کا یہ کہنا بالکل درست ہے آپ واقعی دیہاتی معاشرت کے سچے رفیق ہیں۔ ذیل میں "شہر اندر شہر" کے افسانوں کے موضوعات کا بالترتیب تجزیہ پیش کیا جا رہا ہے۔ جو صادق کے دیہی سماجی شعور سے آگاہی فراہم کرے گا۔" برگد کا پیڑ" موضوعاتی اعتبار سے دیہاتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطے کرنے کے ساتھ ساتھ اُن پر تنقید بھی کرتا ہے۔ برگد کے پیڑ کو صادق حسین نے علامتی رنگ دے کر دیہات اور دیہاتیوں کی زندگی کو حقیقت کی عینک لگا کر پیش کیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ برگد کا پیڑ کوئی عمر رسیدہ بزرگ ہے جو گاؤں کے حسب نسب اور اتار چڑھاؤ سے واقف ہے۔ اور اپنے سینے میں بہت سارے رازوں کو سمیٹے ہوئے ہو۔ اور زندگی کے گزرتے لمحات کی یادداشت ورق ورق کی صورت میں برگد کے پیڑ کے سینے میں موجزن ہے۔ صادق حسین نے برگد کے پیڑ کے وجود کو افسانے میں اس طرح بیان کیا ہے "گاؤں کے میدان میں کچے راستے کے پاس برگد کا پیڑیوں کھڑا ہے جیسے کوئی عہد ساز مفکر حکمت کے سرمائے تلے جھکا ماحول کا جائزہ لے رہا ہے۔"۱؎ یہ افسانہ حقیقت پسندی کا مجسم نمونہ ہے۔ اس افسانے میں معاشرتی زندگی کا سب سے تلخ پہلو طاقت اور دولت کا نشہ ہے۔ جو انسان کو مغرور بنا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی اصلیت کو بھلا بیٹھتا ہے۔ اور اپنے ماضی کو بھلا کر حال اور مستقبل کی خرمستیوں میں خود کو مگن کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب برگد کا پیڑ کسی بزرگ کی طرح گاؤں کے نامی گرامی پہلوان سے مخاطب ہو کر اُسے اسکی اصلیت یاد دلاتا ہے کہ کبھی تم کمہار کے بیٹے تھے اور اسی گاؤں میں پل بڑھ کر جوان ہوئے ہو تو پھر کیوں طاقت کے نشے میں چُور ہو کر آباواجداد کے آوے اور چاک توڑتے پھر رہے ہو تو تکبر سے بھرا ہوا پہلوان یوں جواب دیتا ہے۔

"میں جو اُس وقت تھا اب نہیں ہوں۔ میرا حال میرے ماضی پر حاوی ہے۔"۲؎

نصیحت انسان کو بالکل بھی پسند نہیں۔ جب کوئی بڑا آپ کی بھلائی کے لیے دو لفظ نصیحت کے کہے تو انسان اس نصیحت کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے اور اُلٹا نصیحت کرنے والے کو اپنا دشمن سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔ اور خاص کر دولت اور طاقت کے نشے میں چُور لوگوں پر نصیحت کم ہی اثر انداز ہوتی ہے۔ جیسے افسانے میں برگد کا پیڑ تحصیلدار کو اسکی اصلیت یاد دلاتا ہے کہ تم تیلی کے بیٹے ہو اب تمھاری پگڑی کا شملہ اونچا ہو گیا ہے تو کیا تمھیں اپنے ماضی کو نہیں بھلانا چاہیے تو تحصیل دار برگد کے پیڑ کو جواز پیش کرتا ہے کہ وہ یہ سب اولاد کے بہتر مستقبل کی خاطر کر رہا ہے۔ اور اپنی طاقت دکھاتے ہوئے متکبرانہ انداز میں برگد کے پیڑ کو دھمکاتا ہے کہ اگر میں چاہوں تو تمھارا نام ونشان مٹ جائے۔" تحصیلدار گرجتا ہے، میں اپنے بچوں کا مستقبل محفوظ کر رہا ہوں۔"۳؎ برگد کا پیڑ جب تحصیلدار کو نصیحت کرتا ہے تو تحصیلدار کہتا ہے۔" میں اگر چاہوں تو تجھے آرے سے کٹوا ڈالوں اور تیرا نام ونشان مٹ جائے۔"

صادق حسین نے انسانی معاشرے کے حوالے سے جو نکتہ اُٹھایا ہے وہ والدین کا اپنی اولاد کے مستقبل کے لیے پریشان ہونا ہے اوران کے بہتر مستقبل کی خاطر روپیہ پیسہ اکٹھا کرنے میں مگن رہنا۔

صادق حسین نے اس افسانے کے ذریعے دیہاتیوں کی سوچ اور اُن کے اعمال و افعال کا بھی تجزیہ کیا ہے۔ دیہاتی لوگ محنتی اور جفاکش ہوتے ہیں اور زراعت ہی اُن کا ذریعہ معاش ہے۔ وہ خون پسینا ایک کر کے کھیتوں میں کام کرتے ہیں۔ اور فصلوں کو پروان چڑھاتے ہیں لیکن قسمت کی ستم ظریفی کہ انہیں اُن کی محنت کا صلہ اس طرح نہیں مل پاتا اور تھوک کے بیوپاری چند روپوں کے عوض اُن کی ساری محنت خرید لیتے ہیں۔ اور اسطرح طاقتور اور صاحبِ اختیار لوگوں کے ہاتھوں غریب کسانوں کا استحصال ہوتا رہتا ہے۔ صادق حسین نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ بہت سے دیہاتی نوجوان اپنی محنت کی کمائی کو غیروں کے ہاتھوں لٹتا دیکھ کر کڑھتے ہیں۔ لیکن چونکہ اُن کے پاس طاقت نہیں اس لیے وہ اس ظلم کے خلاف آواز اُٹھانے سے گریزاں نظر آتے ہیں۔ اور یہی ستم ظریفیاں بعض اوقات دیہاتی نوجوانوں میں باغیانہ ردعمل کو جنم دیتی ہیں اور وہ حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے منفی ذرائع کا استعمال کر لیتے ہیں۔ جیسے افسانے میں مذکورہ بدنام ڈاکو اس وجہ سے ڈاکو بنتا ہے کہ وہ تھوک کے بیوپاریوں سے انتقام لے سکے۔" ڈاکو نے تہیہ کر لیا کہ وہ اس وقت تک منصوبے بناتا رہے گا جب تک تھوک کے بیوپاری کی لمبی موٹر کار کے حصے بخرے نہیں ہو جاتے۔"۴ے

صادق حسین نے اس افسانے کے ذریعے یہی بات سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ وقت اور حالات ہی انسان کو اچھا یا برا بننے پر مجبور کرتے ہیں۔ صادق حسین نے دیہاتیوں کے حوالے سے بتایا ہے کہ گاؤں کے لوگ مٹی سے وفا کرنے والے ہوتے ہیں اور اس کے علاوہ عورت کی عزت اور تحفظ کے حوالے سے سب کا نظریہ دیہات میں یکساں ہے کہ عورت کی عزت سانجھی ہے۔ اور وہ اُن کی عزت کے رکھوالے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس افسانے میں تین شہری آپس میں جب گاؤں کی لڑکی کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہیں تو گاؤں کا ایک بانکا نوجوان غیرت مندی کا ثبوت پیش کرتے ہوئے ان کی ہڈی پسلی ایک کرنے کی دھمکی دیتا ہے۔ "گاؤں کا کڑک بانکا شہریوں کی باتیں سن کر غصہ کے مارے بھوت ہو گیا، کڑک کر بولا؛ چلے جاو واپس، نہیں تو ہڈی پسلی توڑ دوں گا۔"۵ے یہاں صادق حسین کا زاویہ نگاہ شہریوں کے خلاف دیہاتیوں کی نفرت کو ظاہر کرنے کے ساتھ ساتھ دیہاتیوں کی محبت کا ثبوت بھی دیتا ہے۔ جہاں بھی دیہاتیوں کی عزت کا سوال پیدا ہوتا ہے وہاں صادق حسین کے قلم میں خود بخود کھردراپن آجاتا ہے۔ دیہاتیوں کی وہی جذباتیت اُن کے الفاظوں میں نظر آتی اور یہی اُن کی فنی انفرادیت کی غماز ہے۔ ڈاکٹر سید انور سدید صادق حسین کی اسی انفرادیت کا ذکر یوں کرتے ہیں:

"صادق حسین کی انفرادیت یہی ہے کہ وہ پہلے خون کی شریان میں بغاوت کا ٹیکہ لگاتا ہے اور پھر گندے خون کا فوراً اخراج کر کے اس زہر کو زائل کر دیتا ہے۔"۶ے

ایک اور معاشرتی المیے کو صادق حسین نے اپنے افسانے کے موضوع میں جگہ دی ہے۔ وہ یہ کہ شہری جن کا تعلق ابتداء میں کسی نہ کسی دیہات سے جڑا ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو شہری زندگی کی رونقوں میں گم ہو کر دیہاتی غیرت مند اور مٹی سے محبت کرنے والے لوگوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور انہیں غیر مہذب ہونے کے طعنوں سے نوازنے کے ساتھ ساتھ اُن کی تمسخر بھی اڑاتے ہیں۔" تیسرے شہری نے پتھر مارا: تم دونوں غلط کہتے ہو۔ ہم بھوکے ہیں، ہمیں روٹی دو اور ہماری سوچ لے لو۔"ے ے یہاں پر تینوں شہری جب گاؤں میں جاتے ہیں تو وہ ان پر طنز کے تیر چلاتے ہیں کہ گاؤں کے لوگوں کا سب سے بڑا مسئلہ روٹی ہے۔ ان کی سوچ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔

صادق حسین کے اس افسانے میں برگد کا پیڑ کبھی بزرگ کی شکل میں دکھائی دیتا ہے جو گاؤں والوں کو اُن کی اصلیت سے آگاہی دلانے کے ساتھ پند و نصیحت کے فرائض بھی انجام دیتا ہے اور گاؤں والوں کے لیے فکر مند رہتا ہے۔ اور کبھی کبھی ٹھہرے ہوئے وقت کی مانند نظر آتا ہے۔ جو زندگی کے تمام لمحات کا بغور مشاہدہ کر رہا ہے اور ورق ورق کو اپنے اندر سمیٹ رہا ہے۔

اس افسانے کے ذریعے صادق حسین نے دیہاتیوں کی سوچ و عمل، وفا شعاری، ناصحانہ طرز عمل، انتقامی آگ اور انسانی رویوں جیسے غرور، تکبر، انانیت، غیرت مندی اور دانشمندی جیسے تمام معاشرتی عناصر کو تنقیدی نظر سے بیان کرنے میں اچھے خاصے کامیاب رہے ہیں۔

افسانہ "اُس پل پر" کا موضوع بھی غربت اور مفلسی ہے اس افسانے میں صادق حسین نے بھکاریوں اور نچلے متوسط طبقے کے لوگوں کو موضوع میں جگہ دے کر اُن کے مسائل اور طرز بود و باش کے ساتھ ساتھ اُن کے مشاغل کو بھی سامنے لایا ہے۔ بھکاری روزی روٹی کے حصول کے لیے طرح طرح کے روپ دھار لیتے ہیں اور اپنی چرب زبانی سے دوسروں سے روپیہ بٹور لینے کے گر بھی جانتے ہیں۔

صادق حسین جس سماج کی بات کرتے ہیں اس سماج سے متعلقہ تمام عوامل کو بیان کرنے پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ صادق حسین نے مزید بتایا کہ کہ مفلس اور غریب لوگوں کی زندگی میں دکھ اور سکھ کوئی معنی نہیں رکھتے ان کی زندگیوں کا موسم سدا بہار موسم ہوتا ہے۔ وہ ہے غربت کا موسم، محتاجی کا موسم، اور دستِ سوال دراز کا موسم۔ ان کی زندگیوں کی کہانی کا آغاز اور انجام صرف روپے پیسے کے حصول پر مرکوز رہتا ہے جو انھیں صرف بھیک مانگ کر ہی حاصل ہوتا ہے۔" وہ سوچتا کہ پُل کی سیڑھیوں پر بھیک مانگنے والی مخلوق کو تو یہ احساس ہی نہیں رہا کہ سکھ کیا ہے اور دکھ کیا۔ وہ تو مسکین صورت بنا کر دستِ سوال دراز کرتے ہیں۔"۸ے صادق حسین نے بھکاریوں کی زندگی کے احوال

بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس معاشرتی المیے کی جانب ہماری توجہ مبذول کرائی ہے کہ گداگر اور بھکاری اگر چاہیں تو اپنی محنت اور زورِ بازو سے روزی کما سکتے ہیں لیکن سہل پسندی اور کام چوری انھیں پیشہ ور بننے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ان لوگوں کا پیشہ بھیک مانگنا ہے اور ان کی رہائش شہر سے دور کچے علاقے میں جھگیوں میں ہوتی ہے۔ دن بھر یہ لوگ بھیک مانگتے ہیں اور اُس کے لیے مخصوص جگہوں کا تعین بھی کر لیتے ہیں۔ جیسے افسانے میں پُل پر اور اس کے ارد گرد بھیک مانگنے والوں کی بہتات ہوتی ہے۔ جسے صادق حسین نے اپنی لفظی کاریگری سے ایک مکمل نقشے کی صورت میں بیان کیا ہے۔ "پُل کی سیڑھیوں کے دونوں طرف ایک سرے سے دوسرے سرے تک بھکاریوں نے اڈے جما رکھے تھے۔" ۷۹ اسی پُل پر ایک طرف دلبر خان لوگوں کی قسمتوں کے حال طوطا فال کے ذریعے معلوم کرتا ہے۔ "پُل کے نکڑ پر اکڑوں بیٹھا موجی بابا بھنگ کے نشے میں سر کو جھٹک کر بار بار دہراتا ہے: نذر اللہ نیازِ رسول۔ "اسی پُل پر سائیں بابا بھیک مانگنے کے لئے صدا لگاتا ہے۔ "نیلی چھتری والے کے نام پر۔" ۸۰ اس طرح پُل کی سیڑھیوں پر بھی کچھ بھکاری بیٹھے صدائیں لگا رہے ہوتے ہیں ایک سیڑھی پر اندھا فقیر آواز میں مناسب ردوبدل کر کے پکارتا ہے۔ "ہے کوئی اللہ کا پیارا۔" ۸۱ جبکہ اگلی سیڑھی پر ایک اپاہج بھکارن جھولی پھیلائے بیٹھی ہوتی ہے۔ اور راہگیروں سے دستِ سوال دراز کرتی ہے۔ حسین نے پیشہ ور بھکاریوں کا نقشہ بہت باریکی اور صفائی سے کھینچا ہے۔ اور ان کی روز مرہ کی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ بھکاری باقی اوقات کار میں جیب تراشی، منگ پتہ پتنگ بازی اور ترِی چھکے کے گر سیکھتے ہیں جو مستقبل میں اُن کے کام آتے ہیں۔ صادق حسین نے بھکاریوں کے کلچر کو واضح کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ اس کلچر سے تعلق رکھنے والے غیر مہذب لوگ ہوتے ہیں۔ گالی گلوچ کرنا اور مانگ تانگ کر پیٹ کی آگ بجھا لینا ہی اُن کی زندگی کا مقصد ہوتا ہے۔

دراصل صادق حسین ہمارے معاشرے سے جڑے ان افراد کا ذکر کرتے ہوئے حوالہ دیتے ہیں جن کا براہِ راست عام انسان کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن کسی نہ کسی طرح وہ ہر معاشرے اور سماج سے جڑے ہوتے ہیں۔ جن پر ایک عام انسان کی نگاہ اتنی گہرائی سے نہیں پڑتی۔ جیسے گلیوں میں بازاروں میں ریلوے اسٹیشنوں پر اور شاہراہوں پر بھی ایک مکمل کلچر دیکھنے کو ملتا ہے جنہیں عام انسان نظر انداز کرتے ہیں حالانکہ روز مرہ زندگی میں ایسے لوگوں سے کسی نہ کسی طرح سے عام فرد کا واسطہ پڑتا رہتا ہے۔

صادق حسین کی تحریروں میں بھی منفرد اور نمایاں خصوصیت یہی ہے کہ وہ اُن لوگوں، اس سماج اور اس طبقے پر قلم اُٹھاتے ہیں جنھیں عام ادیب یا مصنف اتنی باریکی سے دیکھنے سے قاصر رہتا ہے۔ سماجی عوامل اور سماج سے وابستہ بہت ساری باتوں اور چیزوں کو جہاں عام انسانی آنکھ دیکھنے سے قاصر رہتی ہے وہاں صادق حسین کی قوت مشاہدہ اتنی ہی

باریکی سے ان تمام پہلوؤں اور عوامل کا احاطہ کرتی ہے کہ پڑھنے والی توجہ ان سماجی عوامل تک پہنچنے میں نہ صرف کامیابی حاصل کرتی ہے بلکہ عام انسان کی سوچ اور تخیل کی گرہیں کھلتی چلی جاتی ہیں اور وہ ان لوگوں کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

صادق حسین نے اس افسانے میں ماں کی مامتا جیسے عظیم اور بے لوث جذبے کا ذکر بھی کیا ہے۔ جو انسان زندگی کے کسی حصے میں بھی نہیں بھول سکتا۔ ماں وہ واحد رشتہ ہے جسکی کمی انسان زندگی کے ہر دور میں ہر عمر میں محسوس کرنا چاہتا ہے۔ اور جب شاہ چن چراغ کی درگاہ کی فقیرنی اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتی ہے۔ تو دلبر خان کے رگ و پے میں بجلی سی دوڑ جاتی ہے اور اُسے اپنی ماں اپنے ارد گرد محسوس ہوتی ہے۔

"دلبر خان کو یوں محسوس ہوا جیسے مامتا کی خوشبو ابھی ابھی وہاں آکر پھر اڑ گئی ہو۔ اُس کا جی چاہا کہ شاہ چن چراغ کی درگاہ کی فقیرنی ہر روز اُسی طرح اس کے سفید بالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا کرے بیٹا۔" ۸۲

صادق حسین نچلے طبقے اور سماج کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وقت اور حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ انسان کی ضروریات اور تقاضے بھی تبدیل ہو جاتے ہیں اور مقابلے کی دوڑ میں انسان دولت اور مال اسباب کی لالچ کے نشے میں مبتلا ہو جاتا ہے اور ایک وقت آتا ہے جب وہ انسانی رشتوں پر روپے پیسے اور دولت کو ترجیح دینے لگ جاتا ہے۔ جیسے افسانے میں دلبر خان ۳۰ سالوں میں فال نکالنے والی پرچیوں میں ردوبدل کرتا ہے اور اُن میں واضح فرق محسوس کرتا ہے۔ کیونکہ ابتداء میں لوگوں کا رجحان پیار محبت کی طرف زیادہ تھا۔ لہذا وہ محبت میں کامیابی اور ناکامی والی فال کے لیے بے چین ہوتے تھے۔ پھر کچھ عرصے بعد قسمت کے حال تک یہ سلسلہ محدود ہو کر رہ گیا۔ پھر ایک وقت آیا جب فال والی پرچیوں پر چند نفسیاتی جملوں کے ساتھ دلبر خان غیب کی خبریں پرچیوں پر لکھنے لگا۔ جیسے عنقریب بچھڑے ہوئے دوستوں سے ملاقات وغیرہ۔ اور دلی مرادیں بر آئیں گی۔ لیکن اسکے بعد لوگوں کی توجہ کا محور صرف وہ پرچیاں تھیں جو دولت کے حصول سے متعلق تھیں۔

"دلبر خان سوچتا انسان خود اپنا سب سے بڑا دشمن ہے اس لیے کہ محبت میں کامیابی اور ناکامی کی پرچیوں کی تعداد کم ہوتے ہوتے آخری نقطے پر پہنچ گئی تھی اور اب ہر پرچی پر جلی حروف میں لکھا ہوتا۔ دولت ملے گی۔" ۸۳

انسان کی زندگی ایک سی نہیں رہتی اس میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں اور انسان ہر طرح کے ماحول کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جیسے دلبر خان کا ماضی اس قدر بھیانک نہیں تھا مگر حالات و واقعات اُسے موجودہ نہج پر لا کھڑا کرتے ہیں کہ وہ طوطا فال کے ذریعے لوگوں کی قسمتوں کے حال جاننے پر مجبور و مامور ہو جاتا ہے۔" تیس برس پہلے وہ قسمت کا حال بتانے والا نہ تھا بلکہ اس بے فکری کے زمانے میں وہ تقریریں کیا کرتا تھا۔" ۸۴ اس طرح دلبر خان بھی زندگی کے نشیب و فراز کا مقابلہ کرتے کرتے مجبوراً اس پیشے کو اپنا لیتا ہے۔ کیونکہ

انسان کو پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے کوئی نہ کوئی کام تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ دلبر خان بھی اس پیشے کو قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیتا ہے۔ مجموعی طور پر صادق حسین نے نچلے متوسط طبقے کو موضوع بنا کر ہماری توجہ ان معاشرتی پہلوؤں کی جانب مبذول کرائی ہے جنھیں ایک عام انسان آنکھ اتنی باریکی سے دیکھنے سے قاصر ہے۔

"جھولی" افسانہ متوسط کاروباری طبقے کی نمائندگی کرنے والا افسانہ ہے اور اس میں بیکری کے مالک جیسے کاروباری ذہن رکھنے والے لوگوں کی زندگیوں کو سامنے لایا گیا ہے جو اپنے ذاتی مفادات کو ترجیح دیتے ہوئے غریبوں کو استحصال کرتے ہیں۔ جیسے افسانے میں استاد مودی جب اپنے بیٹے کا رویہ دیکھتا ہے اور مزدوروں کے حقوق کے حوالے سے باپ الجھتا ہے تو پریشان ہو جاتا ہے کہ اس کے بعد فخری ساری دولت برباد کر دے گا۔"استاد مودی کے دل میں یہ خیال جڑیں پکڑنے لگا کہ اس کی موت کے بعد فخری ساری دولت برباد کر دے گا۔"[۸۵] بعض اوقات کاروباری لوگ اپنی ساکھ برقرار رکھنے اور روپے پیسے اور شہرت کے حصول کے لیے منافقانہ رویہ بھی اپنانے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور اپنے پیشے سے متعلق اور فنی مہارتوں سے متعلق رازدرانہ رویہ اپنا لیتے ہیں کہ کہیں دوسرے کو پتا نہ چل جائے اور اُن کی ساکھ برقرار نہ رہ سکے تو نقصان ہوگا۔ جیسے استاد مودی کو اپنے بیٹے کے حوالے سے خدشہ لاحق رہتا ہے کہ وہ پیشے کے گر کسی اور کو نہ بتا دے۔ "[۸۶] اُسے کھٹکا لگا رہتا کہ اگر فخری پیشے کی باریکیاں کسی کو بتا دیں تو کاروبار کا ستیاناس ہو جائے گا۔" یہاں یہ تاثر نمایاں ہوتا نظر آتا ہے کہ مقابلے کی دوڑ ہر معاشرے اور ہر طبقے کے افراد میں ہر جگہ اور ہر عمر میں پائی جاتی ہے۔

انسان کی فطرت میں شامل ہے کہ وہ ہر ہر پہلو پر اپنا موازنہ دوسروں سے کرتا ہے اور خود کو بہتر ثابت کرنے کے لیے ہر حربہ اختیار کرتا ہے۔

اس افسانے میں بھکاریوں کا ذکر کر کے صادق حسین نے غربت و افلاس اور طبقاتی اونچ نیچ اور معاشرتی تقسیم کا ذکر بھی گہرائی سے کیا ہے۔ اور معاشرے کی بے حسی اور ان کی اخلاقی و سماجی ذمہ داریوں سے لاتعلقی اور عدم دلچسپی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے بھکاریوں کا ذکر کر کے بھوک کے ہاتھوں انسانیت کی تذلیل کو بھی سامنے لایا اور یہ واضح کیا کہ یہ لوگ پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے ہر قسم کی اخلاقیات انا اور خودداری کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں اور ہر طرح کے احساس سے عاری ہو کر صرف پیٹ پوجا اُن کی توجہ کو مرکز بن جاتی ہے۔

> "جھوٹن کے ڈھیر کے پاس بھکارنیں اور بھکاری ایک ننگ دھڑنگ بچے کے سر اور جسم پر بکھرے کیک کے لونڈے اور پھنکیاں، ہاتھوں سے سمیٹ سمیٹ، چپڑ چپڑ کھا رہے تھے۔ ایک بھکارن بچے کا سر زبان سے چاٹنے لگی۔"[۸۷]

صادق حسین جس معاشرے یا تہذیب کا خاکہ کھینچتے ہیں تو اس سے متعلق تمام تفصیلات بھی فراہم کرتے ہیں ۔اور تمام معاشرتی عوامل جیسا کہ ماحول، آداب واطوار، پیشوں، تفریح طبع کے ذرائع، مقامات، ذرائع آمد ورفت اور یہاں تک کہ سماجی اداروں کے ساتھ ساتھ سماجی رویوں کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ان کا یہی وصف انھیں دیگر افسانہ نگاروں سے ممتاز کرواتا ہے۔ صادق حسین کے افسانوں میں ذیلی موضوعات بھی دیکھنے کو ملتے ہیں جو اُن کے گہرے سماجی شعور کو پرکھنے میں مدد دیتے ہیں۔افسانہ "جھولی" میں ایک اور معاشرتی رویہ بھکاری کلچر سے متعلق جو سامنے آیا وہ یہ باہمی محبت اور یگانگت کے ساتھ ساتھ بھائی چارے کا تصور ہر جگہ اور ہر معاشرے میں پایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ حقیر سے حقیر طبقے کے افراد بھی ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں اور دوسروں کی مدد بھی کرتے ہیں جیسے افسانے میں بھکاریوں کے آپس کے مثبت رویے کا ذکر افسانے میں یوں کرتے ہیں۔

"اگر کوئی بھکارن امید سے ہوتی تو دوسری بھکارنیں اچھی اچھی ہڈیاں چن چُن اُس کی جھولی میں ڈال دیتیں۔"۸۸؎ وقت کی چمک دمک ایک سی نہیں رہتی۔ آج انسان تندرست و توانا دولت کے نشے میں چور دوسروں کے احساس کرنے سے اگر عاری نظر آتا ہے تو کل وہی شخص مجبور ہو جاتا ہے۔ اور انھی لوگوں کے سامنے بے بسی کا اظہار بھی کرتا ہے۔اور یوں ایک نہ ایک دن اُسے اپنی شکست تسلیم کرنا پڑتی ہے۔ جیسے افسانے میں استاد مودی اپنے تجربات اور انا پرستی کے ہاتھوں مجبور اپنے بیٹے کو کیا دوسرے لوگوں کی باتوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا لیکن جوانی کے ڈھلنے کے بعد وہی اپنا کاروبار اور متاع کو اپنے بیٹے کو سونپ دینے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اُسے اپنی انا اور خودداری کا گلا خود اپنے ہاتھوں سے گھونٹنا پڑ جاتا ہے۔ انسان کو یہ اٹل حقیقت بھی نہیں بھلانی چاہیے کہ اسے ایک نہ ایک دن خاک ہونا ہے۔یہ ایک عام معاشرتی رویہ ہے کہ انسان بڑھاپے میں پہنچ کر بقاء کی منزل کے سفر کا سامان تیار کرنا شروع کر دیتا ہے اور بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھنے کے ساتھ ہی اُسے مستقبل کے اندیشے تنگ کرنا شروع کر دیتے ہیں جیسے استاد مودی نے سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

> "استاد مودی سوچنے لگا کہ اب اس کی اپنی جوانی بھی تو ڈھل گئی ہے۔ تر و تازگی سمٹ کر جھریوں میں تبدیل ہو گئی ہے۔ وہ باسی ہو گیا ہے۔ اب وہ مر جائے گا۔ کوچ سے پہلے وہ اپنے سینے کے راز فخری کے سینے میں منتقل کر دینا چاہتا تھا۔"۸۹؎

عام معاشرتی رویہ ہے کہ جس کے پاس دولت ہو وہ ہر طرح کے مسائل سے نبرد آزما ہو سکتا ہے۔ ہر طرح کے معاشرے میں روپے پیسے کو ہی طاقت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ جیسے استاد مودی اپنے بیٹے کو نصیحت کرتا ہے کہ اگر وہ مالدار نہ ہوتا اس کا نام بھی معززین کی فہرست میں نہ ہوتا۔ مالدار شخص بے شک پڑھا لکھا نہ ہو لیکن وہ دولت کے بل بوتے پر پڑھے لکھے لوگوں میں اپنا مقام بنالیتا ہے۔

صادق حسین نے انسانی رویوں کے ساتھ ساتھ دونسلوں کی سوچ میں تضاد کو بھی نشانہ بنایا۔ اور یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ نئی نسل اپنے والدین کی نسبت زیادہ سمجھدار اور ذہین ہے اور بڑوں کے مقابلے میں بعض اوقات اُن میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔ استاد مودی ماہر، تجربہ کار اور انا پرستی کے خول میں رہنے والا اپنے فیصلوں کو اٹل سمجھتا ہے اور بیٹے کو ناسمجھ سمجھ کر اُس کے فیصلوں کو اہمیت نہیں دیتا۔ لیکن بالا آخر وقت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہتھیار ڈال دیتا ہے اور بیٹے کی باتوں اور فیصلوں پر خوشی کا اظہار کرتا ہے یہاں یہ نکتہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اجتماعی طاقت کے بل بوتے پر انسان اپنے بہت سے مسائل کا حل تلاش کر سکتا ہے اور انقلابات بھی لا سکتا ہے۔ جیسے افسانے میں بیکری میں کام کرنے والے ملازمین مل کر مطالبات کرتے ہیں اور اپنی تنخواہ میں اضافے کے لیے مالکان کے سامنے مطمع نظر بیان کر کے انہیں لاجواب کر دیتے ہیں یہاں تک کہ ان کے مالک ان کی تنخواہوں میں اضافہ کر دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

مجموعی طور پر یہ افسانہ متوسط طبقے کے ساتھ ساتھ بھکاریوں کے رہن سہن اور طرزِ زندگی کے علاوہ کاروباری لوگوں کی زندگیوں کی عکاسی کرنے والا بہترین افسانہ ہے جو صادق حسین کے سماجی شعور کو ہر پہلو سے نمایاں کرتا ہے۔

افسانہ " خون کا معبد "۱۹۷۳ء میں پنجاب بورڈ کے میٹرک کے کورس میں شامل کیا گیا۔ فرض شناسی، اور جذبہ حب الوطنی اس افسانے کے موضوع ہیں۔ صادق حسین نے اس افسانے میں ایک فرض شناس خاندان کا ذکر کیا ہے جن کی تین نسلوں نے وطن کی بقاء اور سالمیت کے لیے خون کا نذرانہ پیش کیا۔ اس موضوع پر بات کرتے ہوئے انھوں نے فرض شناس اور حب الوطنی کے جذبے سے سرشار خاندان کی نفسیات اور اُن کے احساسات کی بڑی خوبصورتی سے ترجمانی کی ہے۔ اس خاندان سے تعلق رکھنے والے تمام افراد وطن کے دفاع کی خاطر جانوں کا نذرانہ پیش کرنے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ کیونکہ اُن کا مقصدِ حیات ہی وطن کی بقا اور سالمیت ہے۔ جیسے اس افسانے میں محاذِ جنگ پر بیٹے کو بھیجتے وقت ماں جی کی آنکھوں میں چمک کا آنا اس بات کی تصدیق کرتا ہے۔ کہ وہ اپنے بیٹے کو وطن کے نام پر قربان کر دینے کے لیے نہ صرف آمادہ ہیں بلکہ اس پر انہیں فخر بھی ہے اور اطمینان بھی وہ اس آس کے ساتھ بیٹے کو رخصت کرتی ہیں کہ وہ شہید ہو کر لوٹے گا۔

> "جب آفتاب محاذِ پر گیا تھا اس وقت ماں جی کی آنکھوں میں ایک چمک سی آگئی تھی۔ ماں جی نے کہا تھا: میرا سسر ایک سپاہی تھا اور میرا خاوند بھی۔ اب میرا بیٹا آفتاب بھی ایک سپاہی ہے۔ میرے سسر نے سینے میں گولی کھائی تھی اور میرے خاوند نے بھی۔"۹۰

یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان کی شخصیت پر اسکی تربیت کی گہری چھاپ ہوتی ہے جیسا ماحول ہو گا ویسے ہی افرادِ معاشرہ کی شخصی نشوونما ہو گی۔ اس کے علاوہ خاندانی تربیت بھی فرد کی شخصیت کو بنانے اور بگاڑنے میں اہم کردار ادا

کرتی ہے۔ شہاب کے خاندان کا کلچر بھی ایسا کلچر ہے جہاں وطن کی خاطر جان قربان کرنے کو سرمایہ افتخار سمجھا جاتا ہے۔ لہذا نسل در نسل اُن کی تربیت اور خون میں یہ بات شامل ہو گئی تھی کہ ہمارا مقصد زندگی صرف دین کی سرفرازی اور دفاع مملکت کے لیے جان کا نذرانہ پیش کرنا ہے۔ اور بلاشبہ یہ خاندانی تربیت اور ولولے کا اثر تھا کہ اس خاندان کے ہر فرد نے اپنے آپ کو وطن کی مٹی پر قربان کیا۔ اور افسانے کے آخر میں شہاب کا ایسی کھیلوں اور سرگرمیوں میں مگن ہونا اس بات کا ثبوت دیتا ہے کی اس کی پرورش ایک عسکری خاندان میں ہوئی۔ اور وطن کے دفاع کا جذبہ اسے گھٹی میں ملا۔ "دونوں ساس بہو درخت کے پیچھے پہنچیں تو دیکھا کہ شہاب کی چھروں والی بندوق درخت کے پاس پڑی ہے اور وہ خود کھرپی سے مٹی کھود رہا ہے۔ "۹۱ اور جب وہ دونوں شہاب سے دریافت کرتی ہیں کہ یہ کیا کر رہے ہو تو وہ جواب دیتا ہے کہ میں مورچہ کھود رہا ہوں۔ رخشندہ (شہاب کی ماں) اس کے اس جواب پر ہکا بکا رہ جاتی ہے۔ جب اس کا چھوٹا سی بیٹا اپنے دل کی بات کر جاتا ہے۔ "اس مورچے میں بیٹھ کر میں اپنے ملک کی سرحدوں کی حفاظت کروں گا۔" ۹۲ جبکہ اس کی دادی دل ہی دل میں خوش ہوتی ہے کہ ان کے پوتے نے بھی خاندان کی لاج رکھی ہے اور وہ بھی اپنے باپ، دادا اور پردادا کی طرح شہادت پائے گا اور اس خاندان کے وقار میں اضافہ کرے گا کیونکہ اس خاندان نے نسل در نسل شہادت کا رتبہ پا کر وطن کی لاج رکھی تھی۔ "ماں جی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ان کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ "۹۳

صادق حسین نے شہادت کو موضوع بنا کر ہمیں ہمارے مقاصدِ زندگی سے آگاہی دلائی ہے اور واضح کیا کہ شہیدوں کا لہو ہی در حقیقت کسی بھی ملک و ملت کو حیاتِ جاودانی عطا کرتا ہے۔

صادق حسین نے اپنے افسانوی موضوعات اور کرداروں کے ذریعے مختلف سماجی عناصر کو مختلف پیرائے میں بیان کیا ہے اور یہی ان کی فنکارانہ دسترس کا منہ بولتا ثبوت ہے وہ سماج سے جڑے تمام رشتوں اور عناصر کے علاوہ تمام جزئیات کو کامیابی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ سماجی اقدار، روایات، تہذیب، زبان و ادب، اخلاقیات، فنون دفاع، تحفظ، طمانیت، حقوق العباد کے علاوہ انسانی اور سماجی رویوں، اور جذبات کو اپنے افسانوی موضوعات میں سمیٹنے میں اچھے خاصے کامیاب رہے ہیں۔

اس افسانے کے ذریعے انھوں نے واضح کیا ہے کہ کسی بھی سماج میں دفاع، تحفظ اور آزادی وہ بنیادی عوامل ہیں جو باہم مل کر پر سکون اور پر امن سماجی زندگی کی تشکیل میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اس لیے افسانہ ''خون کا معبد'' کا موضوع خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ہماری بنیادی ضروریات میں تحفظ اور آزادی شامل ہیں جس کے بغیر کامیاب معاشرتی زندگی کا تصور ممکن نہیں۔ اور تحفظ اور آزادی کا حصول دفاع اور جذبہ جہاد کے ذریعے ممکن ہوتا ہے۔

کوئی بھی معاشرہ حب الوطنی کے جذبات سے عاری نہیں ہوتا۔ چھوٹی چھوٹی بستیوں اور کالونیوں میں رہنے والے افراد بھی اپنے تحفظ کے لیے دفاعی اقدامات کرتے ہیں۔

"خون کا معبد" کا مطلب ہی خون کی عبادت یا خون کے ذریعے عبادت کرنا ہے۔ کوئی بھی معاشرہ ہو مملکت اُسے قائم ہونے اور رہنے کے لیے شہیدوں کے خون کی ضرورت پڑتی ہے یہ بڑے حوصلے اور دل گردے کا صبر آزما کام ہے۔ لیکن تاریخ اس بات کی شاید رہی ہے کہ قوموں نے اپنی بقاء اور دین کی حفاظت کے لیے جانوں کے نذرانے پیش کیے۔ اسی طرح ہماری دھرتی، ہمارے وطن پاکستان کا حصول بھی لاکھوں جانوں کی قربانیوں کے بعد ممکن ہوا۔ اور وقتاً فوقتاً اس دھرتی کو شہیدوں کے خون سے سیراب کرنا پڑتا ہے۔ صادق حسین اس افسانے میں دفاعِ وطن کے حوالے سے قوم کے جذبات کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ سپردِ قلم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

" دشمن " کا موضوع "محبت" ہے دیہاتی ماحول میں دو دلوں کے اندر پرورش پانے والی محبت کی داستان ہی اس افسانے کا موضوع ہے۔ اس افسانے میں تمام معاشرتی اقدار و روایات اور اُصولوں کے آگے محبت کی فتح اور جیت ہوتی دکھائی گئی ہے۔ اس افسانے کا موضوع روایتی ہے لیکن اس افسانے کے ذریعے صادق حسین نے دیہاتی زندگی کے امور اور طرزِ معاشرت کے حوالے سے چند اور پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا جو اُن کے گہرے سماجی شعور کے ساتھ ساتھ ان کی پختہ سوچ کی ترجمانی کرتا ہے۔

صادق حسین نے اس افسانے میں یہ واضح کیا کہ دیہاتی لوگوں میں انتقامی کاروائیاں ہمیشہ عروج پر ہوتی ہیں۔ اور ان دیہاتیوں کے درمیان جنم لینے والی باہمی دشمنیاں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتی رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ دیہاتی لوگ باہمی دشمنی اور عناد کو ذاتی مسئلہ سمجھ کر خود ہی حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور قانون کو ہاتھ میں لینا شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔

> "راجپوت اور جاٹ تھانے میں رپٹ درج کرانے میں اپنی ہتک سمجھتے تھے۔ جب ان میں سے لڑتے لڑتے کوئی مر جاتا تو وہ اسے نہایت احترام سے دفن کرتے۔ اُس کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے قرآن خوانی کی جاتی۔ دیگیں پکا کر چالیسواں کرتے۔ پھر قسم کھاتے کہ انتقام لیا جائے گا۔" ۹۴

اس کے علاوہ صادق حسین نے دور زماں کے ساتھ دیہاتیوں کے رویوں اور روایات کے حوالے سے تبدیلیوں کا ذکر بھی اس افسانے میں کیا ہے۔ بدلتے وقت کے ساتھ تقاضے بھی بدل جاتے ہیں۔ موجودہ نسل اپنے آباواجداد کی نسبت روایات کی پاسداری کرنے میں ناکام رہتی ہے اور اس حوالے سے بزرگوں کو طرح طرح کے اندیشے پریشان کرتے ہیں۔ " کیا زمانہ بدلا ہے آج کل تو ہر چیز میں ملاوٹ ہے خالص گھی ملتا ہے نہ کھرا انسان۔ ان

چھو کروں کا کیا اعتبار ہم مر گئے تو پھر انتقام کون لے گا۔"۹۵؎اس حوالے سے دیکھا جائے تو صادق حسین معاشرتی خرابیوں پر تنقیدی نگاہ رکھتے ہیں۔

دیہاتی طرزِ بودوباش اور معاشرتی نظام کا ذکر کرتے ہوئے صادق حسین لکھتے ہیں کہ دیہاتی لوگوں کا اعتقادات و توہمات پر بہت یقین ہوتا ہے۔ جیسے بلیوں کے رونے کو نحوست کی علامت سمجھا جاتا ہے۔اُن کے نزدیک بلیوں کا رونا بستیوں کے اجڑنے کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔" بے جی کہا کرتی تھیں بلیوں کو رونا بستی کے اجڑنے کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔"۹۶؎صادق حسین نے دیہاتیوں کے حوالے سے ایک اوراہم بات واضح کی ہے کہ یہ لوگ خود دار اور انا پرست ہوتے ہیں۔ روایات کو برقرار رکھنے کے لیے انہیں چاہے کتنی بڑی قربانی کیوں نہ دینی پڑے وہ اس سے دریغ نہیں کرتے۔

لیکن محبت وہ واحد جذبہ ہے۔ جس کے آگے انسان بے بس ہو جاتا ہے۔اور باہمی دشمنیوں اور عناد کو ختم کرنے میں مدد کرتا ہے۔ جیسے افسانے میں شیرے کا تعلق راجپوت خاندان سے ہوتا ہے۔اور راجپوتوں کے خون میں یہ بات شامل ہے کہ انہوں نے دوسرے کے آگے جھکنا نہیں سیکھا لیکن "شیرا "اپنی محبت چھیماں کے لیے ہتھیار پھینک دیتا ہے۔اور چھیماں جو باپ کی محبت میں اُس کے دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے نکلتی ہے اپنی محبت کے آگے مجبور ہو کر بندوق پھینک دیتی ہے اور بستی کی طرف چلی جاتی ہے۔افسانے کا موضوع رومانویت کے گرد گھومتا ہے اور یہ روایتی موضوع ہے۔ جس میں مصنف نے فلمی انداز اختیار کر کے محبت کی فتح کا علم لہرایا ہے۔

"بابو رفیق" صادق حسین کے دوسرے افسانوی مجموعے شہر اندر شہر کا مشہور افسانہ ہے جس میں انہوں نے نہ صرف گورنمنٹ کے تنخواہ دار ملازم کو موضوع بنا کر ان کے مسائل کو سامنے لایا ہے بلکہ اُن کا موازنہ دیگر پیشوں سے تعلق رکھنے والے افراد سے بھی کیا ہے۔

صادق حسین نے نچلے متوسط طبقے کی مشکلات کی نشاندہی کرتے ہوئے حکومت پر کڑی تنقید بھی کی ہے کہ حکومت قومی تہواروں کو بڑے اہتمام اور جوش و خروش سے مناتی ہے اور بے دریغ پیسہ خرچ کرتی لیکن رعایا کی خوشحالی اور بہتری کی طرف توجہ نہیں دیتی جسکی وجہ سے عوام شکستہ حالی کا شکار ہو کر ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کو بہت جلد گنوادیتی ہے۔ صادق حسین نے تنخواہ دار ملازمین کی زندگیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ اُن کی تنخواہ روزمرہ کے معمولات زندگی کو پورا کرنے کے لیے ناکافی ہوتی ہے۔ لہذا انہیں اخراجات کو پورا کرنے کے لیے قرضہ جات کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ بابو رفیق کی زندگی بھی انھی مشکلات کے گرد گھومتی ہے نہ وہ اچھا کھا سکتا ہے اور نہ اچھا پہن سکتا ہے۔ اسکی

خستہ حالی سے اس کے محلے دار اچھی طرح سے آگاہ ہیں اور اسے مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اُن کی طرح ذاتی کام کرنے کو ترجیح کیوں نہیں دیتا؟

"بابو رفیق تو صرف ایک کام جانتا تھا۔ وقت پر دفتر جاؤ قلم گھسیٹتے رہو۔ ہر ماہ کی پہلی تاریخ تنخواہ وصول کر کے قرض ادا کرو۔ لیکن اس مہنگائی کے زمانے میں محدود آمدنی سے میاں بیوی کی بنیادی ضرورتیں بھی پوری نہیں ہوتی تھیں۔ حالات کی یہ صورت بھانپ کر جیرا پہلوان نے بابو رفیق کو مشورہ دیا: باؤ جی! چھوڑو یہ نوکری ، ریڑھی لگا لو۔ مزے میں رہو گے۔"۹۷

افسانہ بابو رفیق میں انہوں نے گورنمنٹ کے ملازمین کے حالات زندگی پر نہ صرف رشنی ڈالی ہے بلکہ نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے دیگر افراد کے حالات زندگی کو بھی بیان کیا ہے۔ درحقیقت ان افراد کا ذکر کر کے صادق حسین نے ایک عام کاروباری آدمی اور ایک تنخواہ دار ملازم کا موازنہ کیا ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ ماہوار تنخواہ کی نوکری کی نسبت ذاتی کام چاہے جس نوعیت کا بھی ہو فائدہ مند رہتا ہے۔ اس سے کم از کم پورا مہینہ روپے پیسے کے لیے انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ اور نہ دوسروں کا دستِ نگر بننا پڑتا ہے۔ تنخواہ دار ملازمین کی نسبت ریڑھی چھابڑی لگانے والے یا ذاتی طور پر چھوٹا موٹا کام کرنے والے بھی خوشحال زندگی بسر کرتے ہیں چاہے وہ دھوبی ہو یا گداگر یا پھر قصاب اُن کے پاس ہر وقت روپے پیسے کی ریل پیل رہتی ہے۔ افسانے میں صادق حسین اس بات کی وضاحت یوں کرتے ہیں۔

"دتا کنجڑا بولا: میرے بادشاہو! کام وہ کرو کہ شام کو اُٹھو تو کڑک نوٹ گن کر شلوار کے نیفے میں اُڑس اور پھر خوب کھاؤ پیو اور جان بناؤ۔"۹۸ صادق حسین کے افسانوں کے بیشتر موضوعات نچلے متوسط طبقے کے گرد گھومتے ہیں لیکن ان کے افسانوں میں جا بجا اصلاحی پہلو بھی نمایاں نظر آتا ہے۔

بعض اوقات وہ ضمنی کرداروں کا حوالہ دے کر ایسے جملے کہہ جاتے ہیں کہ قاری اُن کی وسیع النظری کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی مصلح یا فلاسفر اپنے مخصوص انداز میں معاشرے کی اصلاح کر رہا ہو۔ ان کا انداز بعض جگہوں پر خالصتاً حکیمانہ اور فلسفیانہ روپ اختیار کر جاتا ہے۔ مثلاً "ایک دن دھوپ چھاؤں کی بات چل نکلی تو گلی کے ایک بزرگ نے کہا: جیرا پہلوان! باہر کی دھوپ چھاؤں تو کچھ بھی نہیں، اندر کی فکر کرو۔"۹۹

صادق حسین نے اس افسانے میں مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے افراد کا ذکر کر کے یہ بھی واضح کیا ہے کہ معاشرتی عوامل میں زبان، تہذیب و ثقافت کے ساتھ ساتھ ذریعہ روزگار اور معاش کو بھی بنیادی حیثیت حاصل ہے جس کے بغیر کامیاب معاشرتی زندگی کا تصور کرنا بھی ممکن نہیں۔

اس کے علاوہ انھوں نے نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کی افکار اور سماجی رویوں پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ کس طرح وہ حاضر دماغی اور چالاکیوں کے ذریعے ہیرا پھیری اور ملاوٹ کرتے ہیں۔ اور اپنے ایمان کو چند روپوں کے

عوض فروخت کر دیتے ہیں۔ اسکی ایک وجہ جہالت اور تعلیم کی کمی بھی ہے مثلاً" مھاجا قصاب تازہ گوشت میں دوچار باسی گوشت کے ٹکڑے اس صفائی سے ملاتا ہے کہ کسی کو پتا نہیں چلتا۔ "اور اپنی اس ہوشیاری پر وہ دل ہی دل میں خوشی محسوس کرتا ہے۔ اور بابو رفیق ان لوگوں کی ہیرا پھیریوں پر دنگ رہ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ جب اُسے جیرا پہلوان ملاوٹ کے گر بڑے فخر سے بتاتا ہے تو بابو رفیق کو اس کی باتوں سے نفرت محسوس ہوتی ہے۔ "جیرے پہلوان نے بابو رفیق کو ریڑھی پر پھل سجانے، ڈنڈی مارنے اور گاہک سے آنکھ بچا، گلے سڑے میوے لفافے میں ڈال دینے کے گر بتائے۔ "ان تمام باتوں سے ایک ان پڑھ اور پڑھے لکھے فرد کی سوچ کا تضاد سامنے آتا ہے۔ صادق حسین نے یہی نکتہ اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ پڑھے لکھے افراد کی سوچ بھی مثبت ہوتی ہے اور وہ ہیرا پھیریوں سے دور رہتے ہیں۔ جبکہ ان پڑھ لوگوں کے ذہن شیطانی ہوتے ہیں اور اُس طرح باریکی سے نہیں سوچ سکتے جسطرح پڑھے لکھے افراد سوچتے ہیں۔ پڑھے لکھے اور ان پڑھ افراد کی سوچوں میں تضاد ہوتا ہے۔ افسانے کی آخری سطور توجہ طلب ہیں۔ جب توپوں کی آواز پر استاد کرچھی بابو رفیق سے پوچھتا ہے کہ یہ آوازیں کیسی ہیں تو بابو رفیق اسے بتاتا ہے۔ "آج کے دن ہم آزاد ہوئے تھے، ہماری قوم یوم آزادی منا رہی ہے۔ "١٠٠افسانے کی آخری سطور میں صادق حسین نے واضح کیا ہے کہ ہمارے لیے یہ افسوس کا مقام ہے کہ ہم آزاد ہو کر بھی غلام ہیں۔ اور غربت اور تنگدستی کے قیدی ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستانی حکومت پر تنقید کرتے ہوئے انہوں یہ بھی واضح کیا ہے کہ حکومت حکومتی معاملات پر بے دریغ روپیہ خرچ کرتی ہے لیکن عوامی مسائل سے بے اعتنائی برتتی ہے۔ اور اُن کی ضروریات اور مسائل پر توجہ نہیں دیتی۔ یہ ہمارے لیے افسوس کا مقام ہے۔ یہاں ان کا انداز خالصتاً" ناقدانہ روپ اختیار کر جاتا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ معاشرتی باریکیوں کو مشاہداتی عینک کے ساتھ دیکھنے کے قائل ہیں۔

افسانہ ''حمید اکڑیل'' موضوع کے اعتبار سے غربت اور افلاس زدہ معاشرے کا عکس پیش کرتا ہے۔ اور قاری کی توجہ معاشرے کے ان افراد کی جانب مبذول کرتا ہے جو ساری زندگی غربت کی چکی میں پستے ہوئے گزار دیتے ہیں۔ اور محنت اور جفاکشی ان کا مقدر بن جاتی ہے لیکن معاشرہ ان کی شکستہ حالی پر نہ نوحہ کناں ہوتا ہے اور نہ ماتم کرتا ہے بلکہ اُلٹا ان مجبور اور بے بس لوگوں کی زندگیوں کا خراج وصول کرتا ہے۔ صادق حسین نے معاشرتی ناہمواریوں اور سفاکیوں کو موضوع بنا کر ہمیں مفلوک الحال طبقے سے تعلق رکھنے والے فرد کی زندگی میں آنے والی مشکلات کو بیان کیا ہے۔ جو مفلسی کے ہاتھوں تنگ آکر گاؤں کی زندگی کو صرف اس لیے خیر باد کہہ دیتا ہے کہ شہر کی زندگی میں اسے بہتر روزگار کے مواقع میسر ہوں گے لیکن قسمت کی ستم ظریفی شہر آکر بھی دردر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد بھی بے روزگاری اس کا نصیب ٹھہرتی ہے تو مجبوراً وہ اپنا خون بیچ کر اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرتا ہے جبکہ اس کا دوست شرفو

بھیک مانگ کر گزر اوقات کرتا ہے۔" ایمان کی تو یہ ہے کہ اس شہر میں در در پھرے، ساہو کاروں کے دروازے کھٹکھٹائے، ہر طرف سے دھتکار ملی۔"۱۰۱

نچلے متوسط طبقے میں غربت ہمیشہ سے ہی مسئلہ بنی رہی ہے اور نفسا نفسی کے اس سفاک دور میں انسانیت تمام احساسات سے عاری ہے۔ جہاں پر دوسروں کی تکالیف اور درد کو محسوس کرنے والے لوگوں کی کمی ہے۔ خالی وہی لوگ دکھ اور غم کو محسوس کر سکتے ہیں یا دردِ دل رکھتے ہیں جن کی اپنی زندگی بے چینیوں، اضطراب بھوک، افلاس اور دکھوں کی نذر ہوئی ہوتی ہے۔ جیسے حمید اکڑیل ان دکھوں سے واقف ہے اور لاشعوری طور پر یہ لفظ "دکھ" سے نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ اور اس کا بار بار یہ کہنا کہ "دکھ کچھ نہیں ہوتا میں اسے فنا کر دوں گا۔"۱۰۲ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ اسکی اپنی زندگی درد و غم میں بسر ہوئی۔ اس کے علاوہ اسکے کچھ جملے اسکی نفسیات سے آگاہی بھی دلاتے ہیں۔ صادق حسین انسان دوست ہونے کے ناتے، انسانی نفسیات سے بخوبی آشنا ہیں اور اسے مکمل فنی باریکیوں کے ساتھ بیان کرنے پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ بعض اوقات انسان کچھ باتوں پر غیر معمولی رد عمل کا اظہار کرتا ہے تو اس کے اس رد عمل اور رویے کے پیچھے بھی کوئی محرک چھپا ہوتا ہے۔ جس نے اس کی شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کئے ہوتے ہیں۔ اور اس وجہ سے وہ ایسا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جیسے افسانے میں حمید اکڑیل لفظ "دکھ" سے اس لیے نفرت کرتا ہے کیونکہ اسکی ماں نانی اور پرنانی نے دکھی زندگی گزاری۔ "اس کی ماں کہتی! بیٹا دکھی ہوں، تیری نانی بھی دکھی تھی اور پرنانی بھی۔"۱۰۳

اس افسانے کا موضوع صادق حسین کے پہلے افسانوی مجموعے "پھولوں کے محل" کے افسانے "دو چھٹانک چاول" اور پریم چند کے افسانے "کفن" سے ملتا ہے جہاں غربت و افلاس کے ہاتھوں مجبور حمید اکڑیل خون بیچنا شروع کر دیتا ہے یہاں تک کہ اسکی صحت جواب دے جاتی ہے۔ اور وہ موت کے منہ میں چلا جاتا ہے جبکہ اس کا دوست "شرفو" بھیک مانگ کر بھی اپنے دوست کی جان نہیں بچا سکتا۔

اس افسانے میں صادق حسین نے سماجی زندگی کے بے رحم حقائق سے پردہ اُٹھایا ہے اور انسان کو ان تمام پہلوؤں پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی ہے۔ جن پر ایک عام انسانی آنکھ وہ نگاہ ڈالنے سے محروم نظر آتی ہے۔ جسکی وسعت اور گہرائی سے صادق حسین آشنا اور واقف ہیں۔

صادق حسین نے اس افسانے میں ایک اور اہم بات معاشرتی زندگی کے حوالے سے بیان کی ہے کہ اس دنیا میں کوئی بھی کام آسان نہیں ہوتا۔ بظاہر ہم بہت سارے کاموں کو سہل جانتے ہیں لیکن ان چیزوں اور بستیوں سے وابستہ لوگ ہی اصل حقیقت سے آشنا ہوتے ہیں۔ یہ عام معاشرتی رویہ سمجھا جاتا ہے کہ بھیک اور گداگری سے زیادہ

کوئی کام آسان نہیں لیکن صادق حسین نے افسانوی کردار شرفو کی زبانی اس پیشے کی مشکلات کو بہت خوبصورت انداز میں اس طرح بیان کیا ہے۔

"تم سمجھتے ہو میرا پیشہ آسان ہے پتلیاں چڑھا کر پپوٹوں تلے غائب کر دینا۔ سفیدی نمایاں کیے دن بھر آواز لگانا، بچوں کا کھیل نہیں۔ جب آنکھیں تھک جاتی ہیں تو میں چادر سے منہ ڈھانپ لیتا ہوں۔ گھڑی دو گھڑی کے لیے اڈا چھوڑنا پڑے تو راستہ ٹٹول کر چلتا ہوں۔ بعض اوقات مجھے یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے میں سچ مچ اندھا ہو گیا ہوں رات کے اندھیرے میں آنکھیں کھول کر دیکھتا ہوں تو یہ دنیا عجیب سی لگتی ہے۔"۱۰۴

"انسان" افسانے کا موضوع بہت حساس اور پیچیدہ ہے۔ اس افسانے کے ذریعے صادق حسین نے غربت کے ہاتھوں انسان کی تذلیل کو نہ صرف موضوع میں جگہ دی ہے بلکہ استحصالی معاشرے میں احساسات سے عاری انسانوں کے رویوں کا بھی ذکر کیا ہے جو ستم گزیدہ اور مفلوک الحال طبقے کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر انہیں اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

صادق حسین نے اس افسانے میں مہذب سماج کی ظاہر داریوں اور کھوکھلے پن پر کڑا طنز کیا ہے جہاں انسانی ہمدردی کے جذبات کا فقدان ہے وہ اس معاشرے کی بات کرتے ہیں جہاں معاشی طور پر عدم استحکام کے شکار افراد ہی اپنی عزت و ناموس کے ساتھ ساتھ اپنی خودداری اور غیرت و حمیت کو بھی فروخت کر دیتے ہیں۔ یہ افسانہ مہذب معاشرے کے اندر انسانی اقدار کے فقدان کی عمدہ مثال ہے۔ صادق حسین نے یہ باور کروایا ہے کہ سماجی طور پر غیر منصفانہ رویے اور مسلسل حق تلفیاں انسان کی شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہیں۔ یہی سماجی رویے انسانی کی شخصیت کی تکمیل میں بھی کرتے ہیں اور یہی انسان کی شخصیت کی تذلیل و تردید بھی کرتے ہیں۔ صادق حسین نے بتایا ہے کہ ہمارے معاشرے میں اصلاحی پہلوؤں کا فقدان ہے۔ اگر اس مہذب سماج سے تعلق رکھنے والا کوئی بھی ایک فرد انسانی ہمدردی کے تحت منگو کی اصلاح کرتا یا اس کے ساتھ محبت کا برتاؤ کرتا تو اسکی شخصیت یوں شکست و ریخت کا شکار نہ ہوتی۔

"کنواریاں اسے دیکھتیں تو انہیں متلی ہونے لگتی۔ تیلی اسے دیکھ کر تھوک دیتے۔ بڑے بوڑھے اس جانور پر لعنت بھیجتے، مسجد کا امام اسکے وجود کو مکروہ قرار دے کر استغفار پڑھتا۔ لیکن گاؤں والے حیران تھے کہ سنگاپوری خان نے کیسے منگو کو اپنے ہاں ملازم رکھ لیا ہے۔"۱۰۵

لیکن استحصالی معاشرے میں دولت اور طاقت کو ہی سب کچھ سمجھا جاتا ہے اور ایسے معاشرے میں غریب اور مفلوک الحال انسان کو لوگ انہیں صحیح مقام دینے سے عاری ہوتے ہیں۔ ذات کی نفی اور ٹھکرائے جانے کا احساس بہت شدید ہوتا ہے انسان چاہے جیسا بھی ہو اونچے طبقے سے تعلق رکھتا ہو یا غریب طبقے سے اسے اپنی خودی عزیز ہوتی ہے اور

وہ اپنی ذات کی نفی کو بالکل پسند نہیں کرتا جبکہ ظالم سماج غریب اور بے بس لوگوں کی تمام صلاحیتوں کو کچل دیتا ہے۔ لیکن یہی ٹھکرائے جانے کا احساس جب الاؤ بن کر منگو جیسے افراد کے سینے میں سلگتا ہے تو اپنا تزکیہ بھی چاہتا ہے۔ اور انسانی نفسیات کا تقاضا بھی یہی ہے انسان اپنے اوپر ہونے والے ظلم و ستم کا جب تک بدلہ نہ لے اُسے سکون نہیں ملتا۔ منگو چونکہ بے بس اور مجبور شخص ہے اور انسانوں کے اندر اسکی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ اس لیے انسانوں سے بدلہ نہیں لے سکتا لہذا وہ کیتھارس Catharsis کرنے کے لیے کتوں پر گرجتا ہے۔ اور روزانہ قصاب کی دکان کے باہر تھڑے پر بیٹھ کر خود کو سنگاپوری خان تصور کر کے کتوں پر حکم چلاتا ہے اور ایسا کرنے سے اُسے یک گونہ طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔

> ''منگو جب قصاب کی دکان کے تھڑے پر کتوں کے درمیان بیٹھ جاتا تو اس گردن کی رگیں تن جاتیں، سینہ اُبھر آتا۔ اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ آنا فاناً سنگاپوری خان بن گیا ہو۔ وہ چھجے کے کھمبے کو گاؤ تکیہ تصور کر کے اس سے ٹیک لگالیتا۔ اور پھر یکایک گرج کر کہتا۔'' ابے او کتے! چلم بھر لا'' جب منگو وہاں سے اُٹھ کر اپنی کوٹھڑی میں پہنچتا تو اسے ایک گونہ راحت کا احساس ہوتا۔''۱۰۶

صادق حسین نے اس افسانے میں انسانیت کی تذلیل اور معاشرے کی بے حسی پر گہری چوٹ لگائی ہے۔ افسانے کی اختتامی سطور زیادہ توجہ طلب ہیں جو قاری کے ذہن پر گہرے نقوش ثبت کرتی ہیں۔ جب گاؤں کے سارے لوگ اپنی جان بچانے کے لیے گولوں کی برسات سے بچتے بچاتے بھاگتے ہیں تو اس وقت منگو حالات کی ستم ظریفی پر قہقہے لگاتا ہے۔ ''وہ جانتا تھا کہ توپ کے ایک گولے پر کتنی لاگت آتی ہے۔ اس نے سوچا کہ منگو کو مارنے کے لیے کوئی بھی اتنے روپے ضائع نہیں کر سکتا۔'' ۱۰۷ یہی وہ مقام ہے جہاں صادق حسین انسانی سوچ کے دریچوں کو کھولا ہے۔ بے رحم اور سفاک معاشرہ غریبوں کی اس قدر تضحیک کرتا ہے کہ انکی شخصیت کے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اپنی کم مائیگی کا احساس ان سے اُن کی پہچان ہی ختم کرا دیتا ہے۔ منگو کی شخصیت کی اس حد تک پامالی ہو چکی ہوتی ہے کہ اب وہ اپنے آپ کو اس قابل بھی نہیں سمجھتا کہ اسے مارنے کی غرض سے کوئی اس پر ہزاروں روپے کا بارود بھی خرچ کرے گا۔

صادق حسین نے واضح کیا کہ ہمارے ہاں غربت کو جرم تصور کیا جاتا ہے۔ اور انسان کا سب سے بڑا عیب بھی یہی غربت ہے اور یہی جرم اور عیب انسان کو انسانیت کے مقام سے خارج کر دیتا ہے۔ یہاں صادق حسین مہذب سماج سے تعلق رکھنے والے افراد کے رویوں پر کڑا طنز کرتے نظر آتے ہیں اور یہاں اُن کا انداز اصلاحی اور تنقیدی شکل اختیار کر کے معاشرے کے افراد کی سوچ کو بیدار کرنے کا سبب بھی بنتا نظر آتا ہے۔ جو معاشرے کی ستم ظریفیوں پر نہ صرف نوحہ کناں ہیں بلکہ مصلح کی صورت میں وہ سماجی بیداری کا درس بھی دیتے ہیں۔

افسانے "انسان" میں صادق حسین نے سماجی سطح پر انسانی زندگی کی ناگفتہ بہ صورتحال کو واضح کر کے انسان دوستی، غمگساری، محبت و شفقت اور مساوات و بھائی چارے کی خوش کن روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے انسانی زندگی کے سلگتے معاملات کو اجاگر کر کے سماج کے مفلوک الحال اور ستم گزیدہ طبقے کی احساس محرومی اور کسمپرسی کو بھی واضح کیا ہے۔ یہاں ان کا سماجی شعور بڑا پختہ اور فنی ادارک انتہائی بلندی پر نظر آتا ہے۔ روبینہ کنول افسانہ ''انسان'' کے حوالے سے لکھتی ہیں:

> "بحیثیت مجموعی صادق حسین کا یہ افسانہ ان کی حقیقت نگاری کے سلسلے میں ایک خوبصورت افسانہ ہے۔ اس کو پڑھ کر ایک بے نام سی خلش اور چبھن کا احساس ہوتا ہے۔ اور آگہی کا ایک خوبصورت احساس رگ و پے میں سرایت کرتا محسوس ہوتا ہے۔"۱۰۸

صادق حسین حقیقت پسند افسانہ نگار کی صورت میں جہاں معاشرتی ناہمواریوں کا ذکر کیا ہے وہیں معاشرتی اصلاح کا بیڑا بھی اُٹھایا ہے۔ مذکورہ افسانے میں بھی انھوں نے معاشرے کے حساس پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے حقیقت پسندی کا ثبوت دیا ہے۔

دیہاتی موضوعات پر بہت سے افسانہ نگاروں نے قلم اُٹھایا اور یہ سلسلہ پریم چند کے دور سے لے کر موجودہ دور کے افسانہ نگاروں جیسے منشایاد اور دیگر افسانہ نگاروں تک جاری و ساری ہے۔ لیکن صادق حسین کے افسانے اپنی پیش کش اور تخلیقی احساس کی بنا پر منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ صادق حسین موضوع کے علاوہ ماحول اور دیہاتی نظامِ زندگی پر بھی تجزیاتی نگاہ ڈالتے ہیں۔ صادق حسین کا افسانہ "کرموں" موضوع کے لحاظ سے مکمل طور پر دیہاتی زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس افسانے میں دیہاتی ماحول اور رہن سہن، رسوم و رواج اور سادہ ترین زندگی کو بیان کیا گیا ہے۔ اُن کا یہ افسانہ ان کے باقی افسانوں کی نسبت اس لیے منفرد ہے کہ اس افسانے میں دیہاتی زندگی کے چیدہ چیدہ اور باریک پہلوؤں کو زبان و بیان کی صفائی اور سادگی سے انہوں نے اس طرح بیان کیا ہے کہ قاری کو یہ افسانہ پڑھ کر راحت اور طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔

دیہاتی معاشرت کی تمام تر جزئیات کو وہ مہارت کے ساتھ بیان کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں، اس افسانے میں وہ دیہی معاشرت کو جزئیات اور اکائیوں کے ساتھ مجموعی طور پر عکسبندی کی گئی ہے۔ مثلاً دیہاتی زندگی کی تصویر کشی کرتے ہوئے انھوں نے دیہات کے لوگوں کے رہن سہن، رکھ رکھاؤ، میل جول، رسوم و رواج کے ساتھ ساتھ دیہاتی نوجوانوں کی سرگرمیوں اور فارغ الوقتی کے مشاغل کو بھی بیان کیا۔ دیہاتی نوجوان سارا دن کھیتی باڑی کرتے ہیں اور جانوروں کو چارہ ڈالتے ہیں۔ پھر فارغ وقت میں مل بیٹھ کر قصے کہانیاں سناتے ہیں۔ موجودہ دور میں دیہاتی سماج کے طور اطوار اور طرز زندگی میں بھی اچھا خاصا فرق آچکا ہے۔ آجکل کے دیہاتوں میں تفریح طبع کے ذرائع بھی بدل

چکے ہیں۔ لیکن صادق حسین کے افسانوں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ۸۰ اور ۹۰ کی دہائیوں کے وقت کے دیہاتی سماج کا ذکر کرتے ہیں جہاں ایک روپے کی نیاز بچوں میں بانٹنے کے لیے کافی ہوتی تھی۔ خود صادق حسین کا فنی سفر بھی تو ساٹھ کی دہائی سے شروع ہو ۹۰ کی دہائی پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ لہذا اپنے افسانوں میں انھوں نے اپنے عہد کے سماج کی عکاسی بہت خوبصورت انداز میں کی ہے۔ افسانہ ''کرموں'' میں وہ دیہاتیوں کے مشاغل اور سرگرمیوں کا ذکر میر زمان (افسانے کا مرکزی کردار) کے ذریعے کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"گاؤں میں وہ کبڈی کھیلتا، بھینس کو چارا ڈالتا، دودھ دوہتا، درانتی سے کھڑی فصل اور کھرپے سے گھاس کاٹتا ہل چلاتا، بیج بوتا، شادی بیاہ پر کھڑتالیں بجاتا، سمی کھیلتا، اور رات کے وقت نمبردار کی بیٹھک میں سیف الملوک کے اشعار سُن سُن کر جھوم جھوم جاتا"۱۰۹

عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ دیہاتی سماج سے تعلق رکھنے والے افراد کی آمدنی اور معاش کے ذرائع بہت محدود ہوتے ہیں۔ جن سے ان کے روزمرہ کے معمولاتِ زندگی تو آسانی سے چل سکتے ہیں لیکن اپنی معصوم خواہشات جیسے سونے کے زیور وغیرہ بنانے کے لیے اُن کی آمدنی ناکافی ہوتی ہے اور ایسی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے انھیں طویل مدت درکار ہوتی ہے۔ لہذا وہ اپنی معصومانہ خواہشات اور آرزوؤں کو پورا کرنے کے لیے دیارِ غیر کا رخ کرتے ہیں اور روپیہ پیسہ جمع کرنے میں اپنی عمریں گزار دیتے ہیں۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اُن کی خواہشات کی تکمیل ہونے تک اُن کی آرزوئیں اپنا رنگ بدل چکی ہوتی ہیں۔ جیسے افسانے میں میر زمان دیارِ غیر اس لیے جاتا ہے کہ وہ کرم جان کے لیے سونے کا جھومر اور سونے کی چوڑیاں خرید سکے۔ اور دھوم دھام سے شادی کرنے کے لیے اخراجات کا بوجھ فراخدلی سے برداشت کر سکے۔" کرم جان! میں پردیس جا رہا ہوں، صرف روپیہ اکٹھا کرنا ہے۔ میں تیرے لیے سونے کا جھومر اور تولے تولے کی چھ چوڑیاں بنوا کر لاؤں گا۔" ۱۱۰

لیکن جب وہ پانچ سال بعد لوٹتا ہے تو کرم جان کی شادی ہو جاتی ہے اور شادی کے بعد وہ بیوگی کی زندگی بسر کر رہی ہوتی ہے۔ ان پانچ سالوں میں بہت کچھ بدل جاتا ہے۔ افسانے کی پوری کہانی فلمی رنگ اختیار کیے ہوئے ہے۔ لیکن صادق حسین نے جملوں کی خوبصورتی کا برمحل استعمال کر کے دیہاتی سماج کی جزئیات کو کامیابی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مثلاً ایک نکتہ دیہاتی پس منظر کے حوالے سے انھوں نے اجاگر کیا ہے وہ یہ کہ دیہاتی لوگوں میں اخوت اور بھائی چارہ بہت زیادہ موجود ہوتا ہے۔ ماسی جنتے اور بھاگ بھری کے باہمی میل جول اور تعلقات کے ذریعے وہ دیہاتی مساوات اور بھائی چارے کی تصویر کشی اس طرح کرتے ہیں۔

"ماسی بھاگ بھری اور ماسی جنتے اُس وقت دوپٹا بدل بدل کر بہنا پا جوڑا تھا۔ جب وہ سہاگنیں تھیں، دونوں پڑوسنیں بھی تھیں۔ دونوں کے کچے مکان شانے سے شانہ ملا کر کھڑے تھے۔ برسات کی آمد سے پہلے وہ مل جل

کر لپائی پوتائی کر تیں۔ سردیوں میں وہ پنجیری بناتیں تو ایک ساتھ گرمیوں میں آم کا اچار ڈالتے وقت ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتیں۔ انہوں نے آنگن کی مشترک دیوار میں ایک موکھا بنار کھا تھا۔ جب چاہتیں موکھے سے باتیں کر لیتیں۔ سرسوں کے ساگ کی رکابی ادھر سے اُدھر پہنچ جاتی۔ دن تہوار پر گڑ کے حلوے یا ہاتھوں سے بٹی سویوں کا ادل بدل ہو جاتا۔"(۱۱)

صادق حسین نے دیہات سے تعلق رکھنے والے افراد کی زندگیوں کو بہت باریکی کے ساتھ سپردِ قلم کر کے اس بات کا ثبوت پیش کیا ہے کہ انہیں دیہاتی زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ دیہاتیوں کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ دیہاتی لوگ من کے سچے اور روایات کے پاسدار ہونے کے ساتھ ساتھ عزتوں کے محافظ اور امین بھی ہوتے ہیں۔ اور اپنے بڑوں کی طرف سے عائد کردہ روایات کو برقرار رکھتے ہیں۔ اُن کا احترام اور لاج بھی رکھتے ہیں۔ افسانے میں میر زبان دیارِ غیر سے خط میں کرم جان کا ذکر کرنے سے گریزاں نظر آتا ہے۔ مبادا کہ اُسکی ماں اسکے بارے میں برا خیال نہ کرے۔ صادق حسین کے افسانوں میں ناصحانہ رنگ بھی نمایاں ہے۔

صادق حسین اس طرح کے جملوں کا استعمال کر کے کوئی نہ کوئی بات سمجھانا چاہتے ہیں۔ مثلاً دھوپ ہو تو سایا ہوتا ہے۔ اس جملے کے ذریعے انھوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جہاں روپیہ پیسہ ہو وہاں اسکی حفاظت کی ضرورت پیش آتی ہے اور دولت اور روپیہ پیسہ دوسروں کو آپکی طرف کھینچتا ہے۔ لہذا انسان اُس کی حفاظت اور نگرانی کے لیے چوکنا رہتا ہے۔ تہی دامنی بہت سارے اندیشوں سے محفوظ رکھتی ہے جبکہ روپیہ پیسہ کی وجہ سے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کوئی اسے چرا نہ لے اور اس حوالے سے طرح طرح کے اندیشے تنگ کرتے ہیں۔ دوسری بات جو صادق حسین نے پاگل بابا کے جملوں کے ذریعے واضح کی ہے وہ ہے حق گوئی اور تجزیاتی نگاہ۔ جو لوگ نیت کے سچے اور وعدوں کے پاسدار اور قول کے پکے ہوں انہیں دنیا معمولی انسانوں کی صف میں شامل نہیں کرتی۔ کیونکہ وہ وسیع النظر ہوتے ہیں اور ان کا باطن پاک اور کھرا ہوتا ہے اس لیے ان کی کہی ہوئی سچی اور کھری باتیں معاشرے والوں کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوتیں لہٰذا وہ انہیں پاگل کا نام دے کر معاشرے سے فارغ کر دیتے ہیں۔

افسانہ "آخری گاؤں" موضوع کے حوالے سے دیہاتی سماج پر بحث کرتا ہے۔ صادق حسین کا یہ افسانہ دیہاتی سماج کی تہذیب و ثقافت کی نمائندگی کرنے والا افسانہ ہے۔ دیہاتی لوگ اپنے لوک ورثہ کی حفاظت کرنا جانتے ہیں اور اپنی روایات کو آگے بڑھاتے ہیں اان کی کل متاع اُن کا ثقافتی ورثہ ہے۔ اس افسانے میں صادق حسین نے دیہاتیوں کی سادہ لوحی پر قلم اُٹھایا اور ہمیں یہ بتانے کی کوشش کی کہ دیہاتی طبعاً سادہ لوح، خوش طبع اور اپنی مٹی کے محافظ ہوتے ہیں۔

دیہاتی سماج سے تعلق رکھنے والے افراد کتنی ہی رنجشیں کیوں نہ پالیں اور ایک دوسرے سے ناراضگی کا اظہار کریں لیکن جب بھی اُن کے گاؤں اور ثقافتی ورثے کے حوالے سے بات آتی ہے تو یہ لوگ اجتماعی پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر سینہ تان کر مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور اپنے گاؤں کی آن پر آنچ نہیں آنے دیتے۔ یہی بات ان کے باہمی بھائی چارے کا ثبوت دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افسانہ آخری گاؤں میں دیہات سے تعلق رکھنے والے افراد کو جب یہ خبر ملتی ہے کہ شہر سے گیتوں کا شکاری ان کے گاؤں آئے گا۔ تو وہ سب مل بیٹھ کر آپس صلاح مشورے کرتے ہیں کہ آنے والی گھڑی کا مقابلہ کیسے کیا جائے؟ کیونکہ وہ شہریوں کی مداخلت کو پسند نہیں کرتے کہ وہ ان کے گاؤں سے کوئی بھی چیز چاہے ثقافتی ورثہ ہی کیوں نہ ہو وہ اسے چُرا لے جائیں۔ "اسی لیے تو کونجیں یہ سوچ کر اداس ہو گئیں کہ اگر گیتوں کا شکاری ان کے گیت چرا کر لے گیا تو پھر کیا ہوگا۔" ۱۲؎ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دیہاتی تہذیب کے رکھوالے ہوتے ہیں۔ شہری بابو کی آمد کی خبر سُن کر گاؤں والے ہنگامی اجلاس بلایا جاتا ہے۔ لہٰذا باہمی صلاح مشورے کے بعد تہہ یہ پاتا ہے کوئی بھی شخص شہری بابو سے بات نہیں کرے گا۔ اس طرح ان کے اس رویے سے شہری بابو خود ہی دلبر داشتہ ہو کر واپس لوٹ جائے گا۔ لیکن کچھ پڑھے لکھے نوجوان شہری بابو کی آمد پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں کیونکہ وہ باقی گاؤں والوں کی نسبت شہری بابو کے کام سے متعلق آگاہی رکھتے ہیں جو ثقافتی ورثے کے حوالے کتاب لکھنے کی غرض سے گاؤں گاؤں جاتا ہے اور وہاں کی ثقافت کو لفظوں کی شکل میں ترتیب دیتا ہے۔

مکالماتی انداز میں لکھے گئے اس افسانے میں مجموعی طور پر صادق حسین نے باریک بینی کے ساتھ دیہاتی طرز بود و باش کو بیان کیا اور اس کے علاوہ دیہاتی اور شہری زندگی کا موازنہ بھی کیا کہ شہری لوگ دیہاتیوں کی نسبت شاطر اور تیز طرار ہوتے ہیں۔ ان کے پاس باتوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اور نہ فرصت کے مشاغل کے لیے ان کے پاس وقت ہوتا ہے۔ وہ زندہ دل نہیں ہوتے اور نہ ہی روایات کے پاس دار ہوتے ہیں۔ جبکہ اس کے برعکس دیہاتی لوگ سادہ مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ زندہ دل بھی ہوتے ہیں "شہریوں کے پاس باتوں کے سوا ہوتا ہی کیا ہے؟ جان نہ جشن، سمی نہ کبڈی، ہیر کے بول ناماہیا خدا جانے یہ لوگ زندہ کیسے رہتے ہیں۔" ۱۳؎

دیہاتیوں میں عزت، انا خودداری کے جذبات کے علاوہ خلوص اور مہمان نوازی کے جذبات بھی نمایاں ہوتے ہیں۔ اور وہ عزت اور خودداری کو بچانے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ گاؤں کے لوگوں کو جب اس بات کی خبر ملتی ہے کہ گیتوں کا شکاری اب ان کے گاؤں نہیں آئے گا اور وہ اس معاملے سے متعلق تفصیلات معلوم کرنے کے لیے اپنے نوجوانوں کو پنڈ قاضیاں روانہ کرتے ہیں کہ آیا وہ معلوم کر سکیں کہ گیتوں کا محافظ ان کے گاؤں کیوں نہیں آنا چاہتا تو انہیں معلوم ہوتا ہے کہ پنڈ قاضیاں کے رہنے والوں نے اُسے اپنے اخلاص سے بہت متاثر کیا تھا۔

اس لیے وہ آخری گاؤں سے تعلق رکھنے والے افراد پنڈ قاضیاں کے لوگوں پر سبقت لے جانے کی غرض سے شہری بابو کو اپنے گاؤں لانے کے لیئے مضطرب ہو جاتے ہیں اور باہمی رائے سے تہہ پاتا ہے کہ شہری بابو اُن کے گاؤں بھی ضرور آئے گا۔ کیونکہ یہ ان کی عزت کا مسئلہ بن چکا ہے کہ پڑوس والا گاؤں مہمان نوازی کے حوالے سے ان سے کیوں آگے نکل جائے۔ "یہ ہماری عزت کا سوال ہے۔ اب ہم برداشت نہیں کر سکتے۔"⁴⁴ یہاں مہمانداری اور خلوص کا جذبہ جیت جاتا ہے جبکہ ورثے سے محبت اور لگاؤ کا جذبہ قربانی کے انداز میں شکست تسلیم کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اور یوں وہی دیہاتی جو شہری بابو کے گاؤں آنے کی وجہ سے پریشان ہوتے ہیں۔ اب اس کی آمد کے لیے اتنے ہی بے تاب ہوتے ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے یہ افسانہ ایک عام سا افسانہ ہے جس میں دیہاتی زندگی اور اس سے متعلقات کو صادق حسین نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس افسانے کی منفرد بات جو صادق حسین نے واضح کی وہ دیہاتی سماج سے تعلق رکھنے والے ہر طرح کے طبقے اور پیشے سے تعلق رکھنے والے افراد کا ذکر ہے۔ میراثی، موچی، نائن نمبردار، جاٹ کی بیٹی، گجری، ار چمارن وغیرہ کا ذکر کر کے صادق حسین نے دیہاتی طبقوں سے متعلق آگاہی دلائی ہے۔ افسانے میں کوئی گہرائی اور نیا پن موجود نہیں روایتی کہانی ہے یہ چونکا دینے والے تمام عناصر سے خالی نظر آتی ہے لیکن تہذیبی شناخت کے حوالے سے اپنی مثال آپ ہے۔

"شہر اندر شہر "کا افسانہ " ایک رات "کا موضوع "ماں کی ممتا" کے علاوہ خانگی زندگی کے مسائل ہیں۔ صادق حسین نے اس افسانے میں ممتا کے جذبے کو تمام جذبات پر حاوی دکھایا ہے۔ عورت چاہے کتنی ہی کمزور اور بزدل کیوں نہ ہو لیکن بات جب اس کی اولاد پر آتی ہے تو پھر وہ شیر سے زیادہ بہادر بن جاتی ہے اور ہر طرح کے سرد و گرم سے گزر جانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ممتا کا جذبہ ایک فطری عمل جو ہر ماں کے سینے میں موجزن ہوتا ہے۔ ایک ماں کے لیے اولاد کی تکلیف اور دکھ سب سے بڑا دکھ ہوتا ہے۔ وہ اپنے بچے کو پریشانی میں دیکھ کر تڑپ جاتی ہے اور اس کے سینے میں تلاطم برپا رہتا ہے

اس افسانے میں صادق حسین نے بتایا ہے کہ ازدواجی زندگی میں بے شمار اتار چڑھاؤ آتے ہیں۔ انسان کو بہت سے مسائل اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ عملی زندگی میں قدم رکھتے ہی انسان کو تلخ تجربات اور حقائق کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور یہی حقائق اور تلخیاں اندرونی سطح پر انسان کی شخصیت کو توڑ پھوڑ دیتی ہیں۔

صادق حسین نے معاشرتی زندگی کے حوالے سے ایک اہم نکتہ اجاگر کیا ہے وہ ہے انسان کی تربیت پر ماحول کا اثر۔ والدین بچوں کی تربیت اور پرورش میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اُن کے اعمال وافعال ہنر اور پیشہ ورانہ مہارتوں کا اثر بھی کسی نہ کسی طرح اُن کی اولاد پر پڑتا ہے۔ اور بچے دانستہ اور نادانستہ طور پر ان اثرات کو قبول کرتے رہتے ہیں۔ جیسے

مذکورہ افسانے میں ماہتاب عسکری خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔اس کے والد اور دادا کا تعلق ملٹری سے تھا لہذا وہ بچپن سے ایسے قصے کہانیاں سُن کر جوان ہوئی تھی۔ جس میں گولیوں کی بوچھاڑ اور توپوں کی گھن گرج کا ذکر ہوتا تھا۔اور وہی کہانیاں لاشعوری طور پر اس کے ذہن میں ایسے نقوش چھوڑ گئیں جو بڑے ہو کر بھی اس کے حافظے میں رہیں۔اور وہ دلیری کا مظاہر کرتے ہوئے فوجی جوانوں کی طرح رینگ رینگ کر توپوں کے گولوں سے بچتی بچاتی سسرالی گاؤں میں پہنچ جاتی ہے۔اس کے علاوہ اُس کے گیتوں میں بھی عسکری جلال نظر آتا تھا۔

"رزمیہ ماحول سے تو اس کا خمیر اُٹھا تھا۔اُس کے دادا نے پہلی جنگ عظیم میں بہادری کے کارنامے سرانجام دیے تھے۔اسکا باپ پنشن یافتہ صوبیدار میجر تھا۔ جس نے دوسری جنگ عظیم میں ملٹری کراس حاصل کیا تھا۔وہ اسے بچپن میں جنوں اور پریوں کی کہانیاں نہیں سنایا کرتا تھا بلکہ مزے لے لے کر میدانِ جنگ کی وارداتیں بیان کرتا تھا۔ اور تاباں توپوں کی گھن گرج، گولیوں کی ٹھائیں ٹھائیں اور بموں کے دھماکے سنتے سنتے سو جایا کرتی تھی۔"۱۵

صادق حسین نے سماج کے اندر رشتوں کی اہمیت کو بھی واضح کیا ہے اور یہ نکتہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ انسان کی شخصیت کی پہچان اُس کے حسب نسب سے ہوتی ہے کہ اُسکا تعلق کس خاندان سے ہے اُن کی رگوں میں کس قسم کا خون دوڑ رہا ہے۔اچھی نسل کا اندازہ لگانے کے لیے ماضی کو حال کے ساتھ ملا کر موازنہ کیا جاتا ہے کہ موجودہ نسل کے آباؤ اجداد کس طرح کے تھے۔اور اپنی چیزوں کو بنیاد بنا کر آپس میں گاؤں کے لوگ رشتے ناتے کرتے ہیں۔نسلی تفاوت کو دیہاتی سماج میں بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔مزید براں صادق حسین نے عورت کی حساسیت کو موضوع میں جگہ دے کر افسانے کی اہمیت کو بڑھایا ہے۔اُن کے نزدیک عورت بہت حساس دل کی مالک ہوتی ہے۔اس کے احساسات اور جذبات کو ذرا سی ٹھیس پہنچ جائے تو اسکی شخصیت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتی ہے۔

"درانتی کا گیت"عورت کی محبت اور انتقام کی سلگتی ہوئی آگ پر مبنی صادق حسین کی ایک عمدہ تخلیق ہے۔دیہاتی سماج سے اٹھنے والا موضوع خالصتاً پوٹھواری رنگ لیے ہوئے ہے۔ زیرِ غور افسانہ میں صادق حسین نے دیہاتی سماج سے تعلق رکھنے والے افراد کے رویوں اور سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے ہمیں بتایا ہے کہ دیہاتی لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں کو انا کا مسئلہ بنا کر آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک دوسرے کا خون کر دیتے ہیں۔ کبھی یہ جھگڑے دولت اور جائیداد کی وجہ سے ہوتے ہیں تو کبھی غیرت اس کا سبب بنتی ہے اور کہیں پر عورت سے محبت اور عشق اس لڑائی اور دشمنی کا سبب بن جاتا ہے۔دولت اور طاقت کے نشے میں چور صاحب اقتدار ہر دور میں ظلم اور بربریت کا باعث بنے ہیں اور بنتے چلے آرہے ہیں۔ جس کے پاس اقتدار یا روپے پیسے کی ریل پیل ہو وہ نامور وہی عزت دار اور وہی سب سے زیادہ قابلِ احترام سمجھا جاتا ہے۔ یہاں پر ''جس کی لاٹھی اُس کی بھینس'' کا مقولہ صادق آتا ہے۔

صادق حسین نے اس افسانے میں ایک ایسے طاقتور اور ظالم جاگیر دار کا ذکر کر کے معاشرے میں ناانصافیوں اور سفاکیوں سے متاثر افراد کی بپتا بیان کی ہے اعظم خان موضع "دھکڑانوالی" کا سب سے بڑا زمیندار ہے۔ ہر سال گندم کی کٹائی کے وقت ایک مقابلے کا اہتمام کرتا ہے اور یہ مقابلہ میلے کی شکل اختیار کر جاتا ہے کیونکہ دُور دُور سے لوگ خاص طور پر اعظم خان کی فصلوں کی کٹائی دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ اعظم خان کو اپنے مرتبے اور روپے پیسے پر بڑا گھمنڈ ہوتا ہے۔ گاؤں کی شادہ شدہ خوبصورت لڑکی کے خاوند کو وہ صرف اس وجہ سے قتل کروا دیتا ہے کیونکہ وہ خود اُس سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن "داراں" صرف اپنے میاں سے محبت کرتی ہے اور بیوہ ہو جانے کے بعد بھی اپنے خاوند کی لاج رکھتی ہے۔ گاؤں والوں کو اس بات کی خبر بالکل بھی نہیں ہوتی کہ داراں کا خاوند "اکبر" کا قتل کس نے اور کیوں کیا؟ لیکن بہت سارے حقائق داراں پر یہ بات واضح کر دیتے ہیں کہ اس کے خاوند کا قاتل کون ہے۔ اور وہ اپنے خاوند کے قتل اور اسکے محسن اور دوست کے گھر کے جلنے کا بدلہ اعظم خان کے گھر کو آگ لگا کر لیتی ہے اور اس طرح اپنے سینے میں سلگتی آگ کو ٹھنڈا کرتی ہے۔ اس افسانے کا عنوان بھی ''درانتی کا گیت'' اس لیے رکھا گیا کہ گندم کی فصل کی کٹائی کے وقت اعظم خان جس میلے کا انعقاد کرتا ہے سب لوگ وہ میلہ اور گندم کی کٹائی کا مقابلہ دیکھنے میں مصروف ہوتے ہیں درانتیوں کے مسلسل متحرک رہنے سے فضا میں ایک شور پیدا ہوتا ہے۔ اُسی شور اور گیت میں اعظم خان اور گاؤں کے تمام افراد مست و مگن ہوتے ہیں کہ داراں موقع پا کر اس کے وسیع و عریض گھر کو نذرِ آتش کر دیتی ہے۔ "اعظم خان کی پکی عمارت سے شعلے نکل رہے تھے۔ ایک کہرام مچ گیا۔"

صادق حسین نے جو نکتہ اس افسانے کے ذریعے اُٹھایا وہ یہ کہ دیہاتی لوگ انتقامی ہوتے ہیں اور چاہے کوئی بھی فرد کتنا کمزور اور بزدل یا مجبور ہی کیوں نہ ہو وہ موقع پا کر انتقامی کارروائی ضرور کرتا ہے کیونکہ جب تک وہ اپنے اندر انتقام کے الاؤ کو ٹھنڈا نہ کر لے انھیں چین نہیں ملتا۔ جیسے مذکورہ افسانہ میں داراں ایک کمزور اور بے بس عورت ہے لیکن اپنے خاوند کے قتل کا بدلہ کچھ اور انداز سے لے کر سکون کا سانس لیتی ہے۔ زیرِ نظر افسانہ کے توسط سے صادق حسین نے دیہی زندگی سے متعلق ایک اور اہم بات واضح کی کہ دیہاتی سماج میں پروان چڑھنے والے افراد کے لیے تفریحِ طبع کے مواقع اور ذرائع بہت محدود ہوتے ہیں لہذا وہ ایسی سرگرمیوں فصل کی کٹائی کا مقابلہ وغیرہ کا اہتمام کرتے ہیں اور آپس میں مل کر گپ شپ لگاتے اور مقابلوں کا اہتمام کر کے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ طاقت کے بل بوتے پر یہ افراد کس طرح کی سازشیں کرتے اور دوسروں کو زک پہنچانے کا سبب بنتے ہیں یہ تمام باتیں بھی اس افسانہ کے ذریعے واضح ہوتی نظر آتی ہیں۔

پورا افسانہ دیہی معاشرت اور اس سے متعلق جزئیات کے گرد گھومتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے دیہی امور سے لے کر انسانوں کے معاشرتی رویوں تک کو صادق حسین نے کامیابی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس افسانے کے ذریعے انہوں نے دیہی معاشرت کے ظاہری اور حقیقی دونوں طرح کے پہلوؤں کو سامنے لایا۔

افسانہ "پتھر اور سائے" افسانوی مجموعے "شہر اندر شہر" کا آخری افسانہ ہے اس افسانے میں صادق حسین نے طبقاتی تقسیم اور معاشرتی ناانصافیوں کو موضوع بنا کر بنگالی سماج سے تعلق رکھنے والے اونچے طبقے اور افلاس زدہ طبقے کا نہ صرف موازنہ کیا بلکہ پسماندہ طبقے کی طرزِ زیست پر روشنی ڈالی ہے۔ صادق حسین مفلوک الحال طبقے سے وابستہ لوگوں کی چھوٹی چھوٹی آرزوؤں کے ساتھ اُن کے ذریعہ معاش کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ کسی بھی معاشرے میں سماجی زندگی کا انحصار معاشی نظام پر ہوتا ہے۔ جتنا معاشی نظام مستحکم و مضبوط ہو گا اتنا ہی معاشرہ ترقی کرے گا۔ یہ بھی ایک اٹل حقیقت ہے کہ ہر طرح کے سماج سے تعلق رکھنے والے افراد اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے نت نئے معاش کے ذرائع تلاش کرتے ہیں۔ ذریعہ معاش کوئی بھی ہو انسان اُس ذریعے یا پیشے کو اختیار کر کے نہ صرف اپنی ذات کو فائدہ پہنچاتا ہے بلکہ اپنے سے وابستہ معاشرے اور قوم کے لیے تسکین و ترقی کا سامان بھی فراہم کرتا ہے۔ افسانے میں صادق حسین نے بنگال کے ساحلی علاقوں میں بانس کی جھونپڑیوں میں رہنے والے غرباء کی زندگیوں اور روز مرہ کے معمولات کو بیان کیا ہے۔ اُن کی تمناؤں کے علاوہ معاشی ذرائع کا ذکر کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ ساحل کنارے رہنے والوں کا گزر بسر ماہی گیری کے علاوہ سیپیاں اور پتھر چننے پر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ سمندری پانی کو خشک کر کے نمک تیار کرنا بھی اُن کی روزی روٹی کے لیے اہتمام کرنے کا باعث بنتا ہے۔ ایسے معاشرے میں مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین بھی شانہ بشانہ کام کرتی ہیں اور اپنے کنبے کی کفالت کرتی ہیں۔ مذکورہ افسانے میں صادق حسین نے خلیج بنگال کے کنارے رہنے والی مزدور خواتین کی سرگرمیوں اور خواہشات و جذبات کا ذکر کیا ہے کہ وہ صبح سویرے کام پر نکل جاتی ہیں اور پتھر چنتی رہتی ہیں یہی پتھر وہ اونے پونے داموں ٹھیکیدار کو فروخت کرتی ہیں۔ اور اس طرح پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے چند روپے اُن کے ہاتھ آجاتے ہیں ایسے میں ایک ایک پتھر اُن کے لیے سہانے خواب کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ انھی پتھروں سے اُن کی روزی روٹی وابستہ ہے۔

> "ہر پتھر ان کے لیے سنہرا خواب تھا۔ انہی پتھروں سے دال بھات پیدا ہوتا تھا۔ انہی پتھروں میں گہنے، کُرتے اور دوپٹے تھے۔ اس لیے ہر ایک زیادہ سے زیادہ پتھر چُن لینے کی کوشش کرتی۔ پتھروں کی اک ٹوکری کے عوض ٹھیکیدار آٹھ آنے دیتا تھا۔ انہی پتھروں کی کنکریٹ بنائی جائے گی۔ اس کنکریٹ سے سڑکیں تیار ہوں گی۔ بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کی جائیں گی۔"[۱۶]

صادق حسین نے معاشرتی زندگی کے حوالے سے اس افسانے میں بھی اپنے دیگر افسانوں کی طرح سماجی تفاوت اور طبقاتی امتیازات اور ناانصافیوں کا ذکر کر کے نچلے طبقے اور اعلیٰ طبقے کی طرزِ معاشرت کا موازنہ کیا ہے۔ امیر ٹھاٹ باٹ اور شان و شوکت کے ساتھ پر آسائش زندگیاں بسر کرتے ہیں۔ جبکہ غریبوں کو علاج معالجہ کے لئے طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اپنی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں اور دوادارو کے لیے انہیں اپنی جمع پونجی کے علاوہ زیورات وغیرہ تک فروخت کرنے پڑتے ہیں۔ جبکہ اس کے برعکس امیر طبقہ آرام کرسیوں پر براجمان ہو کر پر تعیش زندگی گزارتا ہے۔

سماج کسی بھی طرح کا کیوں نہ ہو اس میں طبقاتی تقسیم کے علاوہ شخصی تقسیم بھی پائی جاتی ہے۔ ہر طرح کے طبقے میں مختلف مزاج کے مالک لوگ موجود ہوتے ہیں کچھ شکستہ حال اور کچھ زندہ دل افراد بھی ہوتے ہیں جو دوسروں کے چہروں پر مسکان لانے کا سبب بنتے ہیں۔ اور روکھی سوکھی پر قناعت کرنا جانتے ہیں۔ صادق حسین نے بنگالی سماج سے تعلق رکھنے والے افراد کی خواہشات کا ذکر کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ اُن کے طبقے اور معاشرتی مقام کی طرح اُن کی خواہشات بھی اتنی ہی چھوٹی اور معصوم ہوتی ہیں۔ کچھ اچھے وقت کے انتظار میں جی رہے ہوتے ہیں۔ کوئی ماں کی نظر کی عینک کے لیے ترس رہا ہے۔ تو کوئی ماں کے علاج کے لیے۔ ان کے خواب محل سجانے اور تعمیر کرنے کے نہیں چھوٹی چھوٹی خواہشات کی تکمیل تک محدود ہوتے ہیں۔ صادق حسین نے افسانے میں غریبوں کے طرز زیست کو بیان کرتے ہوئے خواتین کی اچھے دنوں کی آس میں سسکتی، بلکتی زندگیوں کو بیان کیا ہے۔ پورا افسانہ صادق حسین کی معاشرتی نبض شناسی کا عکس پیش کرتا ہے۔ افسانے کا موضوع اتنا جاندار نہیں۔ کیونکہ اس طرح کے موضوع جس میں غربت اور طبقاتی کش مکش کا ذکر ملتا ہو انھوں نے اور بھی افسانے تحریر کیے۔ سماجی زندگی کے حوالے سے یہ ان کے دیگر افسانوں سے صرف معاشی ذرائع کے حوالے سے انفرادیت کا حامل افسانہ ہے۔ صادق حسین نے سماجی زندگی کے حوالے سے ذاتی مشاہدات اور نقطۂ نظر و فکر کی بنا پر اپنے افسانوں میں متعلقہ سماج کی بد شگونیوں اور توہمات سے بھی متعارف کروایا ہے۔

زیرِ نظر افسانے میں انھوں نے خلیج بنگال کے ساحلی علاقوں سے متعلق سماج کا حوالہ دیتے ہوئے بیان کیا کہ توہم پرستی اور بد شگونیاں اس سماج کا بھی حصہ ہیں۔ جیسے ساحلی علاقوں سے تعلق رکھنے والی خواتین میں یہ بات عام تھی کہ پتھر چننے کے دوران ریت پر لیٹنا فال کے طور پر گردانا جاتا ہے۔ کیونکہ برسوں پہلے چھمیا کی ماں نے بھی ایسے ہی کیا تھا اور وہ ننھی بچی کو تنہا چھوڑ کر شہری کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ لہٰذا اب اگر ویسی غلطی یا حرکت دہرائی گئی تو دوبارہ کچھ اس قسم کے منفی نتائج متوقع ہو سکتے ہیں۔ صادق حسین اسی بات پر روشنی ڈالتے ہیں کہ اگر ایک عمل کرنے کی وجہ

سے کسی ایک انسان کے حق میں وہ بات غلط ہو جائے تو پھر اس علاقے سے تعلق رکھنے والے افراد مزید اسی طرح کے کاموں اور سرگرمیوں کی انجام دہی کے حوالے سے محتاط رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور آئندہ آنے والی نسلوں کو بھی تنبیہ کرتے ہیں۔" چھمیا اُٹھ بیٹھو، ریت پر لیٹنا اچھا نہیں، ایک سائے نے کہا اور معمر سایہ دانتوں میں انگلی دبا کر سوچ میں ڈوب گیا۔"[۲۷] اس افسانے میں صادق حسین نے "پتھر" کا لفظ صاحبِ اقتدار و مالدار لوگوں کے لیے استعمال کیا ہے۔ کیونکہ دولت کی ہوس اور لالچ کے علاوہ غرور و تکبر انہیں سخت دل بنا دیتا ہے اور انہیں اپنے سوا کچھ اور دکھائی نہیں دیتا۔ جبکہ افسانے میں" سائے" کا لفظ غریب اور پسماندگان کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ جو بنیادی ضروریات کے لیے ترستے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ محنت مزدوری کر کے ان کا جسم صرف ہڈیوں کا ڈھانچا رہ جاتا ہے۔ اور دور سے بس ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی سایہ حرکت کر رہا ہو۔ اس بے بس طبقے کے لیے سایہ کا لفظ اس لئے بھی استعمال کیا گیا ہے کہ جس طرح عام انسان کی زندگی میں سائے کی کوئی وقعت نہیں ہوتی اسی طرح معاشرے کے اندر غریب لوگوں کی بھی حیثیت کسی سائے سے کم نہیں۔ پورا افسانہ بنگالی معاشرے کی جزئیات کے ساتھ مکمل تصویر پیش کرتا ہے۔

"گلاب کے آنسو" میں سماجی شعور (بحوالہ موضوع)

کسی بھی حساس معاشرے میں انسانی قتل وخون کے حادثات اور اُن کے ساتھ کی جانے والی ناانصافیوں اور زیادتیوں کا اثر ہر حال میں پورے سماج پر پڑتا ہے اور سماج کے تقریباً تمام شعبے اور گوشے اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ فنونِ لطیفہ اور ادب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اپنے اپنے دور میں ہونے والی سماجی ناانصافیوں کی تصویر کشی ہر دور کے ادباء اور مصنفین نے اپنی اپنی تحریروں کے ذریعے کی۔ صادق حسین بھی اپنے افسانوں میں افراد پر ہونے والے ظلم و جور کے خلاف مزاحمتی کارروائی کرتے نظر آتے ہیں۔ اپنے عہد کی سماجی پیچیدگیوں اور معاشرتی المیوں کی تصویر کشی انھوں نے بہت عمدہ انداز میں کی ہے۔ آپ کے افسانوی موضوعات کے حوالے سے عارف عبدالمتین اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

> "صادق حسین سماجی ناہمواریوں اور ہر انداز کے انسانی استحصال کے خلاف سراپا احتجاج بن گئے ہیں انہوں نے ہمارے معاشرے کی بے اعتدالیوں کو کبھی مشرقی پاکستان اور کبھی مغربی پاکستان کے، بھی شہر اور کبھی دیہات کے پس منظر میں پیش کیا ہے۔ اور اُن کے طفیل انسانوں کی معصوم امنگوں لطیف آرزوؤں اور نازک ارمانوں کا خون ہوتے ہوئے دکھایا ہے۔"[۱۸]

صادق حسین کے افسانوں میں تنوع اور رنگارنگی بھی ہے۔ اب صادق حسین کے تیسرے افسانوی مجموعے "گلاب کے آنسو" کے افسانوں میں "سماجی شعور" کے حوالے سے موضوعاتی تجزیہ پیش کیا جارہا ہے لیکن یہاں پر ایک بات واضح کرنا لازم ہے کہ آپ کے تیسرے مجموعے میں بھی کل گیارہ افسانے ہیں جن میں سے پوہنچیاں، پتھیرا، اور بوفے وہ افسانے ہیں جو اُن کے پہلے افسانوی مجموعے کا بھی حصہ ہیں اس کے علاوہ "گلاب کے آنسو" میں، "لہو کے چراغ"، "نغمے کی بغاوت"، "خوشبو کی نیند" اور "گلاب کے آنسو" چار ناولٹ بھی اس مجموعے کا حصہ ہیں۔ چونکہ مجوزہ تحقیق ان کے افسانوں کے تجزیے تک محدود ہے۔ لہٰذا "گلاب کے آنسو" کے آٹھ افسانوں کا تجزیہ پیش کیا جارہا ہے۔

افسانہ "تیسری حویلی" غربت اور افلاس زدہ معاشرے کی عکاسی کرنے والا افسانہ ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے غریب الخلقت عوام میں جمہوریت کے تصور کو بھی واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ "تیسری حویلی" ایسے افراد کا مسکن ہے جو غربت اور مفلسی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور حویلی کے مالک کی زبان سے صادق حسین نے افسانے میں حویلی کے مکینوں کا تعارف بھی کروایا کہ "اس حویلی میں تیسری دنیا کے لوگ رہتے ہیں اور دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں بھی تیسری حویلی پائی جاتی ہے۔"[۱۹] افسانے میں مذکورہ حویلی کے بارے میں مشہور ہے یہ تین

پشتوں سے چلی آرہی ہے اور انتہائی قدیم حویلی ہے یہاں ہر مذہب اور عقیدے سے تعلق رکھنے والے افراد معقول کرایہ دے کر رہائش پذیر ہیں۔ ان میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو، سکھ، انگریز اور عیسائی لوگ بھی شامل ہیں۔ لیکن مختلف مذاہب اور عقائد سے تعلق رکھنے کے باوجود باہمی اتحاد اور بھائی چارے کے ساتھ زندگیاں گزار رہے ہیں۔ جو ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہو کر ہمدردی اور غمگساری جیسے جذبات سے لبریز ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب تیسری حویلی کی رہائشی "نور بیگم" کے میاں کا انتقال بجلی کے کھمبے سے کرنٹ لگنے کی وجہ سے ہوا تو حویلی کا ہر فرد اس کے دکھ درد میں برابر کا شریک تھا۔

> "چوہدری حکم داد نے بیگم نور کے کمرے کا کرایہ معاف کر دیا۔ اسکا ماہانہ وظیفہ بھی مقرر کر دیا۔ دلشاد مسیح اور رحمتاں نے گرجا گھر میں بیگم نور کے لیے دعائیں کیں۔ جسونت کور، گرنتھ صاحب کا ہاتھ کر کے پراتھنا کرتی۔ واہے گرو! بیگم نور کی چپ توڑیے۔ رحمتاں بیگم نور کو مٹھیاں بھرتی، اسکی کنگھی چوٹی کر دیتی۔" ۲۰؎

اسی طرح محلے کی تمام لڑکیاں اس کے روزمرہ کے کام جن میں کپڑے دھونا ہانڈی روٹی کرنا، جھاڑو پوچا اور صفائی وغیرہ شامل تھے۔ باری باری روزانہ اسکا کام باقاعدگی سے کر جاتی تھیں۔ ماسی جیواں تنور پر روٹیاں لگاتی تھی وہ ایک روٹی مفت روزانہ بیگم نور کو دے جاتی۔ افسانے کے ان کرداروں اور معمولات زندگی کے ذریعے اخوت و بھائی چارے کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ معاشرے کا وجود افراد سے عمل میں آتا ہے۔ اور معاشرہ چاہے کسی بھی نوعیت کا کیوں نہ ہو باہمی اتفاق و اتحاد کے ذریعے کامیاب معاشرے کی شکل اختیار کرتا ہے۔ سماجی ضروریات میں پیار محبت رکھ رکھاؤ، اخلاقیات، خوشگوار تعلقات، رسم و روج کے ساتھ ساتھ اخوت و بھائی چارہ بھی اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے جتنا زندہ رہنے کے لیے سانس۔ صادق حسین نے ایک اور بات جو اس افسانے کے ذریعے واضح کی وہ ہے مذاہب کا تفاوت۔ ایک ہی سماج میں بیک وقت ایک سے زیادہ مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ موجود ہوتے ہیں جیسا کہ اس افسانہ میں بھی ہندو سکھ، عیسائی، انگریز اور مسلمان ایک ہی حویلی اور محلے میں رہتے ہیں لیکن پھر بھی ان میں مذہبی انتہا پسندی، تفاوت و امتیازات کا عنصر دیکھنے کو نہیں ملتا۔ وہ سب مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے کے باوجود ایک ہی رشتے کی لڑی (بھائی چارہ) میں پروئے ہوئے ہیں اور ایک خاندان ایک برادری کی طرح نسل در نسل اس حویلی کے مکین کی حیثیت سے زندگیاں بسر کر رہے ہیں۔ اگر چھوٹی موٹی باتوں پر اُن کا لڑائی جھگڑا بھی ہو جائے تو بھی دلوں میں کدورت اور نفرتوں کو جگہ نہیں دیتے۔ تیسری حویلی سے تعلق رکھنے والے افراد چھوٹی چھوٹی باتوں کو انا کا مسئلہ بنا کر تعلقات میں کشیدگی نہیں پیدا کرتے۔ جیسے افسانے کے آغاز میں جنت بی بی اور بھاگ بھری آپس میں گتھم گتھا ہوتی دکھائی گئی ہیں لیکن بعد میں شام کے وقت سب کچھ بھول بھال ایک دوسرے سے ہمدردی کرتی اور دکھ درد بانٹتی دکھائی گئی ہیں۔ اس حوالے سے صادق حسین کا یہ افسانہ "احمد ندیم قاسمی" کے افسانے "مائیں" سے مماثلت رکھتا ہے۔ جس میں دو خواتین ہمسائیاں

چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑتی جھگڑتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کے شوہروں کے تعلقات دوستانہ ہیں اور جب دونوں گھرانوں میں سے کسی گھرانے کے فرد کو کوئی تکلیف یا مصیبت پیش آتی ہے تو یہی جھگڑنے والی خواتین لڑائی جھگڑے کو یکسر بھلا کر ایک دوسرے کی تکلیف اور دکھ میں شامل ہو جاتی ہیں۔ مذکورہ افسانے میں بھی یہی عنصر غالب دکھایا گیا ہے۔

صادق حسین نے خاندان برادری کا اور محلہ داری کے نظام کا ذکر کرتے ہوئے اس بات کی بھی نشاندہی کی ہے کہ ایسے محلے اور برادری کی بچیاں جب دوسرے محلے جاتی ہیں تو وہ اس باہمی میل جول کو جواُن کو ماں باپ کے گھرانے میں میسر تھااُسے نہیں بھول پاتیں۔ خاندان برادری کی لڑکیوں کو اس حوالے سے مشکلات کا سامنا رہتا ہے۔ چاہے وہ کتنی ہی خوشحال زندگی کیوں نہ بسر کر رہی ہوں ان کے آگے پیچھے روپے پیسے کی ریل پیل ہی کیوں نہ ہو۔ وہ دوسروں سے بات چیت کے لیے ترستی رہتی ہیں اور ایسے میں ان کو دولت اور روپیہ پیسہ بھی بے معنی لگتا ہے جیسے افسانے میں ''جانوں'' کا بچپن لڑکپن اور جوانی اس تیسری حویلی میں گزرا لیکن شادی ہو کر گاؤں چلی جاتی ہے تو وہ جب کسی خاص موقع پر میکے کا چکر لگاتی ہے تو اپنی سہیلیوں سے اپنے احساسات کا اظہار کر کے افسردہ ہو جاتی ہے۔ اور انہیں بتاتی ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے اس کے سسرال میں ہر طرح کی نعمت موجود ہے لیکن اس کے باوجود اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اس کے پاس کچھ بھی نہیں۔ "میرے سسرال میں گندم کی بوریاں ہیں، خالص دودھ، دہی، لسی اور مکھن ہے۔ یہ سب کچھ ہے مگر کچھ بھی نہیں" [۲۱] کیونکہ بقول اس کے انسان کو صرف روپے پیسے یا کپڑے جوتوں کی ضرورت ہی نہیں ہوتی خوشگوار زندگی گزارنے کے لیے دوسروں کے ساتھ گھلنا ملنا اور بات چیت کرنا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ لیکن بد قسمتی سے جانوں کو سسرال میں میکے والا ماحول میسر نہیں آتا۔ "بندے بشر کی ضرورت صرف روٹی کپڑا ہی نہیں کبھی کبھی انسان کا جی چاہتا ہے کہ وہ کسی سے دل کی بات کرے گیت گائے، ناچے۔" [۲۲] یوں اس افسانے میں صادق حسین نے معاشرتی زندگی کے حوالے سے اس باریک پہلو کی بھی نشاندہی کر دی ہے جو انسان کی بنیادی ضروریات میں سے ایک ہے۔ یعنی باہمی میل جول کا ہونا سماج کا خاصا ہے۔ کیونکہ انسان زندہ رہنے کے لیے دوسروں پر بھی انحصار کرتا ہے۔ فرد تنہا کچھ بھی نہیں۔ وہ جو کچھ بھی ہے اس کی پہچان معاشرے کے دم قدم سے ہے۔ اس کے علاوہ صادق حسین نے مذکورہ افسانے میں اس معاشرتی حقیقت کو بھی بے نقاب کیا ہے کہ روپیہ پیسہ انسان کو سکھ مہیا نہیں کر سکتا۔ یہ انسانی رویے بھائی چارہ اور خوش خلقی ہے جو انسان کو مطمئن اور پر سکون بناتے ہیں۔

مزید برآں اس افسانے کے ذریعے صادق حسین نے سیاسی رہنماؤں کو تنقید کا نشانہ بھی بنایا ہے۔ جو غریب عوام کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر انہیں سبز باغ دکھاتے ہیں اور جھوٹے دعوے کرتے ہیں کہ الیکشن جیتنے کے بعد وہ ان

کی فلاح و بہبود کے لیے کام کریں گے لیکن اختیارات ملتے ہی اپنا رنگ بدل لیتے ہیں۔ افسانے میں ملک الطاف بھی بلدیہ کے الیکشن میں کھڑا تھا اور کامیاب بھی ہوا تھا۔ اسے کامیاب کروانے میں تیسری حویلی کے افراد کا بڑا ہاتھ تھا لیکن اختیار ملتے ہی ملک الطاف دوبارہ لوٹ کر اس علاقے کی طرف نہ آیا جسکی وجہ سے تیسری حویلی کے افراد غم و غصہ کی کیفیت میں تھے۔ اب بھی وہ تیسری حویلی میں الیکشن اور ووٹوں کی غرض سے لوٹتا ہے۔ شاہ جی سے معافیاں مانگتا ہے اور اپنی چاپلوسی کی وجہ سے کامیاب ہو جاتا ہے۔ تیسری حویلی کے سادہ لوح افراد ایک بار پھر الطاف کے نام کے نعرے لگاتے ہیں لیکن جب وہ اپنی تقریر میں تیسری حویلی کے افراد کو کیڑے مکوڑوں سے تشبیہ دیتا ہے تو تیسری حویلی کے بچے بچے کی غیرت جاگ جاتی ہے اور جمہوریت کا تصور جو کچھ دن پہلے ہی انہیں شاہ جی نے دیا تھا واضح ہو جاتا ہے اس طرح وہ اپنا فیصلہ تبدیل کر لیتے ہیں اور سب مل کر تہیہ کر لیتے ہیں کہ وہ ملک الطاف کے گھر کے دروازے توڑ دیں گے۔

> "لڑکوں کے سرغنہ نے تیسری حویلی کے ڈربوں پر نگاہ ڈالی اور پھر اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ سب مل کر ملک الطاف کے گھر کے دروازے توڑ دیں گے۔ اسے گریبان سے پکڑ، چوراہے میں کھڑا کر کے للکار کر کہیں گے۔ ملک صاحب! اب ہم کیڑے مکوڑے نہیں۔" ۱۲۳

افسانے کا اختتامی حصہ زیادہ توجہ طلب ہے۔ جس میں صادق حسین نے ایک اہم بات واضح کی ہے کہ انسان کا معاشرتی مقام چاہے جو بھی ہو ہر فرد کو اپنی عزت اور انا عزیز ہوتی ہے اور وہ اپنی بے عزتی بالکل برداشت نہیں کر سکتا۔ افسانہ تیسری حویلی میں صادق حسین قاری کے لیے نئے معاشرتی پہلوؤں کا ادراک بھی چھوڑ گئے ہیں۔ موضوعاتی لحاظ سے افسانہ وسیع تر مفہوم رکھنے کے ساتھ سماجی اکائی کی عمدہ ترین مثال بھی پیش کرتا ہے۔ صادق حسین نے اس افسانے کے ذریعے یہ بھی باور کرایا کہ نوجوان نسل اپنے آباواجداد کی نسبت زیادہ تیز اور باعمل ہوتے ہیں۔ وہ جوش و خروش کا مظاہرہ کر کے اپنے لیے راہوں کا انتخاب کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ افسانے کے اختتامی حصے میں ملک الطاف کے خلاف آواز بلند کرنے کے لیے نوجوان نسل ہی آگے بڑھتی ہے۔

"روپ ونتی" افسانہ صوبہ بنگال سے تعلق رکھنے والے ہندو گھرانے کے گرد گھومتا ہے۔ جسکا موضوع محبت اور محبت میں ناکامی ہے۔ صادق حسین نے پیار محبت کی روایتی کہانی کو ہندی سماج کے ساتھ مربوط کر کے معاشرتی رویوں اور کھوکھلے پن کو انوکھے پیرائے میں بیان کیا ہے۔

معاشرہ خواہ ہندی ہو یا اسلامی، مغربی ہو یا مشرقی سماجی رویے اور رشتے معاشرے کو استحکام بخشنے میں اپنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ عمر فاروق سماجی رویوں اور رشتوں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"سماجی رشتے اور باہمی وابستگیاں صرف محسوس کیے جا سکتے ہیں دیکھے نہیں جا سکتے۔ سماجی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت معاشرتی تعلقات اور باہمی ہم آہنگی بھی ہے۔ کیونکہ معاشرے کا ہر فرد ایک دوسرے پر انحصار کرتا ہے۔"[۱۲۴]

باہمی ہم آہنگی اور رشتوں کی نزاکت کو سمجھنے کی صلاحیت رکھنے والے معاشرے کامیاب رہتے ہیں لیکن یہی سماجی روابط اور رویے جہاں معاشرتی تشکیل کا فریضہ انجام دیتے ہیں وہیں معاشرتی سطح پر رشتوں کے انتشار کا باعث بھی بنتے ہیں۔ زیر مطالعہ افسانے میں روپ ونتی کے خاندان کو اجاڑنے کے پیچھے بھی ظالم سماج کا ہی ہاتھ تھا۔ وہ افراد جو افسانے کے ابتدائی حصے میں روپ ونتی کے خاندان کو اجاڑنے کا سبب بنتے ہیں افسانے کے اختتام میں وہی روپ ونتی کا احترام کرتے ہیں۔ عمومی طور پر دیکھا گیا ہے کہ معاشرے میں پیار عشق کرنے والوں کو تنقیدی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جیسے افسانے میں لوگ روپ ونتی اور بانسری بجانے والے نوجوان کے بارے میں غلط رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ ابتداء میں یہی لوگ روپ ونتی پر انگلیاں اٹھاتے تھے اور جب اُس کا پورا خاندان برباد ہو گیا اور حالات کی ستم ظریفی کی تاب نہ لاتے ہوئے روپ ونتی پاگل ہو گئی تو یہی لوگ اُسے احترام کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ اگر ابتداء ہی میں وہ سمجھداری کا مظاہرہ کرتے تو آج روپ ونتی ہنسی خوشی زندگی گزار رہی ہوتی۔ معاشرے کے اس بدلتے روپ کو صادق حسین نے یوں بیان کیا۔

"لگائی بجھائی کانا پھوسی تہمت بہتان ان کالی لکیروں پر اجالا چھانے لگا۔ محنت کش دھان کے کھیتوں میں پکے ہوئے خوشے چوم کر کہتے ہمیں تو ان سے روپ ونتی کی خوشبو آتی ہے۔ بوڑھا سنار سونے کا ڈلا گلاتے ہوئے کہتا روپ ونتی پریت کی کٹھالی میں پگھل کر نیا روپ اختیار کر رہی ہے۔ عورتیں گاگریں لے کر تالاب میں اشنان کرنے اور جل بھرنے جاتیں تو روپ ونتی کا ذکر چھیڑ جاتا۔ ان کی باتوں سے احترام کی خوشبو آتی۔"[۱۲۵]

صادق حسین نے متعلقہ افسانے میں معاشرتی حوالے سے ایک اور اہم پہلو کو بھی نمایاں کیا ہے کہ معاشرے میں تنہا عورت کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ خاص کر بیوہ عورت سے اپنے پرائے سب ہی آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ اس لیے ایک عورت کے لیے معاشرے میں سکون سے زندگی بسر کرنے کے لیے سہاگ راج بھی بڑی نعمت کا درجہ رکھتا ہے۔ جیسے افسانے میں روپ ونتی کی ماں کو بھی اس بات کا شدت سے احساس ہونے لگتا ہے۔ "شنکر دادا کی موت کے بعد جوں جوں وقت گزرتا گیا موسی کی سوچ بدلتی گئی۔ اسے شدت سے احساس ہونے لگا مرد اچھا ہو یا برا مر جائے تو عورت جیتے جی مر جاتی ہے۔"[۱۲۶] اس کے علاوہ معاشرے میں تنہا جوان لڑکی کا وجود خطرے سے خالی نہیں ہوتا ظالم سماج میلی آنکھوں سے تاکنے کے علاوہ اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ جیسے ماں باپ کے انتقال کے بعد روپ ونتی کو ہراساں کرنے کے لیے چکرورتی اس کے گھر کے چکر لگاتا ہے لیکن روپ ونتی بھو کی شیرنی

کی طرح اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرتی ہے۔"روپ وتنی کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔غصے سے دانت پیسنے لگی۔وہ بھوکی شیرنی کی طرح اس پر جھپٹی۔"۲۷ افسانے میں کالیا(پالتو کتے) کی موجودگی اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ انسانوں سے زیادہ وفا حیوانوں میں ہوتی ہے جو ہر وقت ہر مشکل میں انسان کا ساتھ نبھاتے ہیں۔افسانے میں کالیا آخر تک روپ وتنی کے ساتھ رہتا ہے اور اسکی حفاظت کرتا ہے۔

صادق حسین نے ہندی سماج میں پروان چڑھنے والی محبت کی داستان اور اس کے المیہ انجام کے ذریعے انسانی جذبات اور رویوں کو بیان کیا ہے۔اس کے علاوہ ہندی سماج سے وابستہ بہت ساری باتوں اور ان کے باہمی میل جول اور طرزِ معاشرت سے بھی آگہی دلائی ہے۔اُن کی عبادات اور اعتقادات کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے ایک مکمل سماج کا تصویر تمام تر جزئیات کے ساتھ پیش کی ہے۔یہ افسانہ اپنے انداز کا منفرد اور انوکھا افسانہ ہے جسکی کہانی روایتی عشق و محبت پر مبنی ہے لیکن صادق حسین کے اندازِ بیاں کی چاشنی نے اُسے پر تاثیر بنادیا ہے۔

صادق حسین کے افسانوں کا مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ انہوں نے موضوع کا تعین کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ بچار سے کام لیا ہے۔وہ پہلے فکر و خیال کے تانے بنتے ہیں پھر کہانی کی theme یعنی مرکزی خیال کو احاطۂ فکر میں لاتے ہیں اور اس کے بعد عنوان دے کر کہانی ترتیب دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں آہنگ اور ہمہ گیریت نظر آتی ہے۔صادق حسین کے افسانوی موضوعات کے حوالے سے سید وقار عظیم لکھتے ہیں:

> "ان کے افسانوں کو پڑھ کر فنی نقطہ نظر سے ان کا تجزیہ کیا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو اپنے ہم عصروں میں غالباً سب سے زیادہ صادق حسین نے اس بات کی اہمیت جانی ہے کہ افسانہ نگار کو لکھنے سے پہلے واضح طور پر یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس کی کہانی کا موضوع(theme)اور بنیادی خیال کیا ہے۔موضوع کے واضح تعین کے بعد اس کی فنی ترتیب و تنظیم کیا ہے۔اس معاملے میں صادق حسین خاصے اہتمام سے کام لیتے ہیں اور اس لیے ان کی کہانیوں کی ابتداء اور ان کا خاتمہ اور ان دونوں کے درمیان اس کا متن سب کے نقوش تیکھے اور واضح ہوتے ہیں۔اور سب مل کر پڑھنے والے کے ذہن پر ایک گہرا تاثر قائم کرتے ہیں یہ ساری باتیں اہتمام،انہماک، محنت اور سوچ بچار کے بغیر ممکن نہیں۔"۲۸

گویا صادق حسین کے افسانوں کی نمایاں خصوصیت وہ منصوبہ بندی اور فکر و خیال کی ترتیب ہے۔جو وہ افسانہ تحریر کرنے سے پہلے کرتے ہیں افسانے میں کہانی پن کو برقرار رکھنے کے لیے وہ ایک مکمل لائحہ عمل اختیار کرتے ہیں اور یہی بات ان کو دوسرے افسانہ نگاروں سے ممتاز کرتی ہے۔

افسانہ "قیدی" موضوع کے اعتبار سے ظلم و جبر کی چکی میں پستے غریب اور مجبور طبقے کی کہانی ہے۔جنہیں بااثر افراد اپنے ماتحت بنا کر انھیں سیاسی و معاشی مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

خاص کر دیہاتی سادہ لوح نوجوان جو روزگار کی تلاش میں شہروں کا رخ کرتے ہیں ایسے گروہوں یا تنظیموں کے کارکنوں کا تر نوالہ بن کر اپنی زندگیوں کو داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ جیسے مذکورہ افسانے میں شیر وا ایک دیہاتی جوان ہے جس کا کوئی والی وارث نہیں ہوتا۔اور روپیہ کمانے کی غرض سے شہر کا رخ کرتا ہے لیکن بات نہیں بنتی۔ وہ ہر طرح کی مزدوری کرتا ہے گنڈیریاں بیچتا ہے، ریڑھی لگاتا ہے لیکن معاشی ضروریات کی تکمیل نہیں ہو پاتی اور بالآخر خفیہ تنظیم کے سر گرم رکن "سائیں مراد" کے ہتھے چڑھ جاتا ہے اس طرح روپے پیسے کی تو ریل پیل ہو جاتی ہے لیکن اُس کی آزادی سلب ہو جاتی ہے۔اُسے ہر وقت چوکس رہنا پڑتا ہے کیونکہ جس گروہ سے وہ تعلق رکھتا ہے وہ اس پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں۔ کیونکہ وہ تنظیم سیاسی حکمرانوں سے ٹکر لیتی ہے اُن کے سیاسی نظام کو متاثر کرنے اور سیاسی ساکھ بٹھانے کے لیے وہ طرح طرح کے ہنگامے اور فسادات کروانے میں ملوث ہوتی ہے۔ایسی تنظیمیں غریبوں کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ کر اُن کے مسیحا بننے کے چکروں میں در پردہ انہیں مختلف النوع مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ ان سے طرح طرح کے جرائم کروا کر جیل کی سلاخوں میں دھکیل دینے کا سبب بنتی ہیں۔اور جو ایک بار اس گروہ ممبر بن گیا دوبارہ اُس سے چھٹکارا حاصل کرنا ممکن نہیں رہتا کیونکہ تنظیم کے سر گرم رکن ایسے لوگوں کو باغی قرار دے کر قتل کروا دیتے ہیں اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔

افسانے کے موضوع کی وضاحت صادق حسین نے افسانے کے اختتام میں ہی کر دی۔ مبہم انداز اختیار کرتے ہوئے صادق حسین نے معاشرے کے مظلوم، غریب اور بے بس افراد کو قیدی قرار دیا ہے۔ کیونکہ ایسے مجبور افراد جن پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا ہو وہ کبھی آزاد نہیں رہ سکتے اور نہ آزاد کہلوائے جا سکتے ہیں۔ایسے افراد نفس کے قیدی، ضروریات کے قیدی، مجبوریوں کے قیدی ہوتے ہیں جن کا استحصال ہر دور میں ہر طرح کے سماج میں کیا جاتا رہا ہے۔

> "ہاں، ہمارا پیر و مرشد کہتا ہے کہ جیل کے اندر اور باہر ہم سب قیدی ہیں۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ ہم اپنے اپنے بچے کا نام قیدی رکھیں گے تاکہ ایک نام پکارو تو سب پلٹ کر دیکھیں۔اور پھر ایک دن قیدیوں کی یہ نسل ہتھکڑیاں اور بیڑیاں کاٹ کر بھوک اور افلاس کے خلاف فیصلہ کن جنگ لڑے گی" [۲۹]

افسانے کا اختتام اپنی اثر انگیزی اور معنی آفرینی کے لحاظ سے شاندار ہے۔افسانے کا اختتام المیہ ہے۔ڈھکے چھپے الفاظ میں شیر وا اپنے محسوسات اور خیالات کا اظہار کر کے قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ معاشرے کے ستم گزیدہ افراد آخر کب تک مفلسی کے ہاتھوں مجبور ہو کر طاقتوروں کا شکار بنتے رہیں گے؟ صادق حسین نے اسی نکتہ کو اجاگر کیا ہے۔بحوالہ موضوع صادق حسین کا یہ افسانہ اُن کے دیگر افسانوی موضوعات سے منفرد نوعیت کا ہے۔جو سماجی مجبوریوں کو پیش کر کے عام افراد کے سماجی شعور کو جگانے کی کھلی دعوت دیتا ہے۔

ادب میں چونکہ جمالیاتی اقدار کا ہونا بھی ناگزیر ہے۔اس لیے صادق حسین کا ذوق سلیم بھی اعلیٰ پائے کا ہے۔وہ جمالیات سے پوری طرح سے واقف تھے۔اسی لیے انھوں نے اپنے افسانوں میں ہر طرح کے موضوعات پر قلم اٹھایا۔ سماجی زندگی میں انسان کو اولین حیثیت حاصل ہے کیونکہ معاشرے کی بنیاد ہی افراد ہیں لہذا انسانی زندگی کا انحصار جہاں دیگر سماجی پہلوؤں پر ہے وہاں محبت بھی ایک لازمی جزو کی حیثیت رکھتی ہے۔ محبت رشتوں کی مضبوطی اور سماجی روابط کو قائم ودائم رکھنے کا واحد سہارا ہے۔ لہذا معاشرتی زندگی اور شخصی زندگی کا نکھار محبت کے دم قدم سے ہے اس لیے صادق حسین نے جہاں دیگر حساس اور سنجیدہ پہلوؤں کو موضوعات میں جگہ دی وہاں محبت جیسا لطیف پہلو بھی اُن کے نگاہوں سے اوجھل نہیں رہا۔

افسانہ "ہیلن آف ٹرائے" کا موضوع محبت ہے۔ پوری کہانی ایک افسانوی کردار کے گرد گھومتی ہے۔ افسانہ "ہیلن آف ٹرائے" میں روبی کی محبت اور احساسات کے ذریعے صادق حسین نے رومانوی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ بنیادی طور پر انہوں نے قدیم یونانی تہذیب کے رومانوی کردار اور ملکہ حسن "ہیلن" کی یاد تازہ کی ہے اور اسکا تعلق موجودہ دور کی دوشیزہ سے قائم کر کے قدیم یونانی تہذیب اور ادب سے آگاہی دلائی ہے۔ درحقیقت ہیلن آف ٹرائے۔ یونانی شاعر "ہیومر" کی نظم "ایلیڈ" کا کردار ہے۔ جو حسن میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتی اور جس کے لیے ٹروجن کی لڑائی دس سال تک لڑی گئی تھی۔ صادق حسین نے اسی ملکہ حسن ہیلن کے کردار کو اپنے افسانے کا عنوان دیا۔ "ہیلن آف ٹرائے" میں روبی کی شخصیت کے ذریعے انہوں نے اعلیٰ طبقہ کے آزاد خیال سماج کی نمائندگی بھی کی ہے۔ روبی پاکستانی سماج کے اونچے خاندان سے تعلق رکھنے والی خود مختار لڑکی ہے جو حسن میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتی۔ وہ اپنے حسن سے آگاہ ہے۔ قدیم یونانی تہذیب سے تعلق رکھنے والے کردار "ہیلن آف ٹرائے" پر تھیسز کرنا چاہتی ہے۔ اور اپنے تحقیقاتی کام کے لیے یونان کا دورہ بھی کرتی ہے وہاں کے لوگ بھی اُسے ہیلن قرار دیتے ہیں اور اسکی خوبصورتی سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ انگریزی پروفیسر "رونلڈ" بھی اُسے یونان کی ملکہ ہیلن کا خطاب دے دیتا ہے یہ تمام چیزیں اسکی نفسیات پر اس قدر اثر انداز ہوتی ہیں کہ وہ سچ مچ خود کو ہیلن تصور کرتی ہے جسے فتح کرنے کے لیے کوئی شہزادہ دس سال جنگ لڑے۔ ہیلن کی شخصیت کا روبی کی شخصیت پر نفسیاتی اثر پڑتا ہے۔ لیکن جلد ہی اُسے زندگی میں محبت کے ساتھ ساتھ وقت کی قدر و قیمت سے آگاہی بھی حاصل ہو جاتی ہے کہ وقت بہت جلدی گزرتا جا رہا ہے۔ وقت کی قدر و قیمت اور حقیقت کے آشکار ہو جانے پر وہ بہت باریکی سے سوچنے لگتی ہے اور باباجی کی باتوں کو ذہن میں بار بار دہراتی ہے۔ "بیٹی ہر جاندار پر بڑھاپا آتا ہے۔ ایک دن وہ مر جاتا ہے۔ اسی طرح تہذیبیں مٹ جاتی ہیں۔ روایتیں ختم ہو جاتی ہیں صرف سچ زندہ رہتا ہے۔" ۱۳۰ باباجی کی باتیں اس کے دل ودماغ پر ایسا اثر کرتی ہیں کہ وہی خیالوں کی

دنیا میں رہنے والی روبی اپنی گزرتی ہوئی عمر کے بارے میں سوچ کر پریشان ہو جاتی ہے۔"روبی نے یوں محسوس کیا جیسے بڑھاپا گھور گھور کر اس کی طرف دیکھ رہا ہو اور تیزی سے گزرتا ہوا وقت اس کے چہرے پر لکیریں کھینچتا چلا جا رہا ہو"[۱۳۱] افسانے کے اختتامی حصے میں روبی ایک اجنبی کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے اور دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر اُس کی گود میں سر رکھ لیتی ہے۔ یہ کہانی حقیقی زندگی سے دور ایک فرضی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ افسانے میں جس طرح مری کے ہوٹل میں جو افراد، شہزادے کا بے تابی سے انتظار کرتے ہیں۔ اور اس کے علاوہ شہزادے کے بارے میں لوگوں کے تاثرات وغیرہ، یہ تمام باتیں غیر معمولی اور غیر حقیقی معلوم ہوتی ہیں جو صرف تخیلاتی یا تصوراتی دنیا میں وقوع پذیر ہو سکتی ہیں۔ اس حوالے سے ""ہیلن آف ٹرائے"" افسانہ کسی اُردو فلم کی فرضی کہانی کا درجہ اختیار کر جاتا ہے جس میں محبت کے عنوان اور لطیف جذبات کو صادق حسین اپنے نوکِ قلم سے پوری فنی چابکدستی سے کے ساتھ سپردِ قلم کیا ہے۔

افسانہ "ثانی انکل" کے ذریعے صادق حسین نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے محبت کبھی مرتی نہیں، یہ خوبصورت یادوں کی صورت میں ساتھ رہتی ہے۔ چاہے یہ محبت میاں کی بیوی سے ہو یا بیوی کی شوہر سے یا ایک والدین کی اولاد سے یا پھر اولاد کی والدین سے؛ یہ ایک لطیف جذبہ ہے اور یہی وہ جذبہ ہے جس کے ذریعے انسانوں کے دلوں کو فتح کیا جا سکتا ہے، "ثانی انکل" درحقیقت ایک سرکاری افسر کا بچوں کی طرف سے پیار سے رکھا جانے والا نام ہے۔ "ثانی انکل" کے ذریعے صادق حسین نے سماجی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے قانونِ فطرت کی پاسداری کو ضروری اور لازمی قرار دیا ہے۔ معاشرے میں خیر اور بھلائی کا درس دینے والے افراد نعمتِ خداوندی سے کم نہیں ہوتے اُن کے عادات واطوار، اخلاق اور رکھ رکھاؤ معاشرے میں انہیں باعزت اور منفرد مقام عطا کرتے ہیں۔ جیسے ثانی انکل اونچے طبقے سے تعلق رکھنے والا ایک ریٹائرڈ آدمی جو بہت سارے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ چکا ہے اپنے اخلاق اور کردار سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالیتا ہے۔ علاقے کے تمام افراد اس کے اخلاقِ حسنہ سے متاثر ہو کر اس کا ادب واحترام کرتے ہیں۔ "اس علاقے کے باسی اب تو اس شخص کی صورت سے مانوس ہو چکے تھے۔ بچی کھچی اجنبیت کی دھند بھی چھٹتی جا رہی تھی۔"[۱۳۲] اور یوں ثانی انکل تنہا ہو کر بھی تنہا نہیں رہتا۔

صادق حسین نے اس افسانے کے ذریعے جس سماجی پہلو کی نشاندہی کی ہے وہ یہ کہ یوں تو تنہا انسان کا معاشرے میں زندگی گزارنا دشوار ہو جاتا ہے لیکن اگر انسان چاہے تو زندہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تنہا زندگی میں بھی رنگ بکھیر سکتا ہے۔ انسان اپنے روز مرہ کے مشاغل کے علاوہ دوسروں کے ساتھ تعلقات استوار کرلے اور خوش اخلاقی کا ثبوت دے تو اس کی بے رونق اور بے رنگ زندگی میں بھی بہار آسکتی ہے۔اور قدرت انسانی رشتوں کی

صورت میں اُسے انعام سے بھی نوازتی ہے۔ جیسے ثانی انکل کا کسی بھی شخص سے خون کا رشتہ نہیں ہوتا لیکن پھر بھی سب اُسے احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اُسے اپنا سمجھتے ہیں۔ وہ تنہا ہونے کے باوجود بھی تنہائی کو خود پر غالب نہیں آنے دیتا۔ لہٰذا اپنا زیادہ تر وقت گھر سے باہر گزارتا ہے قدرت اُسے "نومی" کی صورت میں انعام دیتی ہے جس کے والدین بھی اُسے اپنے گھر کے بزرگ کی طرح اہمیت دیتے ہیں اور پیار کرتے ہیں اور نادانستہ طور پر ثانی انکل "نومی "سے سگے پوتوں جیسا پیار کرنے لگ جاتا ہے اور اس کی زندگی بچانے کے لیے اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیتا ہے۔" ثانی انکل کی شریانوں میں دوڑتا، صاف خون جوش میں آگیا قانونِ فطرت کی اطاعت کرنے والے جسم میں قوت عود آئی وہ نقاب پوش سے گتھم گتھا ہو گیا۔"[۱۳۳] افسانے میں محبت کے لطیف جذبے کو صادق حسین نے جداگانہ انداز میں بیان کیا ہے۔

دوسری طرف صادق حسین نے اس افسانے کے ذریعے بہت سی سماجی باریکیوں کی نشاندہی بھی کی ہے۔ مثلاً انسان جب کسی رتبے پر فائز ہوتا ہے تو سب جی حضور جی حضور کرتے ہیں اور وفاداری کی جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں ۔ لیکن جونہی انسان اس عہدے سے سبک دوش ہوتا ہے تو سب آپ کو بھول جاتے ہیں جھک جھک کر سلام کرنے والے بھی اپنی راہیں بدل لیتے ہیں۔ جیسے ثانی انکل جب اعلی درجے کی ملازمت کرتے تھے تو سب ان کے آگے پیچھے پھرتے تھے لیکن جونہی انھوں ملازمت کو خیر باد کہا تو انھی مداحوں نے نگاہیں بدل لیں ۔ سماجی رتبے اور مقام کی معاشرے میں کوئی قدر نہیں اگر قدر ہے تو انسانی رویوں کی۔ یہی رویے اخوت، مساوات اور بھائی چارے کی فضا قائم کرنے میں مددگار ہوتے ہیں۔ اور یہی رویے اگر منفی صورت اختیار کر جائیں تو رشتوں میں دراڑیں لانے کا سبب بھی بنتے ہیں۔ اس کے علاوہ معاشرتی سطح پر اضطراب اور بے چینی اور انتشار پھیلاتے ہیں۔ معاشرے میں انھی لوگوں کی قدر ہوتی ہے جو اخلاق حسنہ سے دوسروں کا دل جیت لیتے ہیں۔ جیسے افسانے میں ثانی انکل معمولی ملازم سے لے کر ہر چھوٹے بڑے فرد سے خوش اخلاقی سے پیش آتا ہے اور اُن کا دل جیت لیتا ہے۔ صادق حسین نے اس افسانے کے ذریعے واضح کر دیا کہ واقعی وہ لوگ جو دوسروں کے لیے پیار کا جذبہ رکھتے ہیں وہ کبھی ٹوٹ کر بکھرتے نہیں اور مر کر بھی دلوں میں زندہ رہتے ہیں۔

کسی بھی ادیب اور مصنف کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی تحریروں کے ذریعے ایسا تاثر قائم کرے جو انسانی زندگی کے تقاضوں کو نہ صرف پورا کرے بلکہ معاشرتی سطح پر اخوت و مساوات اور بھائی چارے کے رشتے کو مضبوط اور مستحکم بھی بنائے۔ کیونکہ معاشرتی ارتقاء کے لیے یہ ان تمام باتوں کا ہونا ضروری ہے۔ ڈاکٹر محمد اشرف کا کہنا ہے یہ

بات درست ثابت ہوتی ہے کہ "حیات انسانی کے وقار و عظمت، باہمی رفاقت و یگانگت کے جذبات کو مہمیز کرنا کل کی طرح آج بھی از حد ضروری ہے تاکہ انسانی زندگی اپنے اعلیٰ وارفع مقام تک پہنچ سکے۔"[۱۳۴]

بلا شبہ صادق حسین اس افسانے میں اپنے دیگر افسانوں کی طرح حیاتِ انسانی کے وقار اور عظمت کو برقرار و قائم رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ افسانہ ٹافی انکل کے ذریعے انہوں نے انسانیت کو اعلیٰ وارفع مقام تک پہچانے والی بنیادی باتوں جن میں سے میل ملاپ اور خوش خلقی سرفہرست ہیں سے آگاہی دلائی ہے اس طرح آپ نے انسان دوست افسانہ نگار ہونے کا ثبوت بھی دیا ہے۔ اس افسانہ کو پڑھ کر اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ صادق حسین کا سماجی شعور صرف نچلے متوسط طبقے تک محدود نہیں بلکہ انھوں نے ہر طرح کے سماج کو اپنے احاطۂ تحریر میں لاکر منصف ادیب کے فرائض انجام دیے ہیں۔

افسانہ "سپر پاور" کا موضوع وہ استحصال ہے جو برس ہا برس طبقہ وارانہ تقسیم، قدیم ہندوستانی، زرعی سماج اور انگریزی حکومت کے نو آبادیاتی نظام میں کمزور طبقے کے ساتھ روا رکھا گیا۔ اور جس کے نتیجے میں سردار شیر افضل جیسے لوگ وجود میں آئے جن کے افعال و اعمال سے گھن محسوس ہوتی ہے۔ جن کی شخصیت سے رعب کی بجائے غرور کی ابھرتی ہوئی جھلک نمایاں ہوتی نظر آتی ہے۔ استحصالی معاشرے میں سرمایہ دار ہی تمام علاقے کی قسمت کا مالک ہوتا ہے اور اُس کے علاقے یا گاؤں میں کوئی اور اُن کا مدمقابل ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ گاؤں کے وڈیرے کا ہر فیصلہ ہر بات پتھر پر لکیر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ افسانہ "سپر پاور" کا عنوان ہی موضوع کی نشاندہی کرتا ہے۔ سماج چاہے دیہی ہو یا شہری، مشرقی ہو یا مغربی اس میں اہمیت صرف طاقت اور پیسے کو حاصل ہے۔ جو شخص جتنا صاحبِ اختیار اور دولتمند ہوگا وہی معاشرے پر غالب ہوگا۔ دولت اور پیسے کے غرور میں وہ جابرانہ اور تحکمانہ انداز و اطوار اختیار کر کے مظلوم اور بے بس انسانوں پر اپنی طاقت کا رعب جمانا وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ جیسے افسانہ سپر پاور میں سردار شیر افضل اپنے علاقے کو اپنی ملکیت اور جاگیر سمجھنے کے ساتھ ساتھ وہاں کے افراد کو بھی اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔ جو اُس کے حکم کے تابع رہتے ہیں اور اسی میں اُن کی بقاء اور سلامتی ہے۔ یہاں تک کے گاؤں کے بزرگ بھی سردار کے حکم کی تعمیل کو فرضِ عین سمجھتے ہیں۔

"سردار کا حکم ماننا لازم ہے ایک بزرگ نے کہا اس کے بدلے ہمیں کتنا سکھ ملتا ہے۔ گاؤں میں کتنا امن امان ہے۔ کوئی شخص ہماری بہو بیٹیوں کو آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔"[۱۳۵]

صادق حسین نے سماج میں طاقت کی اہمیت کو واضح کر کے سماجی تفاوت اور طبقاتی تقسیم کی نشاندہی کی ہے۔ سردار شیر افضل پورے گاؤں پر اپنا حق ملکیت جتا کر اپنا قانون رائج کرتا ہے کہ جب بھی وہ گاؤں سے گزرے تو سب کے گھروں کے کواڑ احتراماً بند کئے جائیں۔ صادق حسین نے اس افسانے میں سپر پاور اور جسکی لاٹھی اُس کی بھینس جیسی

ضرب المثل کی وضاحت کر دی ہے۔ دوسرا نکتہ جو اس افسانے میں انہوں نے اٹھایا وہ دنیا مکافاتِ عمل ہے۔انسان جو اعمال اس دنیا میں کرتا ہے اس کا پھل پاتا ہے۔ جیسے شیر افضل نے سماج میں اپنی طاقت اور دولت کی دھاک بٹھائی تھی اور اپنی طاقت کے بل بوتے پر ظلم روا رکھے۔آخر میں شہد کی مکھیوں کے کاٹنے سے اس کی موت واقع ہو جاتی ہے اور اس مشکل وقت میں کوئی بھی اس کا ساتھ دینے کو تیار نہیں ہوتا۔

صادق حسین نے بتایا ہے کہ قدرت کے فیصلوں کے آگے کسی کا بس نہیں چل سکتا۔ طاقت اور دولت کے نشے میں چور انسان چاہے کتنے ہی ظلم کیوں نہ روا رکھے اس پر جب اللہ کی پکڑ آتی ہے تو وہ فطرت کے فیصلوں اور طاقت کے آگے بے بس ہو جاتا ہے کیونکہ خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔اور غرور کا سر ہمیشہ نیچا ہوتا ہے۔

صادق حسین نے دیہاتی ماحول کے علاوہ وہاں کے دیگر سماجی و غیر سماجی امور پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ مثلاً اس افسانے کے ذریعے انہوں نے معاشرے میں پائی جانیوالی بے حسی اور مفاد پرستی کو بھی پیش کیا۔لوگ ذاتی مفادات کے لیے اُن لوگوں کو بھی استعمال کرتے ہیں جنہیں وہ نفرت اور حقارت سے دیکھتے ہیں۔ جیسے "کالو چمار" کی سیاہ فام رنگت کے باعث لوگ اُس سے نفرت کرتے ہیں لیکن جب کسی کو بھڑ، سانپ یا بچھو کاٹ جائے تو زہر نکالنے کے لیے اسی کالو چمار کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔" کبھی کبھی ہنگامی حالات میں لوگ اسے کندھوں پر بٹھا کر لے جاتے۔ یہ اس وقت ہوتا جب کسی کو سانپ ڈس لیتا۔" ۱۳۶؎

اس افسانے کے توسط سے ایک اہم بات جو نمایاں ہوئی وہ یہ کہ انسان کو اس کی ظاہری خامیوں کی وجہ سے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ ہر فرد خوبیوں اور خامیوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔خامیوں سے بھرے انسان کو بھی اللہ تعالیٰ نے کسی نہ کسی خوبی سے نوازا ہوتا ہے۔ یہ معاشرتی رویے ہیں جو یہ امتیازات اور حدود قائم کرتے ہیں۔

سپر پاؤر میں سیاسی حکمرانوں کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔آج کل کا سیاسی نظام مفاد پرستی اور دوغلے پن کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ یہاں بظاہر عوام کے خادم حکمران اندرونِ خانہ عوام اور سماج کی جڑیں کھوکھلی کرنے کا باعث بنتے ہیں اور اپنے مفادات کے پیشِ نظر اپنی پارٹیاں تبدیل کرتے رہتے ہیں۔" آج کل سیاست کی منڈی میں پھندیت، بلارے، اور مکھ کبوتر آسانی سے مل جاتے ہیں۔" ۱۳۷؎

سیاسی نظام بھی ایک منڈی کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ جہاں حکمران اپنے مفادات کو عزیز رکھتا ہے اور انھی مفادات کے پیشِ نظر اپنے ہی ساتھیوں کو دھوکا دینے میں مہارت رکھتا ہے۔

"قانون اور کانٹے "حساس موضوع کے حوالے سے حساس نوعیت کا افسانہ ہے۔ صادق حسین نے اس افسانے کے ذریعے بتایا ہے کہ رشوت خوری ہمارے معاشرے میں سرطان جیسے موذی مرض کی طرح ہماری رگوں

میں جڑ پکڑ چکی ہے۔ اگر کوئی شخص اس مرض سے بچا ہوا بھی ہو تو اس مرض کا شکار افراد اپنے مشوروں اور ترغیبوں سے اُس کے قدم ڈگمگانے میں مدد کرتے ہیں۔ یہ افسانہ معاشرتی حقائق کی کھلم کھلا ترجمانی کرتا ہے۔ کوئی بھی شخص چاہے کتنا ہی ایماندار اور ثابت قدم کیوں نہ ہوں زمانے کی ہوا اُسے خراب کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی۔ صادق حسین نے ہمارے معاشرتی المیے کو موضوع بنایا ہے اور اس حقیقت کو آشکار کیا ہے کہ سماج کے رنگ فرد کی شخصیت کو کس طرح متاثر کرتے ہیں۔ فرض شناسی اور ایمانداری کی راہ میں حائل رکاوٹیں انسان کی شخصیت کو اس حد تک متاثر کرتی ہیں کہ وہ تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی شخص فرائض کی انجام دہی میں ثابت قدمی کا مظاہرہ کرے بھی تو معاشرے کے دوسرے افراد اُسے "رشوت خور" کے لقب سے پکار کر اس کی عزت نفس کو مجروح کر دیتے ہیں۔ افسانہ "قانون اور کانٹے" کی کہانی فرض شناس پولیس کانسٹیبل کے گرد گھومتی ہے۔ جس کی تربیت میں ایمانداری شامل ہوتی ہے۔ لیکن جس پیشے سے وہ وابستہ ہوتا ہے اُس کے متعلق لوگوں کا رویہ ہمیشہ منفی ہی دیکھا گیا۔ اور دوران ملازمت اسے بہت سارے لوگوں نے رشوت لینے کی ترغیبات بھی دیں۔ لیکن شوکت نے ہر بار ان کے مشوروں کو جھٹلایا۔ یہاں تک کہ کانسٹیبل خلجی اسے رشوت خوری کے تمام گر بھی سکھاتا ہے۔ "گر میں بتاتا ہوں، عمل کرنا تمھارا کام ہے۔ آسامی دیکھ کر چالان کی دھمکی دو اور اپنا کام کرو۔ حرکت میں برکت ہے۔" ۱۳۸ لیکن شوکت ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کی باتوں اور مشوروں پر عمل کرنے سے گریزاں رہتا ہے۔ صادق حسین نے "ٹریفک پولیس" کے شعبے اور اُن سے متعلقہ افراد کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اور ساتھ یہ بھی واضح کیا ہے کہ کوئی بھی پیشہ بُرا نہیں ہوتا۔ اس پیشے کے متعلقہ افراد ہی اسے اچھا یا برا بناتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں رشوت خوروں کی کمی نہیں ہر پیشے ہر طبقے کے لوگوں کو اس کی لت لگ چکی ہے۔ لیکن پولیس کو خاص طور پر سماج میں رشوت خوری کی وجہ سے بدنام کیا ہوا ہے۔ صادق حسین نے افسانے میں پولیس کانسٹیبل اور اُن کی پیشہ ورانہ زندگی سے متعلق پوری فضا قائم کی ہے اور یہ نکتہ اٹھایا ہے کہ اچھے بُرے لوگ ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ یہ انسان کی فطرت پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ اچھے لوگوں کی نصیحت پر عمل کرے یا بُرے لوگوں کی ترغیبات کو خوش آمدید کہہ کر گھاٹے کا سودا کرے۔ صادق حسین کے افسانے خیر اور بھلائی کا درس دیتے ہیں۔ اس افسانے میں انھوں نے پولیس کانسٹیبل کے لڑکھڑاتے قدموں اور سوچوں کو پھسلنے سے بچا کر واضح کیا ہے کہ نیکی ہر حال میں نیکی رہتی ہے اور جیت ہمیشہ حق کی ہوتی ہے۔ رشوت خوری سے متاثرہ معاشرے کے اندر ثابت قدم اور ایماندار شخص کا موجود رہنا اور اپنے عزم پر ڈٹے رہنا بلاشبہ دل گردے کا کام ہے۔ لیکن جو لوگ آخرت کے انجام سے بے پرواہ ہوں اُن کے بھٹکنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگتی۔ کانسٹیبل شوکت ایماندار کانسٹیبل ہے جس کی تربیت میں یہ بات شامل تھی کہ رشوت خوری اور حرام کی کمائی سے دور رہے۔ کیو

نکہ اس کے دادا اور والد نے بھی اس پیشے سے وابستہ ہونے کے باوجود چند روپوں اور مالی آسائشوں کے عوض اپنی آخرت کو برباد نہیں کیا۔اور ثابت قدمی کا مظاہرے کرتے ہوئے رشوت خوری کی دلدل سے خود کو بچایا تھا۔اس کی ماں اسے تلقین کیا کرتی تھی کہ بیٹا تم نے بھی اپنے باپ دادا کی طرح ثابت قدمی کا مظاہرہ کرنا ہے۔"ہم نے پیسے جمع نہیں کیے۔اللہ نے عزت دی ہے تجھے بھی اپنے باپ دادا کی طرح اس پُل صراط سے گزرنا ہوگا۔"۱۳۹

افسانے قانون اور کانٹے کے ذریعے صادق حسین نے ایک اور سماجی پہلو سے پردہ اٹھایا ہے۔ایک کھرے اور ایماندار شخص کا معاشرے میں جینا مشکل ہوتا ہے لوگ اسے تنقیدی جملوں سے نوازتے ہیں۔اور یہاں تک کہ انسان پوری زندگی جس کیچڑ سے اپنا دامن بچائے رکھتا ہے وہاں دوسروں کی طرف سے ملنے والے تنقیدی جملے اس کی تمام ریاضتوں پر پانی پھیر دیتے ہیں۔ جیسے افسانے کے اختتامی حصے میں اوباش نوجوان ایماندار کانسٹیبل شوکت کو دس روپے کانوٹ دے کر اُسے رشوت خور کے لقب سے پکارتے ہیں تو اسکا دل خون کے آنسو روتا ہے۔

"موٹر سائیکل فراٹے بھرتی برابر سے نکل گئی۔کانسٹیبل شوکت وائرلیس پر پیغام دینے ہی لگا تھا کہ موٹر سائیکل اسی تیزی سے واپس آگئی۔سوار کے پیچھے بیٹھے نوجوان نے دوڑتی موٹر سائیکل سے ہاتھ لپکا کر دس روپے کا نوٹ کانسٹیبل شوکت کی طرف ہوا میں اُڑا دیا اور پھر چلا کر کہا: یہ لو رشوت خور"۱۴۰

افسانے کا انجام بالکل فطری اور حقیقی ہے۔نوجوان کا شوکت کانسٹیبل کو رشوت خور کے لقب سے پکارنا بالکل فطری عمل ہے۔کیونکہ انھیں اس سے پہلے یقیناً ایسے کانسٹیبل حضرات سے واسطہ پڑ چکا ہوگا جو رشوت لے کر انھیں قانون کی خلاف ورزی کرنے پر سزا نہیں دیتے ہوں گے۔ معاشرے کے اندر جب برائی عام ہو جاتی ہے تو وہ پھر لوگوں کو وہ برائی، برائی نہیں لگتی بلکہ وہ اُسے روز مرہ معاشرتی زندگی کا حصہ سمجھ لیتے ہیں۔جو بعد میں وقت کا تقاضا اور ضرورت بن جاتی ہے۔صادق حسین نے سماجی برائیوں میں سے ایک برائی رشوت خوری کو موضوعِ قلم بنا کر انسانوں کو جھنجوڑا ہے۔اور انہیں غفلت کی نیند سے بیدار کر کے اسلامی اُصولوں کے مطابق زندگی گزارنے کا درس دیا ہے۔صادق حسین نے دیہی اور شہری زندگی کے حوالے سے بھی سماجی رویوں کی نشاندہی کرتے ہوئے بتایا ہے کہ شہر کے لوگ چالاک ہوتے ہیں وہ دیہاتیوں کی طرح جذباتی ہو کر چھریوں اور لاٹھیوں سے وار نہیں کرتے بلکہ سازشوں کی گُھتی مار دے کر انسان کو کھنگال دیتے ہیں۔ جیسے افسانے میں شوکت پر دورانِ ملازمت یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے۔"چند مہینوں کی ملازمت میں اسے یہ تو پتا چل گیا تھا کہ شہر کے لوگ چھریوں اور لاٹھیوں سے نہیں بلکہ سازش کی گُھتی مار دے کر کھنگال دیتے ہیں۔"۱۴۱ یہی وجہ ہے جب افسانے میں شوکت کو ساتھی رشوت کے لئے اکساتے ہیں تو وہ خوفزدہ ہو جاتا ہے۔کہ اگر اس نے ان کی بات نہ مانی تو خدانخواستہ وہ اسے تکلیف نہ پہنچادیں۔کیونکہ شہری لوگوں کا کیا بھروسہ۔اس طرح اس کی نیت ڈانواں ڈول ہو جاتی ہے لیکن یکدم ہی اسے خیال آتا ہے کہ تربیتی کورس کے وقت اس

کے انچارج افسر نے بھی نوجوانوں کو مخاطب کر کے ایمانداری سے فرائض پورے کرنے کی تلقین کی تھی۔"تم قانون کے محافظ ہو۔ تمھیں نہایت ایمانداری سے اپنے فرائض ادا کرنے ہیں مجھے امید ہے کہ تم لوگ میری توقعات پر پورے اترو گے۔" ۱۴۲؎ دوسرے دن اس کا ایک ساتھی کانسٹیبل رشوت کے چکروں میں ملازمت سے برطرف ہو جاتا ہے تو کانسٹیبل شوکت اپنے ارادے بدل دیتا ہے۔ اور یوں اس کے لڑکھڑاتے قدم بھٹکنے سے بچ جاتے ہیں۔ پورا افسانہ معنویت سے بھرپور ہے۔ اور حقیقتاً فطری رنگ لیے ہوئے ہے۔

"سائیں کے سور نگ "کا موضوع ایسے ستم گزیدہ لوگوں کے گرد گھومتا ہے جنہیں ظالم بہلا پھسلا کر اغواء کر کے لے جاتے ہیں اور اُن سے دن بھر مشقت بھرے کام لیتے ہیں۔ ایسے مظلوم افراد کی زندگیاں قیدِ زنداں سے کم نہیں۔ انہیں ہر حال میں پابند رہنا پڑتا ہے اگر کوئی شخص اپنی مرضی سے راہ فرار حاصل کرنے کی کوشش بھی کر لے تو اُسے سخت سے سخت سزا دی جاتی ہے دو دو دن تک بھوکا پیاسا رکھا جاتا ہے۔ ایسے بے بس افراد کی زندگیوں کا دائرہ محدود کر دیا جاتا ہے۔ اور سفاک اور ظالم ٹھیکیدار ان سے جانوروں کی طرح کام لیتے ہیں۔ کیونکہ وہ انہیں اپنی ملکیت اور جاگیر سمجھتے ہیں۔ اُن کا رویہ انسانوں اور جانوروں کے ساتھ یکساں ہوتا ہے اور وہ ایک ہی لاٹھی سے ان سب کو ہانکتے ہیں۔

> "جانور اور انسان، گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ اور سردیوں کی ٹھنڈی ہواؤں میں دن بھر جان مار کام کرتے رہتے جبری مشقت میں گرفتار کوئی شخص دم نہ مارتا۔ اس لیے کہ انہیں زندگی عزیز تھی۔ وہ جانتے تھے کہ درخت پر بیٹھے پہرے دار کی بندوقچی کا نشانہ خالی نہیں جاتا۔" ۱۴۳؎

اس افسانہ میں صادق حسین نے سماجی زندگی کے حوالے سے ایک تکلیف دہ حقیقت آشکار کی ہے کہ سماج میں اس طرح کی سرگرمیاں (اغواء، اغواء برائے تاوان، جبری مشقت) وغیرہ اکثر سر اٹھاتی ہیں اور اکثر سادہ لوح اور معصوم افراد ظالموں کے شکنجے میں آجاتے ہیں۔ اور ساری زندگی کے لیے محکوم بن جاتے ہیں کیونکہ صیاد اُن پر واپسی کے سارے راستے بند کر دیتا ہے۔ طاقتور کا مظلوموں کی بے بسی سے فائدہ اٹھانا بلاشبہ انسانیت سوز عمل ہے۔ لیکن جس معاشرے میں لوگ عدم تحفظ کا شکار ہوں وہاں ایسی سرگرمیاں نشو و نما پاتی ہیں۔ اس افسانے میں آزادی اور غلامی کے تصور کو بھی واضح کیا گیا ہے اور انسانوں کے مختلف روپ دکھا کر اللہ تعالیٰ کی قدرت کے رنگوں کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بیگار کیمپ کے قیدیوں سے لے کر پل کے نیچے سوئے افراد جن میں لولے لنگڑے، بھکاری سب شامل ہیں اُن کی زندگیوں سے پردہ ہٹا کر مصنف نے بہت سے حقائق کو سامنے لایا ہے۔ بھکاریوں کو کوڑے کے ڈھیر سے کھانے کی اشیاء تلاش کرنا اور چرواہے کا بیر کھانا اور درخت کے نیچے سستانا ان تمام مناظر کے ذریعے صادق حسین نے اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے طرزِ رہائش کو سامنے لایا۔ کائنات میں انسان ایک ہی درجے پر فائز نہیں۔ کوئی غلامی کی زندگی

بسر کر رہا ہے تو کوئی آزادی کی، کسی کو دو وقت کی روٹی بھی میسر نہیں اور کوئی پیٹ بھر کر کھانا کھاتا ہے۔ انسان کی مختلف حالتوں کا ذکر کیا گیا جو پاکستانی سماج کا حصہ ہیں۔

بھوک ہمیشہ سے ہی خطہ ارضی کا مسئلہ بنی رہی ہے۔ انسان بھوک اور غربت کے ہاتھوں بعض اوقات اتنا بے بس ہو جاتا ہے کہ وہ دو وقت کی روٹی کے حصول کی خاطر ہر طرح کی غلامی اور جبر کو بھی قبول کر لیتا ہے۔ جیسے افسانے میں دینو بابا سادہ لوح دیہاتیوں اور کسانوں کی مشقت بھری زندگی سے آگاہ کرتا ہے کہ اپنی زمینوں اور کھیتوں پر کام کرنے کے باوجود ہم محتاج ہیں اور یہی محتاجی انہیں ظالموں کے آگے بے بس کر دیتی ہے اور استحصالی معاشرے میں مجبور لوگوں کا جینا دوبھر ہو جاتا ہے۔

ایک اور بات جو افسانے میں واضح کی گئی وہ یہ کہ انسان کی تربیت اور شخصیت کی تشکیل پر ماحول کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ افسانے میں چھوٹو کی تربیت بیگار کیمپ میں ہوتی ہے لہذا وہ باقی دنیا اور اس سے متعلقات سے ناآشنا رہتا ہے۔ اسکی سوچیں بیگار کیمپ سے جنم لیتی ہیں اور بیگار کیمپ پر ہی ختم ہوتی ہیں۔ کیونکہ اس ماحول سے ہٹ کر اس نے کچھ دیکھا ہی نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ قریبی رشتوں کی پہچان اور اہمیت سے بھی ناآشنا رہتا ہے۔

پورا افسانہ سماجی جبر اور ناانصافی کی عمدہ ترین مثال پیش کرتا ہے۔

صادق حسین کے متفرق افسانوں میں سماجی شعور (بحوالہ موضوع)

صادق حسین صرف سماجی زندگی کو پیش کرنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ انھوں نے سماجی زندگی کے زاویے اور گوشے اس طرح چنے ہیں کہ ان کے بنیادی نقطہ نظر کی پوری طرح عکاسی بھی ہوتی ہے۔ان کے افسانوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے سماج میں رہ کر انسانی زندگی کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔اور اپنے سماجی تجربات کی بنیاد پر نوکِ قلم سے سماجی و معاشرتی پہلوؤں کو سامنے لایا ہے۔بقول مصلح الدین "سماجی تجربے ہمارے سمجھ اور صلاحیت میں جِلا پیدا کرتے ہیں اور خوشحالی کے نقطۂ نظر سے مستقبل کے لیے بہتر نتیجے حاصل ہوتے ہیں۔"۱۴۴ "افسانہ "خوشبو کی بستی "اونچے طبقے کی نمائندگی کرنے والا افسانہ ہے جس کا موضوع گھر گرہستی اور امورِ خانہ داری ہے۔آزاد خیال اور امیر طبقے کی خواتین عموماً گھریلو امور اور دیگر خانگی زندگی سے متعلق ذمہ داریوں میں عدم دلچسپی کا اظہار کرتی ہیں۔ کیو نکہ وہ ان تمام امور کی انجام دہی کے لیے خانساموں، ملازمین اور نوکروں پر انحصار کرتی ہیں اور ایسے کاموں کو اپنی شان کے مطابق نہیں سمجھتی۔ کیونکہ گھریلو کام کرنے سے اُن کے ہاتھ میلے ہو جائیں تو ان کی اور دیکھنے والوں سب کی جمالیاتی حس مجروح ہو جاتی ہے۔اور خوبصورت ہاتھ تو عورت کا بہت بڑا سرمایہ ہوتے ہیں۔

صادق حسین نے اونچے طبقے سے تعلق رکھنے والے پڑھے لکھے اور مہذب خاندان کے ذریعے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ گھر گرہستی اور امورِ خانہ داری ہی عورت کا حقیقی زیور ہیں۔ عورت چاہے کتنی ہی پڑھ لکھ کیوں نہ جائے اور اونچے رتبے پر کیوں نہ فائز ہو جائے امورِ خانہ داری سے واقفیت کے بغیر ادھوری ہے۔اور یہ ایک سماجی حقیقت ہے کہ مرد چاہے جس طبقے سے تعلق کیوں نہ رکھتا ہو اُسے گھریلو امور میں دلچسپی رکھنے والی شریکِ حیات ہی پسند آتی ہیں۔ اس لیے عورت کو گھریلو کاموں سے واقفیت ہونا ضروری ہے۔ جیسے افسانے میں تتلی اور عمران کی ہنستی بستی زندگی میں اختلاف اور تبدیلی آنے کی وجہ بھی تتلی کا گھریلو کاموں میں عدم دلچسپی کا مظاہرہ ہے۔کیونکہ اس کی تربیت ناز و نعم میں ہوئی تھی اور اس کی انا اس بات کو گوارا نہیں کرتی۔ اسی وجہ سے دونوں میاں بیوی میں سرد جنگ کا آغاز ہو جاتا ہے۔" ادھر سوچ کے دھارے اپنی اپنی سمت بہہ رہے تھے ادھر اچانک کایا پلٹ ہو گئی۔ تتلی اور عمران دونوں نے چپ سادھ لی۔"۱۴۵ مسئلے کی نوعیت کو گھریلو تجربہ کار ملازمہ بھانپ جاتی ہے اور مسئلے کا حل بتا کر ہنستے بستے گھر کو ٹوٹنے سے بچا لیتی ہے۔افسانے کے ذریعے صادق حسین ایک اور درس بھی دیتے ہیں کہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو انا کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیے۔ ورنہ بات کا بتنگڑ بننے میں اور رشتوں میں دراڑیں پڑنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگتی۔

چھوٹے موٹے مسائل ہر انسان کی زندگی کا حصہ ہیں۔ اور ان مسائل کا حل بھی انسان کے اپنے پاس موجود ہوتا ہے۔ اگر انسان ذرا سی سمجھداری کا مظاہرہ کرے تو ان مسائل پر قابو پایا جا سکتا ہے اور ازدواجی و معاشرتی زندگی کو کامیاب اور پر سکون بنایا جا سکتا ہے۔ جیسے افسانے میں تتلی کو اس کی گھریلو ملازمہ بار بار سمجھاتی ہے کہ جو طریقہ تم نے اپنا لیا ہے وہ ٹھیک نہیں۔ یہ انا وغیرہ کوئی چیز نہیں ہوتی۔ مرد کی نفسیات بہت عجیب ہوتی ہے۔ اس لیے سمجھداری کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس کی چھوٹی چھوٹی خواہشات کا احترام کر کے اس کا دل جیت لیا جائے۔ ورنہ ذرا سی بات کا بتنگڑ بننے میں دیر نہیں لگتی۔ "۱۴۶؎ دیکھو بیٹی عمران پڑھا لکھا ہے اس لیے اس نے چپ اختیار کر لی ہے اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو لٹھ لے کر کھڑا ہو جاتا۔ "اس طرح نصیحتیں کرنے اور بار بار سمجھانے سے تتلی کو سمجھ آ جاتی ہے اور مائی شریفاں کے مشوروں پر عمل بھی کرتی ہے۔ " دوسرے دن عمران کی آنکھ کھلی تو تتلی دونوں ہاتھوں طشتری تھامے سامنے کھڑی تھی۔ "

صادق حسین نے آزاد خیال طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کی زندگیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے واضح کیا ہے کہ ایسے خاندانوں میں ہر چیز کی آزادی ہوتی ہے۔ ان کے رہن سہن میں اور عام طبقات اور متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کے طرزِ معاشرت میں فرق ہوتا ہے۔ عمومی طور پر مشاہدہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ متوسط اور نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے خاندانوں میں لڑکیوں کی آزادی اور حق رائے دہی پر پابندیاں لگائی جاتی ہیں اور عورت کی آزادی کو ناپسند کیا جاتا ہے۔ ایسے معاشرے میں عورت کھلم کھلا اپنی رائے اور خاص کر شادی بیاہ کے معاملات میں اپنی پسند و ناپسند کا اظہار کرنے کے حوالے سے خود مختار نہیں ہوتی بلکہ الٹا اُسے بے حیا اور بے شرم جیسے القابات سے نوازا جاتا ہے جبکہ امیر طبقے اور پڑھے لکھے طبقے سے تعلق رکھنے والی لڑکیوں کو شادی بیاہ کے معاملات کے حوالے سے اپنی پسند و ناپسند پر اظہار خیال کی مکمل آزادی ہوتی ہے۔ جیسے افسانے میں پروفیسر صاحب اپنی بیٹی کو جیون ساتھی کے انتخاب کے حوالے سے مکمل آزادی دیتے ہیں۔ "پروفیسر شکیل نے کہا: تمھاری خوشی ہماری خوشی ہے۔ تمھیں اپنا شریکِ حیات منتخب کرنے کی پوری آزادی ہے۔ "۱۴۷؎ افسانہ خوشبو کی بستی میں پروفیسر شکیل اور سیما اپنی بیٹی سے رشتے کے حوالے سے آزادانہ تبادلہ خیال کر رہے ہوتے ہیں تو گھریلو ملازمہ جو عمر رسیدہ ہوتی ہے۔ اُن کی گفتگو سُن کر حیران ہوتی ہے۔ اور سوچتی ہے کہ "کیسا زمانہ آ گیا ہے۔ ہمارے وقتوں میں تو جوان بیٹی کی آنکھیں نیچی رہتی تھیں۔ اور اُن کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ "۱۴۸؎

صادق حسین ان تمام باتوں سے یہ واضح کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں کہ وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کے رویوں اور خیالات میں بھی تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ ہر آنے والی نسل پچھلی نسل اور زمانے کے انداز واطوار اور افکار و نظریات کے حوالے سے مختلف ہوتی ہے۔

صادق حسین کامیاب معاشرتی زندگی گزارنے کے حوالے سے معاشرتی زندگی کے بہت ہی اہم اور باریک پہلو کو واضح کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔

"زعفران کے پھول" فلیش بیک تکنیک میں لکھا ہوا افسانہ محبت کے موضوع کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔ صادق حسین نے ایک ایسے فرد کی زندگی کو بیان کیا ہے جو تنہائی کا شکار ہے اور محبت کے جذبے سے معمور ہے۔ اپنے ماضی میں گم رہتا ہے کیونکہ اُسے اپنی بیوی سے بے پناہ محبت تھی۔ اس کے مرنے کے بعد بھی وہ شخص اس کی یادوں کے سہارے زندہ ہے۔ یہ افسانہ صادق حسین کے رومانوی احساسات اور فکر کی ترجمانی بھی کرتا ہے کیونکہ محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو ہر انسان کے سینے میں چھپا ہوتا ہے اور اس محبت کے اظہار کے بھی سو رنگ ہوتے ہیں۔ صادق حسین نے محبت کے اس لطیف جذبے کے اظہار کے لیے فطرت کی رنگینیوں کا سہارا لیا ہے۔ اسی لیے تو وہ اسے کبھی زعفران کے پھولوں سے مشابہت دیتے ہیں تو کبھی قوس قزح کے رنگوں سے۔ زیر غور افسانے میں بھی انھوں نے محبت جیسے لطیف جذبے کے اظہار کے لیے زعفران کی خوشبو کا سہارا لیا ہے۔

صادق حسین نے معاشرتی حوالے سے محبت کی اہمیت کو واضح کیا ہے کہ انسان مر جاتا ہے لیکن محبت نہیں مر سکتی۔ یہ لطیف جذبہ جب کسی سینے میں نمو پاتا ہے تو تناور درخت کی شکل اختیار کر جاتا ہے اور اسکی جڑیں کبھی کھوکھلی نہیں ہو سکتیں۔ انسان چاہے عمر کے کسی حصے میں کیوں نہ پہنچ جائے اُسے پہلی محبت یاد رہتی ہے۔

کامیاب زندگی محبت کے ساتھ گزاری جا سکتی ہے اگر محبت کا عنصر زندگی سے نکال دیا جائے تو زندگی بے رنگ محسوس ہوتی ہے۔ زیرِ نظر افسانے میں صادق حسین نے محبت کو زندگی قرار دیا ہے۔ اُن کے نزدیک زندگی محبت ہے اور محبت زندگی۔ لیکن یہ صرف وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں کو کسی غرض اور مقصد کے بغیر بے لوث جذبے کا سینوں میں پروان چڑھانے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ صادق حسین نے اس افسانے میں بنیادی طور پر محبت کو موضوع بنایا ہے لیکن محبت کے حوالے سے بہت سارے سماجی حقوق کو بھی سامنے لایا ہے۔ معاشرے کے اندر بہت سارے لوگ محبت کو غرض اور مفاد کی خاطر بھی استعمال کرتے ہیں۔ جیسے روپے، پیسے اور شہرت و دولت کے حصول کے لیے لوگ محبت کا ڈھونگ رچاتے ہیں۔ اس حوالے سے تہذیبوں کے تصادم کا بھی تذکرہ کرتے ہیں جیسے افسانے میں انہوں نے نیویارک کے ایک کلب میں امریکی خاتون کی محبت کے بارے میں رائے اور تصور کا ذکر کرتے ہوئے بیان

کیا ہے کہ "محبت ایک ترقی پذیر جذبہ ہے جو وقت اور چہروں کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔"یعنی امریکی لوگوں کے خیال میں محبت صرف ذاتی ضرورت اور مفاد پرستی کی غرض سے کی جاتی ہے۔ان لوگوں کے خیال میں محبت دلوں کا سودا نہیں بلکہ تجارت ہے۔ صادق حسین نے امریکی عورت کا ذکر کر کے واضح کیا ہے کہ لوگ صرف محبت کے لیے ہی محبت نہین کرتے۔بلکہ ڈالر اور وہسکی پینے کی غرض سے محبت کرتے ہیں۔صادق حسین نے محبت کے حوالے سے دو متضاد خیالات کا ذکر کیا ہے اور یہ دو متضاد تصورات دو مختلف تہذیبوں کے حوالے سے منفرد ہیں۔ارشد (افسانے کا مرکزی کردار) کی بیوی مشرقی خاتون ہے جو محبت کے بارے میں یقین دہانی کراتی ہے کہ محبت کبھی مر نہیں سکتی۔ زعفران کے پھولوں کی طرح محبت خوشبو بکھیرتی ہے۔ جس طرح ندیوں کے گیت نہیں مرتے اور بہاروں کے موسموں کا سلسلہ جاری و ساری رہتا ہے محبت کائنات میں رنگ بکھیرتی رہے گی۔" ندیوں کے گیت کبھی نہیں مرتے۔ وادی کے سبزہ زار سلامت رہیں گے اور بہار کے موسموں کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کائنات ہے۔"۱۴۹؎اس لیے ایک مشرقی خاتونکی نظر میں محبت زندگی اور روشنی ہے جبکہ مغربی خاتون کی نظر میں محبت ویسکی اور ڈالر کے تصور سے چلتی ہے۔ جس دن ویسکی اور ڈالر کا تصور ختم ہو گا محبت بھی ختم ہو جائے گی۔

> "ناچتے ہوئے اس خاتون نے ارشد سے کہا: یہ محبت ہے۔اس کے بعد آپ کسی دوسری عورت کے ساتھ ناچ کر محبت کر سکتے ہیں۔اور میں کسی دوسرے مرد کے ساتھ ناچ کر محبت کر سکتی ہوں۔ محبت کوئی سنجیدہ جذبہ نہیں جیسا کہ آپ لوگ سمجھتے ہیں۔ محبت ایک ترقی پذیر جذبہ ہے جو وقت اور چہروں کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔"۱۵۰؎

افسانے میں محبت کے حوالے سے مشرقی اور مغربی تہذیب کا موازنہ بہت عمدگی سے کیا گیا ہے۔ یہ بھی ایک سماجی حقیقت ہے کہ انسان کو اتنی اہمیت نہیں دی جاتی جتنی اس کے معاشرتی مقام کو دی جاتی ہے۔ لوگ انسان کو سلیوٹ نہیں کرتے بلکہ کرسی کو سلام کرتے ہیں۔آج اگر آپ سے کرچھین لی گئی تو کل آپ کو کوئی سلام نہیں کرے گا۔ اور جب انسان کے پاس اختیار آ جاتا ہے تو وہ دریائے جہلم کی طرح بپھر جاتا ہے۔روپے پیسے اور مرتبے کی یلغار انسان کے دماغ کو خراب کر دیتی ہے اور یہ رتبہ اور نشہ وقتی ہوتا ہے۔جب انسان کے پاس رتبہ ختم ہو جاتا ہے تو اس کا غرور خاک میں مل جاتا ہے۔

افسانے میں "اندر کی روشنی" کا ذکر کر کے صادق حسین یہ باور کرایا ہے کہ انسان کو اپنے من کو صاف ستھرا رکھنا چاہیے اور اللہ تعالٰی سے خاص لگاؤ رکھنا چاہیے۔ انسان جو بظاہر باہر کی دنیا میں مصرف عمل رہتا ہے اور دنیا کو سنوارنے کی چکروں میں مصرف رہتا ہے اُسے یہ حقیقت جان لینی چاہیے کہ یہ دنیا فانی ہے اور اُسے ایک نہ ایک دن اُسے اپنے خالقِ حقیقی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔اس لیے انسان کو اپنے باطن کو روشن رکھنا چاہیے۔اپنے باطن کو روشن کرنے کے لیے انسان کو بہت زیادہ محنت کرنا پڑتی ہے۔ صادق حسین نے اس افسانے کے ذریعے انسان کی حقیقت کو

بھی واضح کیا ہے۔ایک انسان اپنی عقل اور سوچ کا مثبت استعمال کر کے بڑے بڑے معرکے انجام دے سکتا ہے لیکن قانونِ فطرت کے آگے بے بس ہوتا ہے۔انسان باہر کی دنیا میں روشنیاں بکھیر سکتا ہے لیکن اندر کی روشنی بکھیرنا اس کے بس کی بات نہیں۔

سماجی زندگی کی تکمیل خاندان کی تکمیل کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتی۔ایک مکمل خاندان میاں بیوی اور بچوں کے رشتوں کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ اور جن گھروں میں اولاد کی نعمت نہ ہو وہ کبھی خوشحال اور مطمئن نہیں ہو سکتے۔اُن کی زندگیوں اور شخصیات میں ایک خلا باقی رہ جاتا ہے جو قدم قدم پر زندگی میں ان کے احساسات کو جھنجوڑتا ہے۔انسان چاہے کتنا ہی عقل و شعور رکھنے والا کیوں نہ ہو۔ قدرت کے فیصلوں کے آگے بے بس ہو جاتا ہے۔ اولاد جیسی نعمت کے لیے انسان ترستا ہے۔انسان محل تعمیر کر سکتا ہے۔ڈیم بنا سکتا ہے۔روشنیاں بکھیر سکتا ہے لیکن گھر اور خاندان کی تکمیل اس کے بس کا روگ نہیں کیونکہ جو فیصلے قدرت کے فیصلے ہوں وہاں انسان کا دوش نہیں چل سکتا اور انہیں ان فیصلوں کو قبول کرنا پڑتا ہے۔افسانے میں ارشد اور فریدہ بیگم اولاد کی نعمت سے محروم ہوتے ہیں اور اس کمی کو وہ محسوس کرتے ہیں۔ دونوں کا دکھ مشترک تھا۔لیکن دونوں ہی بے بس نظر آتے ہیں۔" فریدہ اس درد کو اپنا درد سمجھ کر اندر ہی اندر کڑھتی رہتی اور ارشد کا درد مشینوں کے شور میں دب جاتا۔"۱۵!

صادق حسین کے افسانوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اُن کے افسانوں میں تہذیب اور معاشرت کے حوالے سے مقامی رنگ کی جھلک واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ سماج میں ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر ان کے افسانوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ جیسے منگلا پاور ہاؤس کا افتتاح اور منگلا ڈیم کی اونچائی اور گہرائی کا افسانے میں ذکر اُن کی سماجی آگاہی اور معاشرتی حقائق اور تبدیلیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اور یہ اُن کے فن اور سماجی آگاہی کی عمدہ مثال ہے۔پورا افسانہ معاشرتی آگاہی اور حقائق کی تصویر پیش کرتا ہے۔

"نروان" بنگالی سماج کی عکاسی کرنے والا افسانہ ہے جس میں "محبت" کو موضوع بنا کر صادق حسین نے معاشرے کے کرب ناک حقائق کو سامنے لایا ہے۔ مریم ستار بندھو سے محبت کرتی ہے جو اپنے علاقے کا نامور شاعر ہے لیکن قسمت کی ستم ظریفی انہیں ایک نہیں ہونے دیتی۔اور مریم کی شادی دوسرے گاؤں کے نوجوان مونو سے ہو جاتی ہے۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد علاقے کا طاقتور رئیس غنی مونو کا قتل کر دیتا ہے اور مریم پاگل ہو جاتی ہے۔ محبوب کی جدائی کے غم کے بعد شریکِ سفر کا جہانِ فانی سے کوچ کر جانا مریم کو ذہنی اضطراب میں مبتلا کر دیتا ہے۔اور آخر کار زمانے اور حالات کی تلخیوں سے اکتا کر مریم خود کشی کر لیتی ہے۔"ستار بندھو" کے سینے میں تلاطم برپا ہو جاتا ہے۔ اور مضطرب حالت میں کمرے کا دروازہ بند کر کے شعر مکمل کرتا ہے۔" ستار کے سینے میں سلگتی آگ بھڑک کر

شعلوں میں تبدیل ہو گئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے اپنے دل کی بات اسی وقت نہ کہہ ڈالی تو اس کا جسم جل کر راکھ ہو جائے گا۔"۱۵۲

افسانے کا موضوع محبت ہے جسکا انجام المیہ اور کرب ناک ہے کہ قاری افسانے کے آخری جملے پڑھ کر مضطرب ہو جاتا ہے اور اسکی تمام تر ہمدردیاں ستار بندھو کے ساتھ ہو جاتی ہیں۔ اس افسانے میں محبت کرنے والوں کے انجام کے علاوہ صادق حسین نے معاشرے میں فنکار کی اہمیت کو بھی سامنے لایا۔ اور تخلیق کاروں کی معاشرتی اہمیت سے روشناس کرتے ہوئے یہ نقطہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ ادیب اور شاعر معاشرے کے بہترین نبض شناس ہوتے ہیں۔ معاشرتی زندگی کے حوالے سے سوز اور سچی تڑپ اور لگن رکھنے والے تخلیق کار ہی صحیح معنوں میں معاشرتی حقائق کی تشریح اور تصویر کشی کرتے ہیں۔ ان کے سینوں میں اٹھتی تڑپ کا الاو ہی ان کی تحریروں کو زبان دے کر پر تاثیر بناتا ہے۔ انسانیت اور سماج سے محبت ہی انہیں کامیاب تخلیق کار بناتی ہے۔ کیونکہ ایک سچا ادیب یا شاعر معاشرتی ناانصافیوں اور سنگینیوں پر نوحہ کناں ہوتا ہے وہ ان حقائق پر کڑھتا ہے۔ اس کے سینے میں الاؤ پکتا ہے اور جذبات کی بھٹی میں چڑھنے کے بعد اس کے افکار و خیالات لفظوں کا روپ دھار کر کاغذ کی زینت بنتے ہیں اور معاشرتی حقائق کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ ان حقائق سے پردہ بھی اٹھاتے ہیں جن تک عام انسان کی نگاہ پہنچنے سے قاصر رہتی ہے۔ صادق حسین نے افسانے میں ستار بندھو شاعر کا ذکر کر کے اس حقیقت کو بھی آشکار کیا ہے کہ تحریریں انسان کا کیتھارسس کرتی ہیں۔ جب کوئی انسان معاشرتی بے حسی اور ناانصافیوں پر کڑھتا ہے اور زمانے کا مقابلہ نہیں کر سکتا تو وہ اُپنے جذبات کا اظہار لفظوں کے سہارے کر کے سکون قلب حاصل کرتا ہے اور اپنے اندر سلگتی آگ کو ٹھنڈا کر سکتا ہے۔ اس لیے معاشرے میں تخلیق کاروں کی تحریریں اپنے اثرات مرتب کرتی ہیں۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ کوئی بھی تخلیق کار اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتا جب تک وہ اپنے اس سلگتی آگ کو تحریری شکل میں نہ بیان کر دے۔ افسانے میں مریم کی خودکشی کے بعد ستار بندھو کی کیفیت کو صادق حسین نے بہت خوبصورت انداز میں بیان کیا جو اُن کی فنکارانہ دسترس کی عمدہ مثال ہے۔

> "ستار رحمن کا ہاتھ جھٹک کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنے کمرے میں پہنچا۔ اس نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ قلم پکڑ کر ڈوب لیا خیالات کی چنگاریوں سے نظم کا آخری شعر چنا۔ اور اس کے سینے میں خلیج بنگال کا تلاطم برپا ہو گیا۔"۱۵۳

محبت کے موضوع کے علاوہ افسانے میں بہت سارے معاشرتی حقائق کو بھی اس افسانے میں جگہ دی گئی ہے۔ جیسے غریبوں کا استحصال، طاقتوروں کا غریبوں پر غلبہ پانا اور اُن کے ساتھ ظلم و جور والا رویہ اختیار کرنا۔ طاقتوروں کے سامنے کسی کمزور کی پیش نہیں جاتی۔ غنی معاشرے میں خاص سماجی رتبہ رکھتا تھا۔ اور وہ اپنی طاقت کے

بل بوتے پر جو فیصلہ سناتا وہ سب کو تسلیم کرنا پڑتا۔ اس کے رتبے اور طاقت سے ہر کوئی خائف تھا۔ مریم کے شوہر مونو کے قتل کر دینے پر بھی کوئی شخص غنی کے خلاف آواز بلند نہیں کر سکتا۔ سماجی بے حسی اور سفا کی کے علاوہ صادق حسین نے بنگالی معاشرے سے تعلق رکھنے والی بھوک سے بلکتی اور سسکتی عوام کی حالتِ زار کی جھلک اور قحطِ بنگال کے نتیجے میں جنم لینے والے مسائل کی تصویر کشی مہارت کے ساتھ کی ہے۔ افسانے کا عنوان ''نروان'' یعنی راہ نجات دو طرح سے اپنے مفہوم کو واضح کرتا ہے۔ ایک دیش سے تعلق رکھنے والی بھوکی عوام کو مریم کی خود کشی کے بعد نروان مل جاتا ہے۔ اور دوسرا قحط کی وجہ سے غربت و افلاس کی چکی میں پستی عوام کو نروان مل جاتا ہے۔ کیونکہ بقول ان کے "اس دیس کی مٹی خون کی پیاسی ہے۔ جب اس کی خون ضرورت پوری ہو جاتی ہے تو عوام کو نروان مل جاتا ہے۔"[۱۵۴] پورا افسانہ معنویت سے بھرپور ہے اور اس کا المیہ اختتام اثر انگیزی کی بہترین مثال پیش کرتا ہے۔

بنگال کے سماج کی تصویر کشی کرنے والا یہ افسانہ بنگالی سماج کے حوالے سے ان کے افسانے روپ ونتی سے مماثلت بھی رکھتا ہے انداز بیان کی چاشنی سے صادق حسین نے لفظوں اور واقعات کی آویزش بہت عمدگی سے کی ہے۔

اجتماعی زندگی کا تسلسل سماجی حقائق کی وجہ سے برقرار رہتا ہے۔ صادق حسین سماجی برتاؤ کے تمام اجزاء (عادات و اطوار و رسوم رواج و زبان و اخلاق و فرائض منصبی) سے واقف تھے۔ انہوں نے تجربات کے ذریعے ان حقائق کو قلم بند کیا اور بلاشبہ وہ اس شعوری کوشش میں کامیاب بھی ہوئے۔

"انکار" کا موضوع جذبہ حب الوطنی ہے۔ سماجی ارتقاء کے حوالے سے دفاعی پہلو نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ کسی بھی معاشرے کی بقاء اور ترقی کے پسِ منظر میں دفاعی اقدامات اور امن و آشتی کا خاصا کردار ہے۔ سماجی زندگی کو مربوط بنانے کے لیے اتحاد یک جہتی اور اجتماعی طاقتوں کی اہمیت سے صرفِ نظر کرنا ممکن نہیں۔ معاشرہ اُسی صورت میں ترقی کرے گا جب امن و سکون کی فضا ہو گی۔ بدامنی اور انتشار معاشرتی زبوں حالی کا باعث بنتے ہیں اور ایسی صورت میں سماجی ارتقاء بقاء کا تسلسل قائم نہیں رہ پاتا۔ افسانہ "انکار" کے ذریعے صادق حسین نے بھی معاشرتی پہلوؤں میں حب الوطنی کے جذبات کی اہمیت سے آگاہی دلائی ہے۔ ملکی دفاع کے لیے افواجِ پاکستان کی خدمات کو شروع سے ہی سراہا گیا ہے۔ اور جذبہ شہادت اور جذبہ جہاد سے سرشار ایک سپاہی کس طرح سے اپنے وطن کی آن کی خاطر تن من دھن قربان کر دیتا ہے۔ اُس کی تصویر کشی صادق حسین نے اس افسانے میں نہایت عمدگی کے ساتھ کی ہے۔ صادق حسین نے ہم پر واضح کیا ہے کہ معاشرتی زندگی کے لیے دفاعی اقدامات اور جذبہ حب الوطنی کا ہونا بہت ضروری ہے۔ افسانے میں ایک سپاہی کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے صادق حسین نے ملک و قوم کے تحفظ کے حوالے عوام کے جذبات کو نہ صرف بیدار کیا ہے بلکہ سماجی حقائق سے پردہ اُٹھا کر یہ بھی واضح کیا ہے کہ ارادوں کی مضبوطی اور

عزائم کی پختگی تلاطم خیز موجوں سے ٹکرانے کا جوش و ولولہ بھی پیدا کرتی ہیں۔ زندہ دل اور شجاع قوموں کا یہی شیوہ ہے کہ وہ بڑی سے بڑی طاقتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتی ہیں۔ سماجی نظام کی ارتقاء اور مضبوطی میں دفاعی پہلوؤں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور ایک سچا مومن اور مخلص سپاہی شمشیر پر بھروسہ کرنے کی بجائے بے تیغ لڑنے کو ترجیح دیتا ہے۔ جذبہ حب الوطنی سے سرشار ایک بہادر اور نڈر سپاہی ہر وقت ملک و قوم کی خاطر لڑنے کو تیار رہتا ہے اور وہ ہتھیار پھینکنا کسرِ شان سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افسانے میں "میر زمان" دفاعی جنگ میں مفلوج ہو جانے کے بعد بھی انھی جذبات سے سرشار نظر آتا ہے جب وہ صحت مند تھا اور سرحدوں پر لڑنے کے لیے تیار رہتا تھا ۔ جہاں اس نے بہادری اور شجاعت کے جوہر دکھا کر دشمن کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔" میر زمان بندوق چھتیائے جوں کا توں ڈٹا رہا۔ اس کی گردن تن گئی ، ہونٹ بھنچ گئے ۔ نتائج کی پروا کئے بغیر وہ بول اٹھا میں ہتھیار نہیں ڈالوں گا۔"۵۵ دفاعی جنگ میں میر زمان کی قوتِ سماعت بم دھماکے کی آواز سے متاثر ہو گئی تھی اور اس کے دونوں بازو کٹ گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ قوتِ بینائی سے بھی محروم ہو گیا تھا۔ لیکن پھر بھی اس کے جذبات میں شدت ختم نہیں ہوتی اور اس کی زبان سے یہی کلمات جاری رہتے ہیں۔ "ہتھیار نہیں ڈالوں گا"۔ عسکری خدمات کے حوالے سے ایک فوجی جوان کی بہادری اپنے مشن سے وابستگی اور کٹھن حالات میں بھی اپنے موقف پر ڈٹے رہنے کو صادق حسین نے بالکل انوکھے انداز میں پیش کیا ہے۔

معاشرتی تربیت اور نشوونما کے حوالے سے بھی افسانہ انکار میں ایک نکتہ واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ انسان کی تربیت اور نشوونما پر ماحول کا بڑا گہرا اثر ہوتا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان جس طرح کے ماحول سے تعلق رکھتا ہے وہ ماحول بالواسطہ یا بلاواسطہ فرد کی شخصیت پر اپنے اثرات مرتب کرتا رہتا ہے۔ عموی طور پر دیکھا گیا ہے کہ والدین جس پیشے سے منسلک ہوں اُن کی اولاد بھی وہی پیشہ اختیار کرنے کو ترجیح دیتی ہے۔ کیونکہ اُن کی تربیت میں والدین کی طرف سے بالواسطہ یا براہِ راست وہ عناصر شامل ہوتے رہتے ہیں جو ان کے رجحانات اور دلچسپیوں کو ایک مخصوص سمت دینے کا باعث بن جاتے ہیں۔ افسانے میں میر زمان کے والد اور دادا بھی عسکری فوج سے تعلق رکھتے تھے اور اپنی بہادری کے جوہر دکھائے تھے۔ اس طرح میر زمان کو عسکری زندگی ورثے میں ملی تھی اور وہ اپنے آباؤاجداد کی ریت کو آگے لے کر بڑھا تھا۔ اس کے پیچھے اس کے سماج کا بھی بڑا کردار تھا۔ کیونکہ اس کے اساتذہ کرام نے بھی بچپن ہی میں پیش گوئی کر دی تھی کہ یہ بڑا ہو کر بہادر سپاہی بنے گا۔ اسی طرح اسکی پیدائش کے بعد موذن نے جب اس کے کان میں اذان دی تھی تو اس نے بھی اسے سپاہی بننے کی دعا دی تھی۔" ایک بزرگ نے بچے کے کان میں اذان دے کر خدا سے التجا کی تھی : یہ بچہ بڑا ہو کر گاؤں کی عسکری روایات میں اضافہ کرے گا۔"۵۶ اس کے استاد نے بھی محنت کی تلقین

کے ساتھ ساتھ اُس کی منزل کا یقین کر دیا تھا کہ تمھیں ایک بہادر سپاہی بننا ہے۔ لہٰذا یہی متعین کردہ راہیں اُسے سچ مچ بہادر سپاہی بنا دیتی ہیں۔

اساتذہ، والدین اور ماحول تمام عوامل مل کر اُس کی شخصیت میں نکھار لانے کا سبب بنے۔ اور وہ واقعی اپنی عسکری روایات کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔" دفعتاً بم دھماکہ ہوا اور پھر میر زمان بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ اس کے دونوں ہاتھ کٹ گئے اور بینائی کھو گئی۔" ۱۵۷ میر زمان کی نشو و نما پرورش دیہاتی ماحول میں ہوئی تھی اس حوالے سے صادق حسین دیہی زندگی اور طرزِ معاشرت سے آگاہی دلانے میں بھی کامیاب رہے ہیں۔ دیہاتوں میں شگون اور بدشگونیوں کے علاوہ نظر کو ٹالنا اور نظر اتارنا بھی روایت کا حصہ ہے۔ جیسے بد نظر سے بچنے کے لیے انگلی میں توے کا کالک لگا کر پیشانی پر لگانا اور نظر اتارنے کی غرض سے لال مرچوں کو سر پر وار کے آگ میں ڈالنا وغیرہ دیہاتوں کے علاوہ شہروں میں بھی ان روایات کا مشاہدہ کی جا سکتا ہے۔ افسانے میں "میر زمان" کی والدہ دیگر گھریلو کام کاج اور ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ بیٹے کو نظرِ بد سے بچانے اور نظر اتارنے کی غرض سے اس طرح کے عمل کرنا اپنے فرائض کا حصہ سمجھتی تھی۔ صادق حسین نے ان اعتقادات اور روایات سے قاری کو آگاہی دلا کر اُن کی سماجی حس کو بیدار کیا ہے۔

"شعلوں کے سائے میں "صادق حسین کی ایک اور فنی شاہکار تخلیق ہے جس کا موضوع "محبت" ہے۔ صادق حسین نے محبت کی داستان کو فطری انداز میں بیان کیا ہے۔

پوری کہانی خالصتاً رومانوی انداز میں لکھی گئی ہے جس میں صادق حسین نے دیہاتی لڑکی کے دل میں نمو پانے والی محبت کی چنگاری کو بہت خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے اور اس کے دل کی تمنا اور حسرت کو جس انداز سے صادق حسین نے بیان کیا ہے قابلِ دید ہے۔ دیہاتیوں کی معصوم خواہشات اور فطری انداز کو بیان کرنے کے حوالے سے یہ کہانی بالکل منفرد ہے۔ اور شہری اور دیہاتی زندگی کے امتیازات کو ظاہر کرتی ہے۔ دیہی اور شہری زندگی کا موازنہ کرتے ہوئے صادق حسین نے حقیقت پسندی کا مظاہرہ کیا ہے۔ شہری زندگی میں چہل پہل اور رونق ہوتی ہے جبکہ دیہاتی زندگی میں ایک ٹھہراؤ اور سکوت ہوتا ہے۔ شہروں کی نسبت دیہاتوں میں تنہائی کے لمحات گزارنا مشکل ہوتا ہے جبکہ شہروں کی متحرک زندگی میں انسان خود کو شہری زندگی کی گہما گہمیوں میں گم کر دیتا ہے۔ آفتاب جو پر رونق فضا میں سکون محسوس کرتا ہے اور اسی فضا میں زیادہ خوش رہتا ہے لیکن دیہات میں آکر وہ تنہائی سے خائف نظر آتا ہے۔ تنہائی کے لمحات کاٹنا اس کے لیے دشوار ہو جاتا ہے۔

"لیکن دیہات کی فضا کتنی جلد بے کیف ہو جاتی ہے۔ یہاں تو زندگی جیسے رینگ رہی ہے۔ کوئی حرکت نہیں کوئی مسکراہٹ نہیں۔ صرف سبزہ ہی سبزہ نیلا آسمان اور تازہ ہوائیں۔ ان میں کوئی کب تک جی سکتا ہے۔؟" ۱۵۸

صادق حسین نے اُن لوگوں کی زندگیوں پر روشنی ڈالی ہے جو شہری زندگی کے عادی ہوتے ہیں وہ وقتی طور پر ذہنی سکون کے حصول کی خاطر دیہاتوں کا رُخ تو کرتے ہیں لیکن اُن کے لیے دیہاتی زندگی اور ماحول میں زیادہ دیر ٹھہرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ شہری زندگی میں دیہاتی زندگی کے برعکس گہما گہمی اور رونق زیادہ ہوتی ہے۔

شہروں میں ہر طرح کی آزادی ہوتی ہے لوگ الٹرا ماڈرن ہونے کے علاوہ ہر طرح سے آزاد ہوتے ہیں۔ شہروں میں انسان کے ہاتھوں زبان جسم اور جذبات کو مکمل آزادی حاصل ہوتی ہے۔ جبکہ اس کے برعکس دیہاتوں میں کھلم کھلا میل جول تو در کنار کسی عورت کا مرد سے سرِ عام بات کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا جاتا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو دیہاتوں میں پابندیاں زیادہ ہوتی ہیں جبکہ شہروں میں اتنی پابندیاں نہیں ہوتیں یہی وجہ ہے کہ شہری لوگ دیہاتوں میں گزارا نہیں کر سکتے۔ انسان جس مٹی اور ماحول میں رہنے کا عادی ہو اُسی ماحول میں خوش رہتا ہے۔

افسانہ "شعلوں کے سائے" کا عنوان میں شعلوں سے مراد جذبات کی چنگاریاں ہیں جن کے سائے تلے بانو اور آفتاب مجبور ہوتے ہیں اور محبت کے لطیف جذبات رکھنے کے باوجود محبت کو پا نہیں سکتے اور محبت کی چنگاری ان کے سینے میں الاؤ جلا دیتی ہے۔ افسانے کے ذریعے صادق حسین نے بنگالی سماج اور معاشرت کے چند پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے جیسے "کوبی گان" صوبہ بنگال کا مخصوص لوگ گیت ہے جس میں جذبات کی آزادی ہے اور محبوب کے حوالے سے انسان اپنے تمام احساسات اور داخلی کیفیات کا اظہار، آزادانہ انداز میں کر سکتا ہے۔ صوبہ بنگال سے تعلق رکھنے والی مخصوص فی البدیہہ لوک گیت یا شاعری ہے۔ جسے ڈھولک کی تھاپ پر شادی بیاہ اور دیگر خوشی کی تقریبات میں گایا جاتا ہے۔" بنگال کی وہ مخصوص فی البدیہہ شاعری جس میں ٹیپ کا مصرع گاتی ہیں اور پھر اُن میں سے ایک انترے میں کسی دوسری پر فی البدیہہ چوٹ کرتی ہے۔"[۱۵۹] صادق حسین یہ بات باور کرانے میں کامیاب رہے ہیں کہ معاشرہ کوئی بھی ہو محبت جیسے لطیف جذبات کے بغیر معاشرتی زندگی بے رنگ اور بے کیف نظر آتی ہے۔ اور یہ فطری جذبہ ہر انسان کے سینے میں ضرور جگہ بناتا ہے۔ کوئی بھی دل اس لطیف جذبے سے خالی نہیں رہ سکتا۔

ہاں لوگوں کے ہاں محبت کے انداز مختلف ہوتے ہیں کوئی وقتی ضرورت کے لیے محبت جیسے جذبات کو استعمال کر کے ذاتی تسکین حاصل کرتے ہیں اور کچھ دلوں میں یہ بے لوث جذبہ خوبصورت اور نرم و نازک کونپل کی طرح کھل اٹھتا ہے اور اپنی خوشبو سے اپنے قرب وجوار اور ارد گرد کی دنیا کو بھی معطر کر دیتا ہے جیسے افسانے میں بانو کی محبت بے لوث اور غرض سے پاک معصوم محبت ہے۔

افسانہ "انسان اور صلیب" صادق حسین کے تمام افسانوں میں منفرد نوعیت کا افسانہ ہے۔ جس میں انھوں نے مختلف مذاہب کے طرزِ عبادات کے تصور کو واضح کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ انسان کا تعلق چاہے کسی بھی سماج یا

گروہ سے ہو۔اُسے سکونِ قلب صرف یادالہیٰ سے حاصل ہوتا ہے۔پوراافسانہ عیسائی برادری سے تعلق رکھنے والے افراد کے گرد گھومتا ہے۔ جن کی زندگیاں تلخ تجربات سے گزر چکی ہوتی ہیں۔اور تزکیہ نفس اور سکون قلب کے حصول کی خاطر گرجاگھر کارخ کرتے ہیں۔صادق حسین نے گرجاگھر میں عبادت کی غرض سے موجود لوگوں کے خیالات وتصورات اور سماجی زندگی اور اس سے متعلقات کی تصویر کشی کر کے ذمہ دار شہری اور ادیب ہونے کا فریضہ بھی انجام دیا ہے۔افسانے کی ابتداء عیسائی پادری کے خطبے سے کرتے ہیں جو متی کی انجیل کے ستائیسویں باب کی چھیالیسویں آیت پڑھ کر سناتا ہے۔ جس کا ترجمہ کچھ یوں ہے"اے خدا!اے میرے خدا! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔"۱۶۰پادری کا خطبہ سحر انگیز تھا۔کہ تمام سننے والوں کے دلوں کے دریچے واہوتے چلے گئے۔افسانے کا عنوان ہی در حقیقت افسانے کے موضوع کی وضاحت کرتا ہے۔اور ابتداء میں پادری کا خطبے میں حضرت عیسیٰؑ کے حوالے سے اُس آیت کا ترجمہ پڑھنااور لمحہ بھر کے لیے رکناجب آپؑ پر یہودیوں نے مظالم ڈھائے اور صلیب تیار کر کے آپ کو قتل کی غرض سے لٹکادیناچاہتے تھے۔لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ اُٹھالیااور اُن کی جگہ اُس شخص کو لٹکادیا جس کو سرداروں نے آپؑ کے قتل کی غرض سے بھیجا تھا۔اُس شخص کے حلیے کی مشابہت حضرت عیسیٰؑ سے دی گئی تھی۔ تاریخ میں ڈھائے گئے اُس ظلم کی مناسبت سے صادق حسین نے بڑی سوچ بچار کے بعد موجودہ انسانوں کی صورتحال کی وضاحت دینے کے لیے عنوان کا انتخاب کیا۔ اور ستم گزیدہ افرادِ معاشرہ کی سماجی زندگی سے متعلقہ مسائل کی نشاندہی کی ہے۔موجودہ دور میں انسان غم دنیا کی وجہ سے خود کو ہمیشہ صلیب پر لٹکا ہوا محسوس کرتا ہے۔کیونکہ حقیقی سکون کسی کو میسر نہیں۔ مصائب زمانہ مختلف انداز سے اُن کی زندگیوں میں بھونچال لاتے ہیں۔ افسانے کا بنیادی موضوع تو عبادت ہے۔اور عبادت سے حاصل ہونے والا سکون قلب۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ جب انسان خود کو عبادت کی غرض سے اللہ کے حضور پیش کرتا ہے تو وہ مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے اور ایسے میں اُسے یک گونہ طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔وہ اپنے گناہوں پر نادم وپشیماں ہو کر معافی کا طلبگار ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ چرچ میں بیٹھے تمام افراد کے چہروں پر بندگی کی فضاء میں سنجیدگی چھا جاتی ہے اور خطیب کی باتیں اُن کے دلوں پر اثر انداز ہونے لگتی ہیں۔افسانے میں مسز فریڈرک پر بھی خطبے کا اثر ہوتا ہے اور اسکا ضمیر ملامت کرتا ہے کہ اُس نے جو ذریعہ معاش اپنایا ہے وہ غلط ہے لیکن ساتھ وہ ذہنی الجھاؤ اور کشمکش کا شکار ہو کر سوچنے لگتی ہے کہ اگر اُس نے اپنے دل میں مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کی محبت کے دریچوں کو وا کر دیا تو وہ اپنی بیٹی کی پرورش کیسے کر سکے گی اور اپنی منہ بولی بہن کی دوا دارو کا بندوبست نہیں کر پائے گی۔

"بندگی کی فضا میں تمام چہروں پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔فرد فرد کے دل پر کوئی غیبی ہاتھ دستک دینے لگا۔تن تن کر کانپ اٹھا من من کا گوشہ بیدار ہونے لگا۔دلوں کے پٹ خود بخود کھلتے گئے۔مسز فریڈرک نے جیسے نیند میں

ڈولتی آنکھوں کو ملتے ہوئے اپنے دل کا دروازہ نیم وا کیا ہو اور اسکی نگاہیں کہہ رہی ہوں یہ پٹ پورے کھل گئے تو میری بچی ربیکا بھوکوں مر جائے گی۔ میری منہ بولی بہن کا دوادار و کون کرے گا۔" ۶۱

صادق حسین افسانے میں خیر اور شر کا تصور واضح کیا ہے۔ انسان دنیاوی ضروریات اور مشکلات سے نبرد آزما ہونے کے لیے ہر جائز اور ناجائز وسیلہ روزگار تلاش کرنے پر بے شک مجبور ہو جائے ضمیر کی کی آواز اُسے چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ اسی طرح خدمتِ خلق کے حوالے سے جس پہلو کو نشاندہی کی گئی ہے وہ بھی خوب ہے۔ انسان معاشرتی حیوان ہے اور معاشرے میں مل جل کر رہنا اُس کی فطری مجبوری ہے مگر جو لوگ خدمتِ خلق کے جذبے سے سرشار ہو کر دوسروں کی مدد کرتے ہیں تو قدرت دنیا میں ہی اسکا صلہ اُن کو دے دیتی ہے۔ دنیا مکافات عمل ہے ہم جیسا دوسروں کے ساتھ سلوک کریں وہ لوٹ کر ہمارے پاس ضرور آتا ہے۔ افسانے میں ملبارن کا مشکل وقت میں مسز فریڈرک کا مدد کرنا اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ملبارن کی نیکی رائیگاں نہیں جاتی اور مسز فریڈرک اُس کو منہ بولی بہن کا درجہ دے کر ہر مشکل میں اُسکا ساتھ نبھانے کا فیصلہ کرتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے جب ملبارن کی جوانی ڈھل جاتی ہے تو وقت سے پہلے ہی وہ بیمار ہو جاتی ہے اور اس مشکل گھڑی میں مسز فریڈرک اس کی تمام ذمہ داریاں اُٹھا کر اپنے قائم کردہ رشتے کو نبھاتی ہے۔ "اس دن سے مسز فریڈرک نے اسے اپنی منہ بولی بہن سمجھنے لگی تھی اور اب چوری کر کے اس کا دوادارو کرتی۔" ۶۲ یہاں اس حقیقت کی وضاحت کی گئی ہے کہ دوسروں کی مدد کرنے سے نہ صرف دلی سکون حاصل ہوتا ہے بلکہ اخوت و محبت کے جذبات بھی معاشرے میں پروان چڑھتے ہیں۔ افسانے میں بیک وقت بہت سارے ذیلی موضوعات کو جگہ دے کر صادق حسین نے مصلح ہونے کا فریضہ انجام دیا ہے۔

خوفِ خدا انسان کے دلوں کو موم کر دیتا ہے۔ ضمیر کے ہاتھوں مجبور شخص دوسروں پر ڈھائے جانے والے مظالم کی تلافی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کیونکہ انسان چاہے جس عقیدے سے تعلق رکھتا ہو چاہے وہ یہودی ہو، چاہے عیسائی ہو یا مسلمان اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ وہ فانی ہے اور اسکی اپنی کوئی حیثیت نہیں لہذا جب وہ خدا سے رشتہ جوڑتا ہے تو اپنے گناہوں کی تلافی چاہتا ہے۔ صادق حسین نے چرچ میں بیٹھے افراد کی زندگیوں کے حوالے سے مختلف سماجی رویوں کی نشاندہی کی ہے۔ مسٹر ہملین جو اپنی بیوی پر ظلم کرتا ہے۔ چرچ میں بیٹھ کر اسکا دل چاہتا ہے کہ وہ اپنے گناہوں کی معافی طلب کرے۔ اور مسز ہملیٹن اپنے لیے زندگی کے دائرے کو تنگ ہوتا ہوا محسوس کرتی ہے۔ جو نکاح کے وقت اپنے خاوند سے کیئے ہوئے عہد کو ہر طرح سے نبھاتی ہے اور بدلے میں ہر طرح کا ظلم برداشت کرتی ہے۔ ازدواجی زندگی کے حوالے سے تمام حقوق و فرائض ادا کرنے کے باوجود اسکا خاوند اُسے بری طرح مارتا پیٹتا ہے۔" مر جانا کتنا آسان ہے مر مر کے جینا کتنا مشکل ہے۔ پھر اسے وہ دن یاد آگیا جب پہاڑ پر ایک چھوٹے سے مگر خوبصورت گرجے میں اس کا نکاح پڑھوایا گیا تھا۔" ۶۳ وہ چرچ میں بیٹھے ہوئے زندگی کی نہیں بلکہ موت کی تمنا کرتی ہے۔

دیکھا جائے تو معاشرے کا ہر فرد ہی اپنی جگہ پر مظلوم ہے۔ کوئی خاوند کے رویوں کے ہاتھوں، تو کوئی گردش روزگار اور غربت کے ہاتھوں مجبور ہے تو کوئی محبوب کی بے رخی اور بے اعتنائی کی وجہ سے خود کو مظلوم ٹھہراتا ہے تو کسی کو سماجی رتبے کا غم مظلوم بننے پر مجبور کر دیتا ہے، تو کوئی اپنوں کے غم مفارقت کی وجہ سے زمانے کی ستم ظریفی یوں کا شکار نظر آتا ہے۔

صادق حسین نے مسیحی برادری سے تعلق رکھنے والے فرد کی ذہنی کشمکش اور زندگیوں سے پردہ اٹھایا۔ انھوں نے ان شرمناک معاشرتی حقائق سے بھی پردہ اُٹھایا ہے جو انسان کو ہر جائز و ناجائز کام کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ انسان غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہر طرح کے کام کر جاتا ہے۔ یہاں تک کہ عورت اپنی عصمت کو بھی فروخت کر دینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ "مونا" اور ملبارن دونوں ہی اپنی مجبوریوں اور تنگ دستی کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایسے کام کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ افسانے میں سماجی بے حسی کا تاثر نمایاں طور پر واضح کیا گیا ہے۔ آج کل لوگوں میں خلوص اور ہمدردی کے جذبات ناپید ہو گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غربت اور بھوک سے سسکتی، بلکتی قوم اور افراد کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ بے حسی کا لبادہ اوڑھ کر ہر فرد اپنے آپ میں مگن ہے اسے دوسروں کی پرواہ نہیں۔ چرچ میں بیٹھا ہوا ایک شخص ایسا بھی ہے جس کے عقیدے کے حوالے سے لوگ شکوک و شبہات میں مبتلا رہتے ہیں کہ اُسکا اپنا کوئی مذہب نہیں۔ کیونکہ وہ مختلف عبادت گاہوں میں پایا جاتا ہے۔ جبکہ اسکا یہ اقرار کرنا ہے کہ میں خدا نہیں ڈھونڈتا میں تو انسان کی تلاش میں جاتا ہوں۔

> "میں خدا نہیں ڈھونڈتا۔ میں تو انسان کی جستجو میں ہوں۔ میں جب کاغذ کی ناؤ بنا کر تالاب کی سطح پر رکھتا ہوں تو وہ تیرتی رہتی ہے۔ میری بیوی کی چھاتی سے جب دودھ کے قطرے خود بخود ٹپک پڑیں تو وہ جان جاتی ہے کہ بچے کی بھوک پکارنے والی ہے مگر وہی بچہ جب بڑا ہو جاتا ہے تو اس کی بھوک پکار پکار کر دم توڑ دیتی ہے۔ مگر کسی کے سینے میں درد نہیں ہوتا۔"[۱۶۴]

صادق حسین معاشرے کے افراد کی بے حسی پر نوحہ کناں ہیں۔ اور انسان کو دعوتِ فکر دے کر انہیں ان کے اصل مرتبے سے آگاہی دلا رہے ہیں۔ موجودہ دور کا ہر فرد صلیب پر لٹکا ہے اور یہ صلیب سماجی بے حسی کی وجہ سے بنائی گئی ہے۔ خود سماج کے افراد اپنے ہی ہاتھوں سماج کا قتل عام کرنے میں مصروف عمل ہے۔ اور افسوسناک بات تو یہ ہے کہ یہ قتل جذبات اور احساسات کے قتل سے لے کر انسانیت کے قتل تک پھیلاؤ رکھتا ہے۔ سماجی زندگی کو موثر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ تمام افراد محبت و اخوت اور یکجہتی کا مظاہرہ کریں۔ اور تمام معاشرتی بیماریوں اور مسائل کو جڑ سے اکھاڑ باہر کریں۔ پورا افسانہ معنی خیزی کے حوالے سے منفرد ہے اور صادق حسین کی سماجی بصارت کا ترجمان بھی۔

افسانہ "چمکیلے اندھیرے" بنگالی سماج سے تعلق رکھنے والے امیر طبقے کی نمائندگی کرتا ہے۔ جہاں عیش و نشاط کی محفلوں پر بے بہا پیسہ لوٹایا جاتا ہے۔ افسانے کا موضوع دوغلا پن اور دروغ گوئی ہے۔ صادق حسین نے افسانے کے عنوان کے ذریعے ہی موضوع کی وضاحت کر دی ہے چمکیلے اندھیرے یعنی اندھیرے کی پہچان ہی اندھیرا ہے خواہ وہ کتنا ہی چمکدار کیوں نہ ہو اپنے اندر خوفناک تاریکی لیے ہوا ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح وہ افراد جن کا ظاہر کچھ ہو اور باطن کچھ ہو وہ کبھی انسانوں کی بہتری کے لیے نہیں سوچ سکتے کیونکہ وہ من کے کالے ہوتے ہیں اور اُن کا باطن تاریک ہوتا ہے۔ صادق حسین نے چمکیلے اندھیرے کا لفظ علامتی طور پر استعمال کیا اور چونکہ ان کا یہ افسانہ ۱۹۵۵ء میں ماہنامہ "ادبِ لطیف" میں شائع ہوا تو یہ وہ دور تھا جب افسانے کی صنف میں علامتی رنگ غالب آ چکا تھا۔ تقسیمِ ہند کے بعد سماجی حالات یکسر بدل گئے تھے۔ ایسے میں جمہوری نظامِ حکومت سے وابستہ توقعات کا پورا نہ ہونا عوام میں ذہنی اضطراب کا سبب بنا۔ معاشرتی بے حسی اور طبقاتی کش مکش کے شور و غوغا نے سماج کو بری طرح سے متاثر کیا۔ تو لکھنے والوں نے اپنے مخصوص عمل اور سوچ و افکار سے کام لے معاشرتی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا اور عوام کے جذبات اور بے چینی کو تحریروں میں بیان کیا۔ صادق حسین بھی اسی دور کے لکھنے والوں میں سے تھے۔ آپ نے معاشرتی ناہمواریوں کو مشاہدے کی عینک سے بہت باریکی اور گہرائی سے دیکھا اور پھر انھیں تحریری صورت میں منظرِ عام پر لانے میں کامیاب ہوئے۔ اس حوالے سے روبینہ کنول لکھتی ہیں۔

> "تقسیم ہند کے بعد حالات تبدیل ہوئے، آزادی اور جمہوریت سے جو توقعات وابستہ کرلی گئی تھیں۔ وہ پوری نہ ہو سکیں۔ نتیجتاً اپنوں کی بے حسی و بے غیرتی، بد نظمی، بد عنوانی، لوٹ کھسوٹ، ظلم و جبر، نا عاقبت اندیشی، غربت و افلاس، طبقاتی تقسیم جیسے موضوع افسانے میں در آئے۔ کردار کے عمل اور رد عمل سے زیادہ افسانہ نگار اس کے نفسیاتی اور ذہنی کیفیات کو سمجھنے لگا۔ صادق حسین اسی دور کے لکھنے والے ہیں۔" [۶۵]

جس دور میں صادق حسین نے معاشرتی موضوعات پر خامہ فرسائی کی اس دور میں جدید تکنیک کے تحت افسانہ نگاروں نے اپنی تخلیقات کو سامنے لایا علامت نگاری کا رواج بھی اُسی دور میں شروع ہوا کیونکہ سماجی بے حسی اور انتشار اور عام لوگوں کے حق میں براہِ راست آواز بلند کرنے کے نتائج مثبت نہ تھے۔ لہذا افسانہ نگاروں اور دیگر ادباء نے علامتی رنگ اختیار کر کے اپنا مطمعِ نظر لوگوں اور حکامِ بالا تک پہنچانے کی کوشش کی۔ لکھنے ولا جس دور کا بھی ہو اس کی تحریروں پر تکنیک کا رنگ غالب رہتا ہے۔ صادق حسین کی تحریروں میں بھی کہیں کہیں علامتی رنگ دیکھنے کو ملتا ہے۔ افسانہ "چمکیلے اندھیرے" میں صادق حسین نے معاشرے کے ان افراد پر چوٹ لگائی ہے جن کا ظاہر بہت چمکدار اور باطن اتنا ہی کالا ہوتا ہے۔ جنھیں اپنی ضروریات و مفادات کو دوسروں کے لیے قربان کرنا مشکل لگتا ہے۔ اگر ضمیر انہیں بیدار کر کے نیک اعمال کی جانب راغب بھی کرے تو وہ اُسے فوراً جھٹک کر اپنی خرمستیوں میں گم کر دیتے ہیں۔

جیسے افسانے میں نیلم غربت کے ہاتھوں مجبور اور پسماندہ افراد کے بارے میں سوچتی ہے۔ لیکن پھر اچانک ہی اُن خیالات کو جھٹک کر اپنے شاندار مستقبل کے بارے میں سوچتی ہے کہ نعیم کی جائیداد اور مال اسباب نیلام ہو جائے گا تو ایک بار پھر روپے پیسے کی ریل پیل ہو گی۔ اور وہ پھر نعیم کے ساتھ دنیا کے مختلف ممالک کی سیر کرے گی۔ وہسکی اور سگریٹ کے مزے لے گی۔ اسی طرح نیلم جذبات واحساسات میں بھی نعیم کے ساتھ مخلص نہیں ہوتی۔ وہ صرف نعیم کی دولت سے محبت کرتی ہے۔ "آج اس کی ساری جائیداد نیلام ہو جائے گی۔ اس کا بینک بیلنس پھر بڑھ جائے گا۔ وہ یورپ کی سیر کرے گی۔ نئی نئی کاروں میں گھومے گی۔"٦٦؎

افسانے میں یہی حقیقت واضح کی گئی ہے کہ عیش وعشرت اور مستی میں گم افراد دوسروں کے دکھ درد کو محسوس کرنا بھی چاہیں تو دولت کا خمار اُن کے خیالات کو جھٹک دیتا ہے اور وہ اپنے اندر اُٹھنے والی ضمیر کی آواز کو پھر سے قید کر دیتے ہیں۔

چمکیلے اندھیرے میں طبقاتی کش مکش کے حوالے سے امیر اور غریب طبقے کا موازنہ بھی کیا گیا ہے۔ ایک طرف روپے پیسے کی اتنی ریل پیل ہے کہ اُسے ریستوران، بال روم ڈانس اور وہسکی جیسے دیگر عیش ونشاط والے سامان پر خرچ کیا جاتا ہے اور وقتی لذتوں اور سکون کے حصول کے لیے انسان فضول خرچی کی انتہا تک پہنچ جاتا ہے۔ دوسری جانب غریب اور مفلوک الحال عوام دو وقت کی روٹی کے لیے سسکتی نظر آتی ہے۔ ایک ہی افسانے میں صادق حسین نے بیک وقت دو متضاد کیفیات یعنی غربت اور امیری کا موازنہ کیا ہے۔ اور ایسے معاشرے کی تصویر پیش کی ہے جہاں سے انسانی قدریں ختم ہو چکی ہیں۔ جہاں مفاد پرستی اور منافقت کا دور دورہ ہے۔ یہ تمام باتیں اس معاشرے کی نمائندگی کرتی ہیں، جہاں مظلوم اور بے بس عوام کا سماجی ومعاشی طور پر استحصال کیا جاتا ہے۔ افسانے میں نعیم جب اپنے ماں باپ کے ورثے کو نیلام کرنے کی غرض سے اپنے آبائی گاؤں لکھی پور جاتا ہے تو کچھ لوگ اس سے التجا کرتے ہیں کہ ہمیں زمینیں واپس دے دیں تاکہ ہم فصلیں اگا کر پیداوار میں اضافے کے ذریعے اپنے قرضے ختم کروا سکیں تو نعیم غصے سے لال پیلا ہو جاتا ہے اور انہیں برا بھلا کہہ کر واپس لوٹا دیتا ہے۔

صادق حسین اُس سماجی حقیقت کو سامنے لائے ہیں جہاں انسان خود غرضی کی انتہا کو پہنچ کر صرف ذاتی مفادات کو ترجیح دیتا ہے۔ اور بے حس انسان اپنی خواہشات کے لیے والدین کی قائم کردہ روایات کو بھی بالائے طاق رکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے وہ زمینیں، جائیداد اور روپے پیسے کو اپنے عیش وعشرت اور تفریح طبع پر خرچ کر دیتا ہے اور اس طرح والدین کی برسوں کی جمع پونجی کو چٹکیوں میں اڑا دیتا ہے۔ جیسے افسانے میں نعیم اپنے ماں باپ کی جائیداد کو فروخت کرنا چاہتا ہے صرف اس لیے کہ اس کی بیوی پر تعیش زندگی کی دلدادہ ہے اور وہ اس کے احساسات کے احترام میں اپنے احساسات کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔

بعض اوقات انسان اس حد تک مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ سماجی بندھنوں میں بری طرح جکڑ جاتا ہے اور چاہ کر بھی اُن سے چھٹکارا حاصل نہیں کر پاتا۔ اور یہی سماجی بندھن اس سے اسکی مرضی کے برعکس کام کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ نعیم کو لکھی پور کی جائیداد کی نیلامی کے وقت رنج ہوتا ہے۔ ایک لمحے کے لیے اُس کے سوئے ہوئے احساسات بیدار ہو کر اُسے سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ وہ یہ سب غلط کر رہا ہے۔ لیکن اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کی پیاری بیوی کی خواہشات کی تکمیل کیسے ممکن ہو پائے۔

نعیم کے ضمیر کی آواز اور ذہنی کشمکش صورتحال کی سنگینی میں اضافہ کا باعث بنتی ہے اور قاری کے ذہن اور اعصاب کی متاثر کرتی ہے۔" اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے تن سے لباس نوچ نوچ کر نیلام کیا جارہا ہو۔"۶۷ا؎ پورا افسانہ ٹھوس سماجی حقائق کا عکاس ہے۔ اور صادق حسین نے اپنی فنی صلاحیتوں کے زورِ بازو پر سماجی ناہمواریوں اور طبقاتی امتیازات کی نشاندہی کرتے ہوئے قاری کے ذہن کو جھنجوڑا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ افسانہ صادق حسین کے سماجی شعور کا غماز ہے۔

افسانہ "دھوکے باز" اکتوبر ۱۹۷۳ء میں اردو ڈائجسٹ میں شائع ہوا۔ جسکا موضوع "غربت" ہے۔ پاکستانی معاشرہ ہو یا مغربی معاشرہ غربت معاشرتی زندگی کا سب سے بڑا اور اہم مسئلہ رہی ہے۔ صادق حسین نے اس افسانے میں منتشر اور پسماندہ طبقے کے حالات زندگی سے نقاب کشائی کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ غربت ایک ایسی مصیبت ہے جس پر ملک اور ہر زمانے میں لوگ حیران و پریشان رہے ہیں۔ پاکستان میں بھی غربت ہماری پہچان بن گئی ہے۔ غربت سے متاثرہ افراد بعض اوقات احساسات سے عاری ہو جاتے ہیں۔ غربت کا سرطان جب سماج میں پھیلتا ہے تو قینچی اور پتھر (افسانے کرداروں) جیسے انسان صرف ذاتی مفاد کے بارے میں سوچتے ہیں یہاں تک کہ انسانیت کے مقام سے گر کر وہ اخلاقی پستی اور سماجی بے حسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہمدردی اور رحم کا عنصر ان کے دلوں سے غائب ہو جاتا ہے۔ بھوک وہ بیماری ہے جو انسان سے ہر جائز و ناجائز کام کروانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ افسانے میں قینچی اور پتھر دو گورکن ہیں اور مردہ دفنانے کے دس روپے لیتے ہیں۔ اس لیے اُن کی سوچیں صرف دس روپے تک محدود ہوتی ہیں۔ احساس اور ہمدردی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے وہ یہی سوچتے ہیں کہ کب کوئی انسان جہان فانی سے کوچ کرے اور انہیں دس روپے کا نوٹ ملے جو ان کی ضروریات کی تکمیل کر سکے۔ یہاں تک کہ وہ دونوں آپس میں دس روپے کے حصول کے لیے لڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کی وفات کے حوالے سے پیش گوئیاں کرتے ہیں ہم دونوں میں سے پہلے کون مرے گا۔ قینچی نے پتھر سے کہا کہ اگر تو پہلے مرا تو میں تمھاری قبر کھودوں گا اس لیے

کہ تو مرا دس کا نوٹ ہے۔" پتھر قینچی کی گردن پکڑ کر بولا۔ تو میرا دس کا نوٹ ہے تو پہلے مرے گا اور میں تری قبر کھود دوں گا۔"۱٦۸

پورا افسانہ اخلاقی بے حسی کی تصویر پیش کرتا ہے جہاں انسان غربت کے باعث خود غرضی کی انتہا تک پہنچ کر آخرت کی فکر کو بھلا بیٹھتا ہے۔ افسانے میں دریائے چناب میں سیلاب آجاتا ہے اور دونوں گورکن اس وجہ سے پریشان ہیں کہ گاؤں کے لوگ اپنی زمینیں گھر بار چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ اور جتنے لوگ یہاں سے چلے گئے اتنے اُن کے دس روپے کے نوٹوں میں کمی آجائے گی۔ اور اس طرح اُن کا ذریعہِ معاش ڈھیلا پڑ جائے گا۔ مستقبل کے حوالے سے اندیشے انہیں پریشان کرنے لگتے ہیں۔ انہیں اس بات کا دکھ نہیں ہو رہا کہ گاؤں ڈوب رہا ہے بلکہ انہیں جو بات پریشان کرتی ہے وہ اُن کی معاشی تنگدستی ہے۔ خود غرضی اور لالچ انہیں انسانیت کے احترام سے بے گانہ کر دیتی ہے۔ افسانے کے اختتامی حصے میں گورکن "پتھر" کی سرگرمیوں اور اعمال و افعال سے پردہ اُٹھا کر صادق حسین نے واضح کیا ہے کہ خود غرض انسان کسی بھی سطح پر ہو یا کسی بھی معاشرتی مقام پر فائز ہو دغا بازی سے نہیں چوکتا۔ یہ معاشرتی المیہ ہے کہ ہر فرد ہی دوغلے روپ میں نظر آتا ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے پیمانے سے لے کر بڑے سے بڑے مرتبے اور مقام پر بھی انسان دھوکہ دہی اور فریب دینے سے باز نہیں آتا۔ یہاں تک کہ مردوں کے ساتھ بھی انسانیت سوز سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ اور پرانی قبروں میں ہی نئی تدفین کر کے وارثوں اور لواحقین کو تشفی دے دی جاتی ہے کہ نیک روح کو کیسی اچھی جگہ نصیب ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں کوئی بھی شخص اپنے پیشے سے وفادار نہیں۔ دوسری بات جو افسانے کے مطالعے سے عیاں ہوئی ہے وہ غریب معاشرے کے اندر جمہوریت کا مفہوم۔ چونکہ یہ افسانہ ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا لہذا یہ اپنے عہد کی بھرپور سماجی عکاسی کرتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب افسانہ نگاروں نے سماجی حقیقت نگاری کو اپنا شکار بنا کر سیاسی، معاشی، معاشرتی، فرقہ واریت کی خوفناک ریشہ دوانیوں کو موضوعات میں جگہ دے کر اپنے اپنے سماجی شعور کی ترجمانی کی۔ دیگر قلمکاروں کی طرح صادق حسین بھی سماج کی سرگرمیوں اور تغیر و تبدل سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اُن کے افسانوں میں اپنے عہد کی واضح جھلک محسوس کی جاسکتی ہے۔ اس وقت کے سماجی پس منظر کے حوالے سے ڈاکٹر روبینہ شہناز اپنے تنقیدی مضمون "جدید ادب میں پاکستانیت کا شعور" میں لکھتی ہیں۔

> "۱۹٦۸ء میں جب ایوب خان کے مارشل لاء کے خلاف تحریک شروع ہوئی تو شعر و ادب میں سے فردیت کا تصور مٹ گیا۔ اجتماعی زندگی کا تصور پیدا ہوا۔ جمہوریت اور آزادی اور ظلم و استحصال کے خلاف فکر نے کروٹ بدلی۔ اسی لیے یہ بات اکثر کہی جاتی ہے کہ ستر کی دہائی میں جو نئی نسل سامنے آئی وہ اپنی نفسی پیچیدگیوں میں مبتلا نہیں تھی۔ اور نہ ہی فلسفہ وجودیت کی طرف مائل تھی۔ بلکہ ستر کی دہائی میں ہمارا ادب اپنے گرد و پیش اور خارجی حقائق کو اپنا موضوع بناتا ہے۔"۱٦۹

افسانے میں جمہوریت کے حوالے سے شہری کی تقریر کا ذکر کرنا اور قینچی اور پتھر جیسے معصوم افراد کے ذریعے اس تقریر کا مفہوم واضح کرنا صادق حسین کے تنقیدی شعور کو واضح کرتا ہے۔اس شخص نے کہا تھا: ڈرو اس سیلاب سے جو آنے والا ہے اور جب وہ سیلاب آتا ہے تو کمزور طاقتور کو سولی پر چڑھا کر قہقہے لگاتا ہے۔۱۹۷۳ء میں جمہوریت کا پرچار زیادہ ہونے لگا تھا۔پاکستانی سیاسی حکمران جمہوریت کے نعرے لگا کر عوام کے مسائل حل کرنے کے دعوے کرنے لگے لیکن افسوس کی بات تو یہ ہے کہ جمہوریت کے دعویدار خود ہی جمہوریت کے مفہوم سے ناآشنا رہے اور عوام کو جمہوریت کے نعرے لگا کر کھلم کھلا دھوکہ دیتے رہے۔صادق حسین نے جو نکتہ اس افسانے میں اٹھایا وہ قابل توجہ ہے۔غربت سے متاثرہ معاشرے کے افراد جمہوریت کے مفہوم سے نابلد ہوتے ہیں انہیں جمہوریت سے آگاہی نہیں۔غریب عوام جہاں دو وقت کی روٹی کے لیے ترس رہی ہو وہاں اُن کے لیئے ایسی باتیں بے وقعت اور بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں اور اُن کے معصوم دماغ اس کے پورے مفہوم سے آشنا نہیں ہو پاتے۔ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو صادق حسین نے جمہوری اقدار اور نظامِ حکومت پر سنجیدہ انداز میں تنقید کی ہے۔

پتھر قینچی کے حوالے سے ایسا سوچتا ہے کہ شاید قینچی نے بھی اسے دھوکہ دیا ہے کیونکہ قینچی دبلا پتلا اور کمزور ہے اور سیلاب آنے کے بعد اُسے بہلا پھسلا کر اُسے خالی مکان کی چھت پر لا کر سازش کرتا ہے اور اس طرح وہ سیلاب سے بچنے کے لیے درخت کے ساتھ لٹکے گا۔یہ اس نے سوچا نہ تھا۔لیکن معصوم پتھر جمہوریت کے سیلاب کو پانی کے سیلاب کے ساتھ مربوط کر کے سولی پر لٹکنے اور درخت پر لٹکنے کو ہم معنی قرار دیتا ہے اور دوست پر شک کرتا ہے یہ غریب عوام کی ذہنی معصومیت ہے۔جسکو بیان کر مقصود تھا۔اس افسانے سے ایک اخلاقی سبق بھی ملتا ہے کہ جمہوریت کا پرچار کرنے والوں کو چاہیے کہ پہلے ملک میں فلاح و بہبود پر توجہ دے کر عوام کے دل جیتیں اور اُن سماجی زندگیوں میں آسانیاں لائیں۔اس طرح جہاں معاشرتی سطح پر غربت و افلاس کا قلع قمع ہو گا وہاں پر سماجی بے حسی اور خود غرضی جیسے عوامل خود بخود دم توڑتے نظر آئیں گے۔افسانے کے اختتام میں پتھر اور قینچی سیلاب سے بچنے کیلئے حفاظتی تدابیر اختیار کرتے ہیں۔اور ایک اونچے درخت کے ٹہنے کے ساتھ لٹک جاتے ہیں لیکن ہمت ہار جاتے ہیں۔قینچی جو دبلا پتلا ہوتا ہے اس کا انتقال ہو جاتا ہے جبکہ پتھر بھاری بھر کم جسامت کا مالک ہے ابتدائی طبی امداد کے بعد معجزانہ طور پر زندہ بچ جاتا ہے۔غربت و افلاس کے حوالے سے صادق حسین کا افسانہ انفرادیت کا نمونہ ہے۔اور صادق حسین کے احساسات میں شدت اور بیان میں سچائی کی عمدہ ترین تصویر پیش کرتا ہے۔صادق حسین نے پسماندہ اور ادنیٰ طبقے کو اسکی تمام تر کمزوریوں، مجبوریوں، محبتوں اور نفرتوں کے ملے جلے امتزاج کے ساتھ پیش کر کے ان کی مفلسی جہالت اور بے حسی کی تصویر عمدہ انداز میں پیش کی ہے۔

"پہلا قدم" افسانہ "اردو ڈائجسٹ" میں ۱۹۷۹ء میں چھپا اپنی نوعیت کے لحاظ سے روایتی افسانہ ہے۔ جس کا موضوع خاندانی زندگی اور اُس سے متعلقہ امور و مسائل ہیں۔ جنھیں صادق حسین نے لفظوں اور جملوں کی نوک پلک سنوارنے کے بعد تحریر کیا۔ انسان کی زندگی میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں۔ اطمینان اور سکون قلب جیسی نعمت اگر دائمی طور پر انسان کو نصیب ہو تو یہ دنیا جنت بن جائے۔ لہذا ہر انسان کو زندگی میں کوئی نہ کوئی مسئلہ یا پریشانی درپیش رہتی ہے۔ خوشی اور غم انسان کی زندگی کا حصہ ہوتے ہیں اور کبھی کبھی تو خوشی اور غمی کا امتزاج ایک ساتھ ہی انسان کی زندگی میں وارد ہوتا ہے کہ انسان کو خود پتا نہیں چلتا۔ لیکن قدرت کے کاموں کے آگے انسان بے بس ہو جاتا ہے۔ اگر انسان بے بسی کا اظہار کرنے کی بجائے خوشی کو اللہ تعالیٰ کی نعمت اور غمی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش سمجھ کر سہہ لے تو دنیاوی معاملات بھی سدھر جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے لگاؤ اور محبت کا رشتہ بھی مضبوط ہو جاتا ہے۔ انسان اگر ثابت قدمی کا مظاہرہ کرے تو اللہ تعالیٰ مشکلات سے نکال کر انسان کو اُس صبر کا پھل حقیقی خوشی کی صورت میں دیتا ہے۔ جس کا مظاہرہ وہ مشکل وقت میں کرتا ہے۔ افسانے میں صادق حسین نے ایک ایسی سلیقہ شعار اور مشرقی روایات کی پاسدار خاتون کے خاندانی حالات کی تصویر پیش کی ہے جسے پانچ سال بعد اولادِ نرینہ کی نعمت سے اللہ تعالیٰ نوازتا ہے تو وہ خوشی سے نہال ہو جاتی ہے۔ اور جب اسکا بیٹا بلو پہلی بار چلنا سیکھتا ہے اور پہلا قدم اٹھاتا ہے تو اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہتی۔ اس موقع پر شکیلہ کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو نکل آتے ہیں لیکن عین اسی روز اس کے خاوند مظہر کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے اور وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو جاتا ہے۔ بالآخر ڈاکٹروں اور شکیلہ کی طویل مدت دیکھ بھال کے بعد وہ بیسا کھیوں کے بغیر پہلا قدم اٹھانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس بار بھی شکیلہ کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو نکلتے ہیں لیکن وہ فیصلہ نہیں کر پاتی کہ اس کی یہ خوشی بڑی تھی یا بیٹے کے پہلا قدم اُٹھانے والی خوشی بڑی تھی۔ "چند روز پہلے اسی آنگن میں جب بلو نے پہلا قدم رکھا تھا تو اس کی آنکھوں سے اسی طرح آنسو نکل آئے تھے۔ شکیلہ فیصلہ نہ کر سکی کہ وہ خوشی بڑی تھی یا یہ۔" ۷۰ؔ

صادق حسین نے افسانے میں ماں کی نفسیات اور مامتا کے جذبات کی عکاسی جس انداز سے کی ہے وہ بے مثال ہے۔ مامتا کا جذبہ ایسا جذبہ ہے جسے آج تک کوئی بھی علم اور کوئی بھی کتاب بیان نہیں کر سکی۔ یہ وہ بے لوث جذبہ ہے جس کے آگے دنیا کی تمام خواہشات اور خوشیاں ماند پڑ جاتی ہیں۔ یہ ایسا جذبہ ہے جس کے آگے تمام طاقتیں اور تمام جذبات ہیچ نظر آتے ہیں۔ صادق حسین نے ماں کی نفسیات کو فطری جذبات کے ساتھ بیان کر کے انسانی نفسیات سے آگاہی کا ثبوت دے دیا ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے اس حقیقت سے روشناس بھی کروایا ہے کہ کوئی بھی انسان مکمل طور

پر خوش اور مطمئن نہیں رہ سکتا۔ چھوٹے موٹے مسائل انسان کی زندگی میں لگے رہتے ہیں۔اس حوالے سے افسانے کی یہ سطور قابلِ توجہ ہیں۔

"انسان کو ہر طرف سے خوشی نصیب نہیں ہوتی۔ کوئی نہ کوئی پھانس کلیجے میں چبھی رہتی ہے۔ یہ نہ ہوتا تو بندہ بشر خدا کو بھول جاتا ہے۔"۲۷؎ چھوٹی موٹی مشکلات اور مسائل بھی اگر انسان کی زندگی میں شامل نہ ہوں تو انسان خدا کو بھول جاتا ہے۔ جب انسان اندرونی طور پر عدم اطمینان کا شکار ہو تو وہ سکونِ قلب کے حصول کی خاطر اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے۔ کیونکہ بے شک دلوں کا اطمینان اللہ تعالیٰ کی یاد میں ہے۔اس لیے معاشرتی زندگی میں انسان کو جہاں خوشیاں ملتی ہیں وہیں آزمائشوں اور غموں کے سلسلے بھی انسان بچ نہیں سکتا۔اس کے علاوہ خانگی زندگی کے امور خوش اسلوبی کے ساتھ تبھی انجام پاتے ہیں جب رشتہ ازدواج سے منسلک دونوں فریقین یعنی میاں بیوی میں ہم آہنگی نہ پائی جائے۔ جیسے افسانے میں شکیلہ شادی کے ابتدائی پانچوں سالوں بعد بھی اولاد کی نعمت کیلئے ترستی ہے/عزیز واقارب تو اُسے اس بات کا احساس شدت سے دلاتے ہیں لیکن اسکا خاوند مظہر ایسی کسی خواہش کا نہ اظہار کرتا ہے اور نہ شکیلہ کو اس کمی احساس دلاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ لوگوں کی ہزار طرح کی باتیں سننے کے باوجود شکیلہ کا دل مطمئن رہتا ہے۔ میاں بیوی میں باہمی ہم آہنگی کامیاب ازدواجی زندگی کی ضمانت ہوتی ہے۔

عورت اگر سلیقہ شعار اور وفادار ہوگی تو وہ مرد کی زندگی میں خوشیاں بکھیر سکتی ہے۔چاہے وہ کیسے ہی مشکل وقت اور حالات سے دوچار کیوں نہ ہو۔ انسان کی نشوونما اور دیکھ بھال اگر مناسب طریقے سے کی جائے تو وہ اپنے زور بازو پر کھڑا ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور خاص کر جب انسان کی ناگہانی آفت کی وجہ سے متاثر ہو جائے تو مناسب دیکھ بھال اور توجہ اُسے بہت جلد صحت یاب کر دیتی ہے اور اس میں جینے کی لگن پیدا کرتی ہے۔ جس طرح کہانی میں شکیلہ اپنے شوہر کی مظہر کی تیمارداری میں رات دن ایک کر دیتی ہے۔اور اُسے کسی قسم کی کمی یا احساس کمتری کا احساس نہیں ہونے دیتی تو مظہر معذوری کے باوجود اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو جاتا ہے۔"وہ ہر صبح ایک نئی امید لے کر مظہر کو دیکھتی اور اندازہ کرتی کہ اب خاوند کی تکلیف میں افاقہ ہوا ہے۔"۲۸؎ یہ بھی ایک فطری عمل ہے کہ اولاد اپنے ماں باپ کے لیے نہ صرف خوشی کا باعث بنتی ہے بلکہ وہ اُن کی زندگی بھی ہوتی ہے۔ماں باپ کی اولاد کے سہارے جیتے ہیں۔اولاد ماں باپ کی طاقت ہوتی ہے۔آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا سکون ہوتی ہے۔اولاد جیسی نعمت ماں باپ کی طاقت کو ہر مشکل وقت میں دوگنا کرتی ہے۔اور اُن میں جینے کی اُمنگ پیدا کرتی ہے۔صادق حسین نے اس افسانے میں متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کی گھریلو زندگی اور مسائل کو فطری انداز میں بیان کیا ہے۔

"ادھار" افسانہ سماجی زندگی کے حوالے سے منفرد نوعیت کا افسانہ ہے۔ ترقی کی آڑ میں روایات سے انحراف کو اس افسانے کا موضوع قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ صادق حسین نے دیگر افسانوں کی اس افسانے میں بھی دیہی معاشرت کو موضوع بنا کر وہاں کے لوگوں کے رویوں اور طرز زندگی کے حوالے سے چند اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ کیونکہ بقول روبینہ کنول: "صادق حسین کو گاؤں کی سچی اور کھری اور بے غرض زندگی سے پیار ہے۔ اس لیے وہ گاؤں کی زندگی کو شہری زندگی کے مقابل زیادہ پرکشش تصور کرتے ہیں۔"۱۷۳

افسانے میں صادق حسین نے دیہاتی لوگوں کے حوالے سے بتایا ہے کہ ان کے اپنے اصول وضوابط ہوتے ہیں۔ جن سے انحراف کرنا گویا اپنی تہذیب سے انحراف کرنا ہے۔ دیہاتی من کے سچے اور دھن کے پکے ہوتے ہیں اور اپنے آباواجداد کی روایات کی پاسداری کے لیے تن من دھن کی قربانی دینے سے بھی گریز نہیں کرتے اور جب بھی وہ اپنے گاؤں میں غیر معمولی بات دیکھتے ہیں تو اس کے خلاف یکسوئی سے محاذ آرائی پر اتر آتے ہیں۔ افسانے میں بھی جب پہلے شہری نے چائے کی دکان کو کھولی تھی تو بڑے بوڑھوں نے صدائے احتجاج بلند کی تھی۔ "عورتوں نے شہری لفنگوں کو کوسنے دیے تھے۔ نوجوان چھویاں لے کر مرنے مارنے پر تُل بیٹھے تھے۔"۱۷۴ لیکن پٹواری اور نمبر دار نے بیچ بچاؤ کر کے معاملہ سنبھال لیا تھا۔ لیکن گاؤں میں جب سرکاری منصوبے کے تحت دریا کے قریب بند باندھنے کا اعلان کیا جاتا ہے تو گاؤں والے اس کے خلاف ہو جاتے ہیں لیکن گاؤں کا نمبر دار انھیں مستقبل کے حوالے سے سنہرے سپنے دکھاتا ہے کہ گاؤں میں خوشحالی آئے گی تو گاؤں والے نہ صرف خاموشی اختیار کر لیتے ہیں بلکہ مستقبل کے حوالے سے اپنے معصوم ذہنوں میں منصوبہ بندیاں بنانا شروع کر دیتے ہیں۔ "ہر شخص اپنی اپنی بساط کے مطابق ایک سنہرے مستقبل کا خواب دیکھنے لگا۔"۱۷۵ نتیجتاً گاؤں میں پکی سڑک بننے سے اور حکومتی پالیسی کے پایہ تکمیل تک پہنچنے سے گاؤں میں خوشحالی آجاتی ہے چھوٹی چھوٹی اشیاء کی خرید وفروخت شہر میں کرنے کی وجہ سے گاؤں والوں کی زندگیوں میں کایا پلٹ جاتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا گاؤں شہریوں کے رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ نئی تہذیب کا اجالا گاؤں والوں کی زندگیوں اور طرزِ معاشرت پر ایسے اثرات ثبت کرتا ہے کہ گاؤں کے نمبر دار کی بیوی اور بیٹی بھی شہریوں جیسا لباس زیب تن کرنے لگتی ہیں۔ جس پر گاؤں کے نمبر دار کو بہت غصہ آتا ہے اور وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ اور وہی لوگ جو ابتداء میں اس نئی روشنی کو قبول کرنے سے انکار کرتے نظر آتے ہیں وہی اس نئی روشنی کی چکاچوند کرنوں کی لپیٹ میں اس طرح گرفتار ہوتے ہیں کہ نکل نہیں سکتے۔ شہریوں کے نقش قدم پر چلتے چلتے اپنی ضروریات کی تکمیل کے چکروں میں ان کے اپنے پاؤں چادر سے باہر نکلنے لگے۔ ایک دن نمبر دار آپے سے باہر ہو گیا، باوجود منع کرنے کے نمبر دارنی نے میک اپ کر رکھا تھا۔

تبدیلی ہر معاشرے کا حصہ ہوتی ہے لیکن اس تبدیلی کو خود پر اس حد تک نہیں طاری کرنا چاہیے کہ انسان اپنی اصلیت کو بھول جائے اور روایات سے انحراف کرتا پھرے۔ گاؤں والے پر سکون زندگی بسر کر رہے تھے اور تھوڑے پر بھی قناعت کر کے صبر شکر کے ساتھ گزارا کر رہے تھے۔ لیکن جونہی ان کا ربط پکی سڑکوں کی وجہ سے قریبی شہر سے بڑھا اُن کے جینے کے انداز ہی بدل گئے۔ تھوڑی کی بجائے زیادہ کی فکر ستانے لگی۔ پہلے مرغی کا انڈہ چونی میں بک جاتا تو بھی وہ صبر شکر کرتے لیکن اب بارہ آنے ملنے پر بھی اُن کو اطمینان نہ تھا۔ "گھی کے لیے شہر والے پیشگی رقمیں دے جاتے۔ مانگ بڑھ گئی تو عورتوں نے چوری چھپے بناسپتی گھی کی ملاوٹ کا فن سیکھ لیا۔"١٧٦ حرص اور لالچ نے اس قدر ان کے دلوں میں جگہ بنالی کہ گاؤں کے لوگ دیدہ دلیری سے ملاوٹ کرنے لگے۔

صادق حسین نے دیہاتیوں کے بدلتے رویوں کی عکسبندی جس انداز سے کی ہے اس طرح انھوں نے دیہی معاشرے پر تنقید بھی کی ہے۔ تبدیلی اور انقلاب کی آڑ میں روپے پیسے کی طلب انسان کے اوصافِ حمیدہ (قناعت اور شکر گزاری) کو روند ڈالتی ہے۔ اور روپے پیسے اور مال و دولت کی لالچ میں انسان بعض اوقات انسانیت کے مرتبے سے بھی گر جاتا ہے۔

نئی تہذیب کی روشنی نے دیہاتیوں کو جو ابتدا میں سادہ لوح اور معصوم تھے انھیں بے باک اور بے شرم بنا دیا۔ یہاں یہی تاثر ابھرتا ہے کہ نئی تہذیب نہ صرف معاشرے کو متاثر کرتی ہے بلکہ لوگوں کے رویوں پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ معاشرے میں جب کوئی چیز عام ہو جائے تو معاشرے کا ہر فرد ہی اُسے خوش دلی سے قبول کرنے لگ جاتا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ اس کے کیا بھیانک نتائج سامنے آ سکتے ہیں۔ خود غرضی بے باکی، ملاوٹ اور بے شرمی جب کسی بھی معاشرے میں عام ہو جائے تو لوگوں کو وہ برائی برائی نہیں لگتی اور دانستہ یا نادانستہ طور وہ اس کو اپنانا شروع کر دیتے ہیں اور اپنی اقدار و روایات میں جگہ دے کر اپنی قائم کردہ روایات سے بغاوت کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

دیہاتیوں کے اعتقادات کے حوالے سے جو بات افسانے میں زیر مطالعہ رہی وہ یہ کہ سادہ لوح دیہاتی سنی سنائی باتوں پر عمل اور یقین کرنے کے اس حد تک عادی ہو جاتے ہیں کہ بعض اوقات وہ اشیاء جن کا کوئی وجود نہیں ہوتا اُسے سچ مان لیتے ہیں اور اس پر کامل یقین کرنے لگ جاتے ہیں جیسے افسانے میں سائیں بابا کے مزار کو وہ لوگ مقدس مانتے ہیں۔ وہاں عرس اور میلے منعقد کیے جاتے ہیں اور اس پر چڑھاوے چڑھاتے ہیں منتیں مانتے ہیں کیونکہ گاؤں میں مشہور ہوتا ہے کہ "سائیں بابا کنویں کے منہ پر مصلا بچھا کر نماز پڑھا کرتے تھے اور اُن کے کرامات بہت زیادہ تھے۔"١٧٧ یہی باتیں گاؤں والوں نے خود سے گھڑلی تھیں اور نسل در نسل گاؤں کے لوگ سائیں بابا کے مزار کی

رکھوالی اور دیکھ بھال کرتے چلے آرہے تھے۔ لیکن بعد میں یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ جس جگہ وہ سائیں بابا کا مقدس مزار مانتے ہیں وہاں پر قبر نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی بلکہ ایک گڑھے میں درخت کی جڑ سی نظر آتی ہے۔ حقیقت کا انکشاف ہونے پر گاؤں والے ہکا بکا رہ جاتے ہیں۔

صادق حسین نے سائیں بابا کے مزار کا ذکر کر کے یہ واضح کرنا چاہا ہے کہ گاؤں کے لوگوں کی سادہ لوح طبیعت سے لوگ کس طرح ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ تعلیم کی کمی اور جہالت کے باعث لوگ بہت ساری باتیں خود سے منسوب کر لیتے ہیں۔ پورا افسانہ دیہی معاشرت سے وابستگی اور خالصتاً دیہاتی زندگی کی فضا قائم لیے ہوئے ہے جو صادق حسین کے خالص دیہی سماجی شعور و آگہی کو ظاہر کرتا ہے۔

صادق حسین کے افسانوں میں عصری زندگی اور اس کے مسائل کو سچا شعور اور عرفان ملتا ہے اور خاص کر معاشرتی عوامل سے متاثرہ افراد کی نفسیاتی اور ذہنی کیفیات کی مکمل تصویر پیش کرنے میں وہ خاصے کامیاب بھی رہے۔ صادق حسین کی افسانہ نگاری کے حوالے سے ڈاکٹر صفدر محمود رقمطراز ہیں۔ "بلاشبہ صادق حسین بہت بڑے افسانہ نگار تھے۔ ان کا مشاہدہ، نہایت عمیق اور تیز تھا۔ بظاہر سمندر کی طرح خاموش اور پرسکون لیکن اندر ایک تلاطم برپا رہتا تھا۔"۱۷۸؎

غربت اور بھوک کے عنوان پر صادق حسین نے بہت کربناک افسانے لکھے۔ افسانہ، جھولی، انسان، اور "دو چھٹانک چاول" کی طرح "اور سورج نکل آیا" بھی غربت کے موضوع کا احاطہ کرتا ہے۔ مشرقی پاکستان (بنگال) میں طغیانی اور قحط کے باعث آئے دن غربت سوالیہ نشان بن کر آتی ہے۔ اس افسانہ میں بھی قحطِ بنگال کی ہولناکیوں کی خوفناک تصویر پیش کی گئی ہے۔ پورے افسانے کی کہانی ایک ایسے شخص کے گرد گھومتی ہے جو بہت زیادہ دولتمند ہے۔ اور اس نے یہ دولت ناجائز ذرائع سے اکٹھی کی۔ کیونکہ اسکا بچپن غربت اور مفلسی کی وجہ سے بہت اذیت ناک گزرا تھا۔ اسکی ماں کا انتقال بھی بھوک اور غربت کی وجہ سے ہوا لہذا جب وہ شعور کی وادی میں قدم رکھتا ہے تو دولت اکٹھی کرنے کے خواب دیکھتا ہے اور یوں دیکھتے ہی دیکھتے اس کا شمار امراء میں ہونے لگتا ہے۔ دھان کی بوریاں کشتیوں میں لا کر وہ ایک تحصیل سے دوسری تحصیل تک پہنچاتا اور یوں سمگلنگ کے دھندے میں اس کا نفع ہوا اور ضمیر کی خ ملش کو بالائے طاق رکھ کر وہ دولت سمیٹنے کے لیے ہر حد پار کرتا چلا گیا۔

"شروع شروع میں اس کے دل میں ایک چبھن سی ہوا کرتی تھی مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا دل میں کھٹکنے والا کانٹا خود بخود نکل گیا۔ اور اب اسے اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا کہ دولت کی گرمی زندگی کو کتنی توانائی بخش سکتی ہے۔"۱۷۹؎

دولت کی ریل پیل اور روپیہ پیسہ اُسے بہت زیادہ مغرور اور ظالم بنادیتا ہے لیکن افسانے کے اختتامی حصے میں اس کے رویے میں اس وقت تبدیلی آتی ہے جب وہ اپنے باورچی خانے سے رات کے وقت ایک چور کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیتا ہے۔ کیونکہ وہ چور کچھ اور چوری کرنے نہیں آتا بلکہ اس کے کچن سے باسی کھانا کھانے کے لیے آتا ہے۔ اُس وقت ماضی کا ایک ایک لمحہ اسکی نگاہوں سے ہو کر گزر جاتا ہے جب اسکی ماں نے باسی بھات اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُسے کھلا کر اپنی جان کی بازی ہاری تھی۔ ماضی کے تمام واقعات اس کی آنکھوں سے آنسو برسانے کا سبب بنتے ہیں۔ اور یوں ایک سفاک شخص کا دل پلک جھپکتے میں موم ہو جاتا ہے۔"یکایک اکبر کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ کھنچی ہوئی رگیں اپنی اصلی حالت پر آگئیں۔ جذبات کا ایک ہجوم اس کی آنکھوں میں ڈبڈبانے لگا۔"۱۸۰

صادق حسین نے مشرقی پاکستان میں دورانِ ملازمت قیام کے دوران وہاں کے حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس ستم گزیدہ معاشرے کی عکاسی لفظی بیان سے کردی۔ غربت کے ہاتھوں انسانیت کی تذلیل کو انوکھے پیرائے میں بیان کر کے صادق حسین قاری کی تمام تر توجہ حاصل کرنے میں نہ صرف کامیاب ہوئے ہیں۔ بلکہ انھوں نے عوام میں سماجی بیداری کے عنصر کو بھی نمایاں کیا ہے۔استحصالی معاشرے کا عکاس یہ افسانہ ظالموں کے ظلم اور مظلوموں کی مظلومیت کی صدا لگاتا ہے کہ یہ انسان ہی ہے جو اپنے جیسے انسانوں کو بھوک سے بلکتا چھوڑ دیتا ہے یہاں تک کہ موت اُس کو اپنے شکنجوں میں لے لیتی ہے یہ سفاکی کی انتہا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان کا ضمیر اس کے بداعمال اور بدافعالیوں پر جھنجوڑتا ہے۔اور بعض اوقات انسان اپنے ضمیر کے ہاتھوں شکست کھانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔اور اس وقت اس کا ضمیر اس کے غرور کی برف کو پگھلا دیتا ہے۔

صادق حسین نے افسانے میں ضمیر کے ہاتھوں انسان کی مات اور باطنی کشمکش کو بہت عمدہ انداز میں بیان کر کے قاری کی سوچ اور شعور کو نیا رخ عطا کیا ہے۔اور معاشرے کے فرض شناس شہری ہونے کا ثبوت دے کر معاشرتی مسائل کے حل کی جانب عوام اور حکومتِ وقت کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ پورا افسانہ انسانی نفسیات کی بھرپور عکاسی کرتا ہے جسے صادق حسین نے روایتی انداز میں بیان کر کے حقیقت پسند ہونے کا مظاہرہ کیا ہے۔

افسانہ "پیپل، پاؤں اور دائرے "پہلی بار ۱۹۶۳ء میں "ادب لطیف "میں شائع ہوا۔بیک وقت یہ افسانہ بہت سارے معاشرتی پہلوؤں کی تصویر پیش کرتا ہے۔ مثلاً یتیموں کے ساتھ ناروا سلوک اور اُن کی جائیداد پر قبضہ۔ ہمارے اس سماجی پہلو کو سامنے لاتا ہے جہاں انسان لالچ کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنوں کی حق تلفی کرتا ہے اور تمام لطیف احساسات سے عاری ہو کر انسان بے حسی اور خود غرضی کی انتہا تک پہنچ جاتا ہے۔دوسری اہم بات جو قابل توجہ ہے وہ یہ کہ انسان کا تعلق جس سوسائٹی یا پیشے سے ہو اسکی سوچ بھی اسی سماج اور پیشے تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔انسان کی

زندگی خاص کر پیشہ ورانہ زندگی کے اثرات اس کی سوچ اور شخصیت پر بھی پڑتے ہیں۔ایک جوتوں کی دکان پر کام کرنے والا صرف جوتوں اور پاؤں کی خوبصورتی اور بدصورتی کے بارے میں بات کر سکتا ہے۔اگر کوئی ڈرائیور ہے تو وہ ڈرائیوری کے گراور گاڑیوں کے ماڈل تک خود کو محدود کرلیتا ہے۔اور روزمرہ معمول کی زندگی اور باتوں میں اپنے پیشے سے متعلق بات کا کوئی نہ کوئی پہلو ڈھونڈ نکالتا ہے۔جیسے افسانے میں اکبر جوتے فروخت کرتا ہے تو سارا دن گاہک خواتین کے پاؤں اور جوتوں سے اس کا واسطہ پڑتا ہے۔اور اس کے نزدیک خوبصورتی کا معیار صرف پاؤں کے خوبصورت ہونے تک محدود ہے۔وہ عورت جس کا چہرہ خوبصورت ہو لیکن پاؤں بدصورت تو اس کے نزدیک وہ عورت کبھی خوبصورت نہیں ہو سکتی۔یہ بات بھی عالمگیر سچائی کے زمرے میں آتی ہے کہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی انسان کے جذبات میں برانگیختگی پیدا ہو جاتی ہے۔اور جذبات کو قابو میں رکھنا انسان کے لئے مشکل ہو جاتا ہے۔اور یہی جذبات کی شدت بعض اوقات انسان کو اس کی اصل راہ سے بھٹکا دیتے ہیں۔جیسے اکبر کو جوتوں کی دکان پر نظر آنے والی چھیمی ماں متاثر کرتی ہے اور وہ گاؤں والی چھیمی ماں کو بھلا کر شہر والی چھیمی ماں کے تصور میں گم رہتا ہے۔اور وہی جذبات کا دھارا اُسے طوائفوں کے اڈے پر لے جاتا ہے۔یہ بات بھی حقیقت ہے کہ انسان کو اسکی صحبت خراب کرتی ہے۔اور اس افسانے میں یہ مقولہ اکبر پر صادق آتا ہے کہ آدمی اپنی صحبت سے پہچانا جاتا ہے۔اکبر کو یوسف ڈرائیور بہلا پھسلا کر طوائفوں کے اڈے پر لاتا ہے جس کے نتیجے میں اکبر کو ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑتے ہیں کیونکہ اسکا مالک سیٹھ خود بھی اُسی کوٹھے سے نکل رہا ہوتا ہے۔اور جب وہ اکبر کو اس بدنام جگہ پر دیکھتا ہے تو اُسے برا بھلا کہتا ہے اور ملازمت سے نکال دیتا ہے۔صرف اس وجہ سے کہ اکبر نے بھی اپنے مالک کو ایسی جگہ پر دیکھ لیا تھا۔تو بجائے شرمندہ ہونے کے اُسکا مالک اس کے ساتھ ایسا رویہ اختیار کرتا ہے جس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اکبر ہی سب سے بڑا گنہگار ہو اور سیٹھ خود پاکباز ہے۔یہاں وہ معاشرتی رویہ سامنے آتا ہے جہاں دولت اور طاقت کے زور پر انسان کچھ بھی کر سکتا ہے جذبات کو فروخت بھی کر سکتا ہے اور روپے پیسے کے عوض اپنی عزت کو بحال بھی کر سکتا ہے۔گویا ہمارے معاشرے میں روپے اور طاقت کو ہی بنیادی اہمیت حاصل ہے۔جس کے پاس طاقت ہے دنیا اس کی ہے۔روپے کی طاقت انسان کی بدافعالیوں پر بھی پردہ ڈال دیتی ہے جبکہ ایک غریب انسان جس کا کوئی قصور بھی نہ ہو، ناحق قصوروار ٹھہرا دیا جاتا ہے اور اسکی ایک چھوٹی سی لغزش بھی ایک بڑی خطا کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔اور وہ دوسروں کو اپنی شکل دکھانے کے قابل نہیں رہتا ہے۔معاشرتی دروغ گوئی اور دوغلے پن کی اس زیادہ واضح اور جامع مثال نہیں مل سکتی ہے یہ معاشرتی تضادات ہی ناانصافی اور لاقانونیت کو جنم دیتے ہیں۔دولت اور طاقت کے نشے میں انسان ہر حد عبور کر جاتا ہے۔انسان ہمیشہ خود کو اپنے ماحول کے گرد ہی پاتا ہے۔"پیپل پاؤں اور دائرے" در حقیقت اکبر کی زندگی کا مرکز و محور ہے۔اور وہ

پیپل کا پیڑ تو افسانے میں اس وجہ سے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اس پیپل کے پیڑ کے نیچے ہی اُسے چھیا ماں ملی تھی اور وہ محبت کے لمس اور پھر محبت میں فراق جیسی کرب ناک حقیقتوں سے آشنا ہوا تھا۔ اور اسی پیپل کے پیڑ نے اس کی زندگی کی کایا پلٹی تھی۔ جب وہ درخت کے نیچے بیٹھ کر بے ربط لکیریں بنا رہا تھا تو اتفاقیہ طور پر شہریوں کی بارات اس درخت کے نیچے رکی تھی اور دولہے کا باپ اسے ترس کھا کر شہر لے آیا تھا اور یوں اسکی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا تھا۔ جہاں سماجی آگاہی کے ساتھ ساتھ اس کے شعور کے ساتھ دیگر تمام حسیں بیدار ہوئی تھیں۔

صادق حسین نے پیپل کے درخت کو علامت کے طور پر استعمال کر کے افسانے کو معنویت بخشی ہے۔ علامتی انداز اختیار کرتے ہوئے انہوں صاحب حیثیت لوگوں کو یہ بات ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے کہ تمھارے مال اسباب اور جائیداد پر غریبوں کا بھی حق ہے لہذا اس میں سے کچھ حصہ لوگوں کی فلاح کے لیے بھی لگاؤ۔ افسانے میں مرکزی کردار اکبر کے ذریعے بار بار یہ کہلوانا کہ "جس میدان میں پیپل کا پیڑ ہے وہ خدا کی زمین ہے اور باقی زمینیں اس کے بندوں نے آپس میں بانٹ لی ہیں۔"[۱۸۱] در حقیقت اُن حقائق کی نشاندہی ہے جہاں انسانیت نے ابھی مکمل طور پر دم نہیں توڑا۔ جہاں غریبوں کے مسیحا اور مددگار ابھی دنیا میں موجود ہیں۔ پیپل کا درخت دراصل اُن لوگوں کی نشاندہی کرتا ہے جو خوفِ خدا اور خدا ترسی کے جذبات سے ابھی عاری نہیں ہوئے۔ اُن میں خدمتِ خلق کا جذبہ ابھی موجود ہے۔ لہذا اکبر کا بار بار پیپل کے درخت کے حوالے سے ایسے الفاظ و کلمات کا ادا کرنا خیر اور بھلائی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کیونکہ اسکی زندگی میں مثبت موڑ لانے کا باعث وہ درخت ہی تھا۔ اسی لیے تو جب سیٹھ منافع کی رقم سے جائیداد خریدتا ہے تو اکبر کا دل چاہتا ہے کہ وہ مالک سے کہے کہ اس دس ایکڑ زمین پر ایک پیپل کا درخت بھی لگا دے کیونکہ جہاں پیپل کا پیڑ ہو خدا کی زمین ہوتی ہے۔ باقی زمینیں انسان آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ پیپل کا پیڑ غریبوں کی پناہ گاہ ہے اور باقی زمینیں انسان میں شر اور فساد پھیلاتی ہیں۔ پاؤں اور دائروں کا ذکر بھی افسانے میں خاصی معنویت رکھتا ہے۔ پاؤں نسوانی حُسن کی جہاں نشاندہی کرتے ہیں وہیں نسوانی حُسن کی پامالی کے طور بھی افسانے میں دکھائے گئے۔ اکبر جوتوں کی دکان پر جوتے فروخت کرتا ہے لہذا خواتین کو جوتے پہنا پہنا کر اُس کے نزدیک خوبصورتی کا معیار صرف پاؤں رہ گئے تھے۔ لیکن یہی خوبصورت پاؤں جب وہ بازارِ حُسن میں ناچتے نظر آتے ہیں تو اکبر کے ذہن میں ایک زوردار جھماکا لگتا ہے۔ "اور اُسے لگا پیپل کا پیڑ کانپ اٹھا ہے۔"[۱۸۲] دائرے جو وہ پیپل کے پیڑ کے نیچے بناتا ہے وہ بے ربط دائرے تھے لیکن اُن کی حقیقت بھی کھل کر اُس کے سامنے آتی ہے جب وہ شہری چھیماں کے پاؤں کو کوٹھے پر ناچتے اور دائرے بناتے دیکھتا ہے۔ افسانے میں دائروں کا ذکر دنیا گول ہے جیسی حقیقت کو واضح کرتا ہے۔ انسان کا میل کسی نہ کسی طرح سے اُن لوگوں سے ہو جاتا ہے جو کبھی اُن کے ماضی کا حصہ رہے ہوں یا اُن جیسے افراد سے اس کی ملاقات ہو

جاتی ہے جن میں اُن کے بچھڑے لوگوں کا مکمل عکس موجود ہو۔ جیسے اکبر کو شہر میں بھی گاوں جیسی چھیماں کی مشابہت رکھنے والی چھیماں مل جاتی ہے۔ اسی طرح دائرے جیسے گول ہوتے ہیں جن پر گھوم کر انسان اسی نکتے پر آ جاتا ہے جس نکتے یا مقام سے چلتا ہے تو اُسی مقام پر آ گرتا ہے۔ جیسے افسانے میں اکبر غربت کے ماحول سے نکل کر ایک شاندار ماحول میں آتا ہے جہاں اس کو دو وقت کی روٹی کے لیے گاؤں میں گھومنا پڑتا تھا۔ اور لوگوں کا جھوٹن کھانا پڑتا وہیں قدرت اس پر جب مہربان ہوتی ہے تو وہ مکھن اور توس کا ناشتہ کرتا ہے اور مرغن کھانے کھاتا ہے لیکن قسمت کی ستم ظریفی ایک بار پھر اُسے غربت کی دلدل میں دھکیل دیتی ہے۔ اور وہ ناکردہ گناہ کے کے جرم کی پاداش میں ایک بار پھر غربت کی چکی میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ پورا افسانہ صادق حسین کی فنی بصیرت کی نشاندہی کرنے کے ساتھ ساتھ صادق حسین کی فنکارانہ فکر، تخیل اور احساسات کی گہرائیوں کا عمدہ ترجمان بھی ہے۔

صادق حسین کے افسانوں میں ذہنی و جذباتی حقیقتوں کا فنی اظہار بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اُن کی کہانیوں میں اُن کی ظاہری غیر جانبداری کے پیچھے ان کی دردمندی اور انسان دوستی کا جذبہ اور تصور ہر لحہ متحرک رہتا ہے۔ انہیں سماجی رویے اور معاشرتی تضادات کو جذباتی اور داخلی سطح پر پیش کرنے میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ اور یہ خصوصیت بلاشبہ اُن کی تجزیاتی قوت اور قوت مشاہدہ کی دین تھی۔ انھوں نے موضوعات میں مجبور اور بے کس لوگوں کی جذباتی الجھنوں اور ماحولیات گھٹن کو جس انداز سے بیان کیا ہے اُن پر ترقی پسند حقیقت نگار افسانہ نویس ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ وہ عصری اور سماجی واقعات کی عکسبندی میں پریم چند کے مقلد اگر نہ بھی کہلائیں تو سماجی حقیقت کے بیان کرنے میں وہ پریم چند کے ہم خیال ضرور کہے جا سکتے ہیں۔ پریم چند کی طرح صادق حسین نے معاشرے میں انسان کے کردار، رشتوں اور رویوں کے احساس کی نقاشی جس انداز سے کی اس حوالے سے انھیں پریم چند کا ہمنوا کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

افسانہ "دس نمبریا" بھی صادق حسین کے دیگر افسانوں کی طرح غریب معاشرے سے تعلق رکھنے والے افراد کی سماجی زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ صادق حسین کا یہ افسانہ نیا دور میں پہلے "پانچویں منزل" کے نام سے چھپا تھا بعد میں اُس کے عنوان میں تبدیلی کر کے "دس نمبریا" کے نام سے شائع کیا گیا۔ دوسری مرتبہ اس افسانے کی اشاعت ۲۰۱۲ ء میں ہوئی۔ افسانے کا موضوع غریب طبقہ ہے۔ وہ غریب طبقہ جہاں ٹوٹے پھوٹے مکانوں کی دیواریں مشترک ہوتی ہیں۔ جہاں دکھ سکھ کی دیواریں بھی مشترک ہوتی ہیں۔ جہاں سب غریب ضرور ہیں لیکن باہم مل جل کر زندگی گزارتے ہیں۔ جہاں ایک گھر کی عزت سارے محلے کی عزت اور ایک گھر کی بے عزتی پورے محلے کی بے عزتی سمجھی جاتی ہے۔ صادق حسین نے ان تنگ گلیوں میں پرورش پانے والے افراد کی زندگیوں کی جھلک دکھا کر ہمارے سماج میں رہنے والے امراء اور روساء کی توجہ ان لوگوں کی زندگیوں کی جانب مبذول کرائی ہے۔ جو تھوڑی میں بھی صبر شکر اور

قناعت کرنے کے عادی ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک اٹل حقیقت ہے کہ ہمارے معاشرے میں غربت سرطان کے مرض کی طرح پھیل چکی ہے۔اور اس غریب معاشرے سے تعلق رکھنے والے اپنی چھوٹی چھوٹی ضروریات اور سہولیات کے لیے ترس جاتے ہیں یہاں تک کہ بروقت علاج معالجے یا طبّی امداد کے نہ ملنے کی وجہ سے قیمتی زندگیوں کو جان سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ جہاں کے رہنے والے کیڑے مکوڑوں کی طرح زندگی گزارنے پر مجبور کردیے جاتے ہیں۔

صادق حسین نے جہاں غریب طبقے کی مشکلات کو سامنے لایا وہیں پر وہ انسان کی اُس خوبی اور وصف کا ذکر بھی کرتے ہیں جسکی وجہ سے وہ ہر طرح کے ماحول میں خود کو ڈھال لیتا ہے۔انسان کی فطرت میں یہ بات شامل ہے کہ اُسے جس طرح کا ماحول ملتا ہے وہ اپنے آپ کو اس ماحول کے مطابق ڈھال لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جیسے افسانے میں شیدو اُستاد کے محلے کے لوگ ایسے علاقے میں رہتے ہیں جہاں غلاظت اور گندگی نواردوں کے لیے سانس لینا بھی دشوار کر دیتی ہے لیکن اس محلے کے رہنے والے اس تعفن زدہ اور آلودہ ماحول کے عادی ہیں اور وہ اس بدبو سے نفرت نہیں کرتے کیونکہ وہ تعفن وبدبو اور گندگی ان کے ماحول کا حصہ بن چکی ہے۔

"اگر کوئی نو وارد وہاں آنکلتا تو ناک پر رومال رکھ لیتا اس کا جی متلانے لگتا مگر اس محلے کے رہنے والوں کے لیے وہاں کوئی بدبو نہ تھی۔ کیونکہ اس بدبو نے ان کی قوتِ شامہ کے وجود میں آنے سے بہت پہلے جنم لیا تھا۔"۸۳؎

صادق حسین منفی عوامل سے مثبت پہلو تراشنے پر قدرت رکھتے ہیں اور یہی خصوصیت اُن کی زندگی سے متعلق متوازن رویے کی نشاندہی کرتی ہے۔ یہ بھی عالمگیر سچائی ہے کہ انسان جس ماحول سے تعلق رکھتا ہے وہاں طاقت اور دبدبے کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ خاص کر ہمارے معاشرے میں روپے پیسے اور رعب دبدبے کو ہی اہمیت دی جاتی ہے۔ طاقتور ہی معاشرے میں کامیاب زندگی بسر کر سکتا ہے۔ باقی پسماندہ طبقہ کی حیثیت کیڑے مکوڑوں سے کم نہیں ہوتی۔ طاقت اور بدبہ چاہے دولت کا ہو یا ہتھیار کا دونوں ہی یکساں اہمیت کے حامل ہیں۔افسانے میں استاد شیدو نامی گرامی جرائم پیشہ شخص ہے۔ جس کی دھاک اس کے پورے علاقے میں بیٹھی ہے اور کسی غیر کو اس کے محلے میں آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی جرات نہیں ہوتی۔ صرف اس وجہ سے کہ اُس کے پاس ہتھیار کی طاقت تھی۔ ہمدردی اور غمگساری جیسے جذبات کامیاب معاشرتی زندگی گزارنے کے علاوہ اخوت اور مساوات کا درس بھی دیتے ہیں۔ معاشرہ کوئی بھی ہو اور اس معاشرے میں خواہ کیسے لوگ ہوں معاشرہ برائیوں کی جڑ کی صورت کیوں نہ اختیار کر جائے اس میں کچھ افراد ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جو ہمدردی اور غمگساری کے جذبات سے معمور لوگوں کی فلاح و بھلائی کے لیے اپنی زندگیوں کو مشکلات میں ڈالنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ درحقیقت ایسے ہی لوگ معاشرے کے اصلاح کار ہوتے ہیں۔ صادق حسین سماج کے منفی پہلوؤں کو جہاں پر اجاگر کرتے ہیں وہاں پر مثبت پہلوؤں کی نشاندہی کر کے زندگی سے متعلق متوازن رویے کی نمائندگی بھی کرتے نظر آتے ہیں اور یہ صفت اُن کی مثبت سوچ کی ترجمانی کرتی

ہے۔ جیسے افسانے میں شیدو جرائم پیشہ ہونے کے باوجود محلے کی عزت کا رکھوالا ہوتا ہے اور مشکل وقت میں جب محلے کی ایک عورت زچگی کی تکلیف میں مبتلا ہو کر زندگی کی بازی ہار رہی ہوتی ہے تو استاد شیدو فوراً بھاگ کر جاتا ہے اور ڈاکٹرنی کو بلا کر لاتا ہے لیکن ڈاکٹرنی کی پہنچنے سے پہلے ہی وہ عورت انتقال کر جاتی ہے۔ تو اس پر وہ بہت نادم بھی ہوتا ہے اور افسوس بھی کرتا ہے کہ وہ بروقت اس کی مدد نہ کر سکا۔ گلی کے نکڑ پر بجلی کے کھمبے سے ٹیک لگائے استاد شیدو چپ چاپ کھڑا تھا۔ برقی قمقمے کی روشنی میں آنسوؤں کے قطرے اس کی آنکھوں میں تھر تھرا رہے تھے۔

اپنے افسانوں میں صادق حسین چھوٹے چھوٹے جملوں کے ذریعے معاشرے پر تنقید بھی کی ہے۔ مثلاً یہ جملہ قابلِ توجہ اور معنویت سے بھرپور ہے۔ یوں تو اس دنیا میں ہم سب ڈاکو ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کوئی چھوٹا ڈاکو ہے کوئی بڑا۔ افسانے میں شیدو استاد کے ذریعے مصنف نے یہ جملہ کہلوا کر معاشرتی حقیقت سے پردہ اُٹھایا ہے اور ہمیں بتانے کی کوشش کی ہے کہ انسان سے زیادہ ظالم کوئی نہیں دوسروں کے حقوق کو سلب کرنا انسان کا شیوہ ہے اور اپنے اپنے ظرف اور رتبے کے مطابق ہر شخص دوسروں کا استحصال کرتا نظر آتا ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے پیمانے اور پیشے سے لے کر بڑے سے بڑے طبقے اور پیشے سے تعلق رکھنے والے افراد دوسروں کی حق تلفی کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگاتے۔ اس حوالے سے اُن کا یہ کہنا بجا ہے کہ ہم سب ڈاکو ہیں۔ کوئی چھوٹا ڈاکو ہے تو کوئی بڑا۔ مجموعی طور پر افسانے میں صادق حسین کے سماجی رویوں، تضادات اور غریب طبقے کے مسائل کو پیش کر کے عوام کے سماجی شعور کو بیدار کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

صادق حسین کے افسانوں کا موضوعاتی تجزیہ کرنے سے معلوم ہوا کہ آپ کے افسانوی موضوعات میں تنوع ہے۔ آپ نے جہاں غریب اور معاشرتی سطح پر ناپسندیدہ افراد کی زندگیوں اور اس میں درپیش مسائل کو پیش کیا وہاں آپ نے متوسط طبقے کی طرزِ بود و باش کے علاوہ اونچے طبقے کی سماجی زندگی کو بھی موضوعات میں جگہ دے کر ان کے مسائل کو سامنے لایا۔ لیکن زیادہ تر آپ کا مرکز دیہی معاشرت ہی رہا۔ آپ نے دیہی معاشرت کا قریب سے مشاہدہ کیا اور دیہی کلچر سے متعلق ایک ایک چیز کو بہت باریکی سے بیان کرنے میں کامیاب ہوئے۔ آپ سماجی زندگی کے ان مسائل کو بیان کرنے میں کامیاب ہوئے جن پر ایک عام فرد کی نگاہ نہیں پڑ سکی۔ چھوٹے چھوٹے سماجی مسائل کو بیان کرنے کے علاوہ انھوں کامیاب معاشرتی زندگی گزارنے کے اصولوں کو بیان کر کے معاشرتی سطح پر ناصح اور مصلح ہونے کا ثبوت بھی دیا۔ وہ ہر طرح کے سماج اور اس کے رکھ رکھاو سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے اعلیٰ انسانی اقدار کو نہ صرف زیرِ بحث لایا بلکہ ہر طرح کے سماج سے منفی پہلوؤں کی نشاندہی کر کے انھیں تنقید کا نشانہ بھی بنایا۔ ان کے افسانوں کے مطالعے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ ان کے تمام افسانے ان کی بے پناہ قوتِ مشاہدہ کا نتیجہ ہیں۔ انھوں نے اپنے گہرے مشاہدے اور

فطرتِ انسانی کے مطالعے سے اپنی کہانیوں میں حقیقت کا رنگ بھرا ہے۔اور پریم چند کے اس قول کی عملی تصویر پیش کی ہے کہ " ہماری کسوٹی پر وہ ادب پورا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو اور زندگی کے حقائق کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت اور بے چینی پیدا کر دے۔"آپ کے افسانے زندگی کے حقائق سے نہ صرف آشنائی دلاتے ہیں بلکہ قاری کی سوچ کو متحرک کر کے مضطربانہ کیفیات سے بھی دو چار کر دیتے ہیں اور قاری سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ سب کچھ اس کے اپنے ساتھ پیش آرہا ہے یا پھر اس کے ارد گرد کے ماحول میں وقوع پذیر ہو رہا ہے۔۔ان کے واقعات حقیقی اور فطری معلوم ہوتے ہیں۔انھوں نے معاشرتی حقائق کے ساتھ ساتھ افرادِ معاشرہ کے نفسیاتی مسائل کو بھی موضوعات میں جگہ دی۔ الختصر آپ نے اپنے افسانوں میں سماجی زندگی کو ہر زاویے سے بیان کرنے کی بھر پور کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی ہوئے۔

حوالہ جات

۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو افسانے میں دیہات کی پیش کش (الہ آباد: اُردو رائٹرز گلڈ، ۱۹۸۲ء)، ص۳۷۔

۲۔ ایضاً، ص۳۶۔

۳۔ ایضاً، ص۱۶۔

۴۔ ایضاً، ص۱۶۔

۵۔ ایضاً، ص۲۱۔

۶۔ ایضاً، ص۱۶۔

۷۔ عبدالرحمٰن، رانا، (مرتب) افسانے صادق حسین (لاہور: بک ہوم پبلشرز، ۲۰۱۲ء)، ص۱۲۔

۸۔ ایضاً، ص۲۰۔

۹۔ ایضاً، ص۲۶۔

۱۰۔ ایضاً، ص۲۹۔

۱۱۔ ایضاً، ص۲۳۔

۱۲۔ ایضاً، ص۲۲۔

۱۳۔ ایضاً، ص۲۹۔

۱۴۔ اردو افسانے میں دیہات کی پیش کش، ص۳۶۔

۱۵۔ افسانے صادق حسین، ص۳۶۔

۱۶۔ ایضاً، ص۳۰۔

۱۷۔ ایضاً، ص۴۲۔

۱۸۔ ایضاً، ص۴۲۔

۱۹۔ ایضاً، ص۳۱

۲۰۔ ایضاً، ص۵۴۔

۲۱۔ ایضاً، ص۵۴۔

۲۲۔ ایضاً،ص۵۴۔

۲۳۔ ایضاً،ص۴۳۔

۲۴۔ ایضاً،ص۵۷۔

۲۵۔ ایضاً،ص۵۹۔

۲۶۔ ایضاً،ص۵۹۔

۲۷۔ ایضاً،ص۶۰۔

۲۸۔ ایضاً،ص۵۸۔

۲۹۔ ایضاً،ص۵۸۔

۳۰۔ ایضاً،ص۶۲۔

۳۱۔ ایضاً،ص۶۹۔

۳۲۔ ایضاً،ص۶۴۔

۳۳۔ ایضاً،ص۶۹۔

۳۴۔ ایضاً،ص۷۱۔

۳۵۔ روبینہ کنول،صادق حسین کی افسانہ نگاری (ملتان: بہاءالدین زکریا یونیورسٹی،۱۹۸۷ء) ، ص۱۰۹۔

۳۶۔ افسانے صادق حسین،ص۸۱۔

۳۷۔ ایضاً،ص۷۵۔

۳۸۔ ایضاً،ص۸۳۔

۳۹۔ ایضاً،ص۹۱۔

۴۰۔ ایضاً،ص۹۱۔

۴۱۔ ایضاً،ص۹۱۔

۴۲۔ صادق حسین کی افسانہ نگاری،ص۱۱۱۔

۴۳۔ ایضاً،ص۹۸۔

۴۴۔ افسانے صادق حسین،ص۹۹

۴۵۔ ایضاً، ص ۹۶۔

۴۶۔ ایضاً، ص ۱۰۳۔

۴۷۔ ایضاً، ص ۱۰۴۔

۴۸۔ ایضاً، ص115۔

۴۹۔ ایضا، ص ۱۰۷۔

۵۰۔ ایضاً، ص ۱۱۱۔

۵۱۔ ایضاً، ص ۱۱۳۔

۵۲۔ ایضاً، ص ۱۲۲۔

۵۳۔ ایضاً، ص ۱۳۰۔

۵۴۔ ایضاً، ص ۱۲۵۔

۵۵۔ ایضاً، ص ۱۲۶۔

۵۶۔ ایضاً، ص ۱۳۱۔

۵۷۔ ایضاً، ص ۱۳۳۔

۵۸۔ ایضاً، ص ۱۳۵۔

۵۹۔ ایضاً، ص ۱۳۶۔

۶۰۔ ایضاً، ص ۱۴۱۔

۶۱۔ ایضاً، ص ۱۳۶۔

۶۲۔ ایضاً، ص ۲۱۳۔

۶۳۔ انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ (فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۰ء)، ص ۴۶۶۔

۶۴۔ افسانے صادق حسین، ص ۱۴۲۔

۶۵۔ ایضاً، ص ۱۴۴۔

۶۶۔ ایضاً، ص ۱۴۹۔

۶۷۔ ایضاً، ص ۱۴۹۔

۶۸۔ افسانے صادق حسین، ص۲۱۳۔

۶۹۔ سید محمد عقیل، سماجی تنقید اور تنقیدی عمل (الہ آباد: تہذیب نو پبلشرز، ۱۹۸۰ء)، ص۶۹۔

۷۰۔ اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، ص۴۶۵۔

۷۱۔ افسانے صادق حسین، ص۱۵۱۔

۷۲۔ ایضا، ص۱۵۲۔

۷۳۔ ایضاً، ص۱۵۲۔

۷۴۔ ایضاً، ص۱۵۲۔

۷۵۔ ایضاً، ص۱۵۳۔

۷۶۔ اُردو افسانے میں دیہات کی پیش کش، ص۱۳۵۔

۷۷۔ افسانے صادق حسین، ص۱۵۴۔

۷۸۔ ایضاً، ص۱۵۹۔

۷۹۔ ایضاً، ص۱۵۸۔

۸۰۔ ایضاً،۱۵۸۔

۸۱۔ ایضاً، ص۱۵۹۔

۸۲۔ ایضاً، ص۱۶۰۔

۸۳۔ ایضاً، ص۱۵۹۔

۸۴۔ ایضاً، ص۱۶۱۔

۸۵۔ ایضاً، ص۱۶۵۔

۸۶۔ ایضاً، ص۱۶۵۔

۸۷۔ ایضاً، ص۱۶۴۔

۸۸۔ ایضاً، ص۱۶۵۔

۸۹۔ ایضاً، ص۱۶۶۔

۹۰۔ ایضاً، ص۱۷۲۔

۹۱۔ ایضاً، ص۱۷۴۔

۹۲۔ ایضاً، ص۱۷۵۔

۹۳۔ ایضاً، ص۱۷۵۔

۹۴۔ ایضاً، ص۱۸۵۔

۹۵۔ ایضاً، ص۱۷۷۔

۹۶۔ ایضاً، ص۱۷۷۔

۹۷۔ ایضاً، ص۱۹۰۔

۹۸۔ ایضاً، ص۱۹۰۔

۹۹۔ ایضاً، ص۱۹۱۔

۱۰۰۔ ایضاً، ص۱۹۳۔

۱۰۱۔ ایضاً، ص۱۹۶۔

۱۰۲۔ ایضاً، ص۲۰۰۔

۱۰۳۔ ایضاً، ص۲۰۱۔

۱۰۴۔ ایضاً، ص۱۹۷۔

۱۰۵۔ ایضاً، ص۲۶۴۔

۱۰۶۔ ایضاً، ص۲۰۹۔

۱۰۷۔ ایضاً، ص۲۱۰۔

۱۰۸۔ صادق حسین کی افسانہ نگاری، ص۱۱۶۔

۱۰۹۔ افسانے صادق حسین، ص۲۱۱

۱۱۰۔ ایضاً، ص۲۱۲۔

۱۱۱۔ ایضاً، ص۲۱۲۔

۱۱۲۔ ایضاً، ص۲۲۳۔

۱۱۳۔ ایضاً، ص۲۲۴۔

۱۱۴۔ ایضاً، ص۲۳۶۔

۱۱۵۔ ایضاً، ص۲۴۲۔

۱۱۶۔ ایضاً، ص ۲۴۴۔

۱۱۷۔ ایضاً، ص ۲۶۲

۱۱۸۔ صادق حسین کی افسانہ نگاری، ص ۱۱۲۔

۱۱۹۔ افسانے صادق حسین، ص ۲۶۷

۱۲۰۔ ایضاً، ص ۲۷۰۔

۱۲۱۔ ایضاً، ص ۲۷۳۔

۱۲۲۔ ایضاً، ص ۲۷۳۔

۱۲۳۔ ایضاً، ص ۲۷۸۔

۱۲۴۔ عمر فاروق، معاشرے کی خصوصیات (مترجم) ۲۰۱۱ء

۱۲۵۔ افسانے صادق حسین، ص ۲۹۲۔

۱۲۶۔ ایضاً، ص ۲۹۲۔

۱۲۷۔ ایضاً، ص ۲۹۳۔

۱۲۸۔ صادق حسین کی افسانہ نگاری، ص ۱۴۵۔

۱۲۹۔ افسانے صادق حسین، ص ۳۱۲۔

۱۳۰۔ ایضاً، ص ۳۲۷۔

۱۳۱۔ ایضاً، ص ۳۲۷۔

۱۳۲۔ ایضاً، ص ۳۴۵۔

۱۳۳۔ ایضاً، ص ۳۶۲۔

۱۳۴۔ محمد اشرف، ترقی پسند تحریک اور اردو فکشن (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۴ء) ص ۳۲۔

۱۳۵۔ افسانے صادق حسین، ص ۳۶۵۔

۱۳۶۔ ایضاً، ص ۳۶۴۔

۱۳۷۔ ایضاً، ص ۳۶۸۔

۱۳۸۔ ایضاً، ص ۳۸۴۔

۱۳۹۔ ایضاً، ص ۳۸۰۔

۱۴۰۔ ایضاً، ص ۳۸۸۔

۱۴۱۔ ایضاً ص، ۳۸۶۔

۱۴۲۔ ایضاً، ص ۳۸۶۔

۱۴۳۔ ایضاً، ص ۳۸۹۔

۱۴۴۔ محمد مصلح الدین، سماجیات (حیدر آباد: سنٹرل پبلشرز، ۱۹۵۳ء) ص ۱۵۳۔

۱۴۵۔ افسانے صادق حسین، ص ۴۱۲

۱۴۶۔ ایضاً، ص ۴۱۳۔

۱۴۷۔ ایضاً، ص ۴۰۸۔

۱۴۸۔ ایضاً، ص ۴۰۷۔

۱۴۹۔ ایضاً، ص ۴۱۸۔

۱۵۰۔ ایضاً، ص ۴۱۸۔

۱۵۱۔ ایضاً، ص ۴۱۶۔

۱۵۲۔ ایضاً، ص ۴۳۱۔

۱۵۳۔ ایضاً، ص ۴۳۱۔

۱۵۴۔ ایضاً، ص ۴۲۸۔

۱۵۵۔ ایضاً، ص ۴۳۵۔

۱۵۶۔ ایضاً، ص ۴۳۵۔

۱۵۷۔ ایضاً، ص ۴۳۵۔

۱۵۸۔ ایضاً، ص ۴۶۱۔

۱۵۹۔ ایضاً، ص ۴۵۸۔

۱۶۰۔ ایضاً، ص ۴۶۴۔

۱۶۱۔ ایضاً، ص ۴۶۶۔

۱۶۲۔ ایضاً، ص ۴۶۶۔

۱۶۳۔ ایضاً،ص۴۶۷۔

۱۶۴۔ ایضاً،ص۴۷۴۔

۱۶۵۔ صادق حسین کی افسانہ نگاری،ص۳۶۔

۱۶۶۔ افسانے صادق حسین،ص۴۹۱۔

۱۶۷۔ ایضاً،ص۴۹۴۔

۱۶۸۔ ایضاً،ص۴۹۶۔

۱۶۹۔ روبینہ شہناز،جدید ادب میں پاکستانیت کا شعور،مشمولہ تخلیقی ادب(اسلام آباد: نمل یونیورسٹی،۲۰۱۱ء)،ص۱۰۳۔

۱۷۰۔ افسانے صادق حسین،ص۵۰۶۔

۱۷۱۔ ایضاً،ص۵۰۱۔

۱۷۲۔ ایضاً،ص۵۰۴۔

۱۷۳۔ صادق حسین کی افسانہ نگاری، ص۸۔

۱۷۴۔ صادق حسین کے افسانے،ص۵۰۷۔

۱۷۵۔ ایضاً،ص۵۱۰۔

۱۷۶۔ ایضاً،ص۵۱۲۔

۱۷۷۔ ایضاً،ص۵۰۸۔

۱۷۸۔ رانا،عبدالرحمن۔لہو کے چراغ (لاہور: بک ہوم پبلشرز،۲۰۱۴ء)ص۲۰۷۔

۱۷۹۔ افسانے صادق حسین،ص۵۱۷۔

۱۸۰۔ ایضاً،ص۵۲۱۔

۱۸۱۔ ایضاً،ص۵۲۵۔

۱۸۲۔ ایضاً،ص۵۲۹۔

۱۸۳۔ ایضاً،ص۵۳۲۔

باب سوم:

صادق حسین کے افسانوں میں سماجی شعور

(تجزیاتی مطالعہ) بحوالہ کردار

کسی انسان کی شکل و صورت ، چال ڈھال ، خصائل و عادات ، جذبات و احسات ، اعمال وافعال اور تاثرات کی عکاسی کا نام کردار نگاری ہے۔ گویا کسی بھی شخصیت کے ظاہر و باطن کو افسانے کی حدود میں رہ کر یوں اجاگر کرنا کہ اُس کی پوری شخصیت نمایاں طور پر سامنے آجائے اعلیٰ کردار نگاری کی دلیل ہے۔

کردار نگاری کے لیے مصنف کو چاہیے کہ وہ بصارت کے ساتھ بصیرت بھی رکھتا ہو اس کی قوت مشاہدہ اور وسعتِ نظری بھی انتہائی ہو وہ باریک بین بھی ہو تا کہ معاملے کی تہہ تک اُسے پہنچنے میں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس کے علاوہ مصنف یا ادیب اپنی مضبوط قوتِ مشاہدہ کی بنا پر تجربات ، واقعات اور سانحات کے صحیح نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو اور تحلیل نفسی کے اصولوں کو اپناتے ہوئے اپنے کرداروں کے باطن کو جھانک کر اُن کے احساسات کی ترجمانی کرنے اہلیت و صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ یعنی زبردست قوتِ مشاہدہ وسیع النظری کے ساتھ ساتھ انسانی نفسیات سے آگاہی ایک مصنف یا افسانہ نگار کے شخصی اوصاف ہونے چاہیں تب جا کر وہ ایک کامیاب ادیب کہلا سکتا ہے۔ مندرجہ بالا تمام خصوصیات صادق حسین کی شخصیت میں موجود تھیں۔ انھوں نے اپنی قوت مشاہدہ اور باطنی بصیرت و آگاہی کی بنا پر اپنے افسانوی کرداروں کو اس طرح تخلیق کیا کہ وہ ہمیں ہمارے معاشرے کے چلتے پھرتے زندہ کردار نظر آتے ہیں۔

صادق حسن نے اپنے کرداروں کے ذریعے سماجی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کو نہ صرف اجاگر کیا ہے بلکہ انہیں انفرادیت بخشنے میں بھی کامیاب رہے ہیں۔

کامیاب کردار نگاری کے حوالے سے ڈاکٹر اعبدالسلام صدیقی اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ :

"کامیاب کردار نگاری صرف خدو خال کی پیشکش نہیں بلکہ اساسی جذباتی تخلیقی اور فکری زندگی کی رونمائی ہے۔ کرداروں کی نفسی زندگی کو ابھارنا اور نفسی زندگی کی ترجمانی ایک پیچیدہ عمل ہے۔ یہ عمل اور ردِ عمل اثر و تاثیر

جبلتوں اور شعور کا پیچیدہ مرکب ہے۔اس لیے زندہ کردار نگاری کے لیے تجزیہ نفس کی ضرورت ہے۔اور نفس انسانی کی نیرنگی سے واقف ناول نگار ہی عمدہ کردار نگاری کر سکتے ہیں۔"[1]

گویا کامیاب کردار نگاری کے لیے شخصی خال و خد کو پیش کر دینا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ اُن کی نفسیات سے آگاہی اور اُن کے باطن سے آشنائی ہی کامیاب کردار کی تخلیق میں مدد کرتی ہے۔ صادق حسین اپنے کرداروں کی نفسیات کو نہ صرف سمجھتے تھے بلکہ ان کی روح میں اتر کران کی خواہشات واحساسات اور ذہنی کیفیات کا نہ صرف مطالعہ کیا بلکہ انہیں خود پر طاری بھی کیا اور پھر تخلیق کی صورت میں قارئین کے سامنے لائے۔اور یہی بات ان کے کامیاب افسانہ نگار ہونے کی دلیل پیش کرنے کے لیے کافی ہے۔وہ کردار کی ذہنی و قلبی واردات کے ذریعے خود کو کامل مصنف کہلوانے میں اچھے خاصے کامیاب رہے ہیں۔اس باب میں ان کے افسانوی کرداروں کا تجزیہ پیش کیا جارہا ہے جو اُن کے سماجی شعور کو سمجھنے میں مدد کرے گا۔

صادق حسین کے افسانوی مجموعے" پھولوں کے محل " میں سماجی شعور بحوالہ کردار

صادق حسین کے افسانوی مجموعے"پھولوں کے محل"میں جہاں موضوعات کا تنوع ہے تو دوسری طرف ان کے کردار بھی مختلف نفسیات اور طبقہ ہائے فکر کی نمائندگی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے بیشتر کردار دیہاتی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسکی وجہ شاید صادق حسین کا مختلف ملازمتوں کے سلسلے میں دیہات میں وقت گزارنا ہے۔ مختلف ملازمتوں کے سلسلے میں اُن کا بیشتر وقت دیہات اور قصبوں میں گزرا لہذا انھیں فطرت کی رنگینیوں کے ساتھ ساتھ سادہ لوح دیہاتی سماج کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ جس سے بھرپور فائدہ اٹھا کر انھوں نے ایسے طبقے اور مزدوروں کے حالات زندگی اور خواہشات وضروریات کے ساتھ ساتھ اُن کی نفسیات اور سماجی مسائل کو قلمبند کیا اور ایسے دیہاتی، غریب اور مفلوک الحال طبقات کی نمائندگی کر کے عوام کے سماجی شعور کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔

صادق حسین کے افسانوی کرداروں کا ذکر کرتے ہوئے روبینہ کنول رقمطراز ہیں۔ ''صادق حسین کے بیشتر کردار سماج کے بلکہ بہت نچلے درجے کے لوگ ہیں۔ جو نام اور پیشے کے اعتبار سے مستری پتھیرے، پہلوان، مزارع، فقیر، قصائی، نائی، کلرک قسم کے ہیں۔"

افسانہ "پونہچیاں" میں خداداد ایسا مجبور اور بے بس کردار جو اپنی آرزو کی تکمیل کے لیے اور پھر اُسے حقیقت کے روپ میں دھارنے کے لیے ساری زندگی گزار دیتا ہے۔ مزدور طبقہ کی معصوم خواہشات کا ترجمان ہے۔ جو اپنی تمنا لاحاصل کی کو حاصل کا روپ دینے کے لیے ساری عمر محنت مزدوری کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود اتنا روپیہ پیسہ نہیں کما سکتے کہ وہ اپنی خواہشات کو پورا کر کے دلی مسرت حاصل کر سکیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اپنی خواہشات کو انسان حقیقت کا روپ دینے میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن سماجی بندھن اور رشتوں کی زنجیریں ان عمر بھر کی ریاضتوں کی راہ میں بڑی رکاوٹ بن کر ان آرزووں کی تکمیل میں خلل ڈالتی ہیں اور یوں ان کی خواہشات تمنائے لاحاصل کا روپ دھار لیتی ہے۔

مستری خداداد بھی ایسا ہی بے بس کردار ہے جو اپنی شریک سفر کے لیے پونہچیاں خریدنے کی غرض سے اپنی ساری زندگی بتا دیتا ہے اور آخر کار پونہچیاں خریدنے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے لیکن عین اُس وقت اس کی بیٹی سکینہ انھیں اپنا حق سمجھ کر اپنے پاس رکھ لیتی ہے اور خداداد کا ارمان اس کے سینے میں ہی دفن ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور یوں وہ بیٹی کی محبت کے آگے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

"جب خداداد خاں نے اپنے گھر کے آنگن میں قدم رکھا تو پلنگڑی پر بیٹھی ہوئی سکینہ نے دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کر دیے۔ اُس کی بھری بھری کلائیوں کو پوہنچیوں نے نکھار دیا تھا۔ اُس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔"٢

بحیثیت مجموعی اگر دیکھا جائے تو خداداد کا کردار پر عزم کردار ہے جو افسانے کے ابتدائی حصے میں اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے ارادہ باندھتا ہے اور مستقل مزاجی کے ساتھ اس پر قائم بھی رہتا ہے۔" اسی ارادے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے خداداد خان ایک مشین بن گیا۔"٣ یہاں تک کہ اسے دور دراز مختلف علاقوں میں جا کر مزدوری کرنا پڑی۔ وقت اور حالات کی تبدیلیاں اسکی آرزو کی تکمیل کی راہ میں مزاحم بھی ہوتی ہیں لیکن اُس کے باجود وہ اسے بھلا نہیں پاتا اور بالا آخر ٹھیکیدار پانچ سو کی وہ رقم جو خداداد خان کی ہر روز کی کمائی سے ٹھیکیدار یہ کہہ کر کاٹ لیا کرتا تھا کہ یہ تمھاری امانت ہو گی جو بعد میں لوٹا دی جائے گی۔ اسکی جھولی میں یہ کہہ کر ڈالتا ہے کہ یہ لو تمھاری امانت تو اس پر مستری خداداد خان بہت زیادہ خوشی کا اظہار کرتا ہے۔"خداداد خان کا دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ فرید اں کی فرمائش پرانی ہو چکی تھی۔ مگر اُس کا عزم ابھی تک جوان تھا۔"٤ مذکورہ کردار ہماری دیہی اور غریب معاشرت سے اٹھا ہے جو زندگی کی سچائیوں کو پیش کرتا ہے اور دیہات میں رہنے والے معصوم لوگوں کی خواہشات اور نفسیات کا ترجمان بھی ہے۔

"پھولوں کے محل" میں پتھیرا کا کردار غیرت مند لیکن غربت کے ہاتھوں پِسا ہوا مجبور کردار ہے۔ جو اپنی چھوٹی سی خوشی اور بیگم جان کی خواہش کی تکمیل کے لیے اتنی محنت کرتا ہے کہ بالا آخر زندگی سے ہار جاتا ہے۔ پتھیرا کا کردار ایسے استحصالی معاشرے کا کردار ہے جہاں انسان کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ بلکہ اس کے برعکس ذاتی مفادات کو ترجیح دے کر مفلوک الحال اور بے بس، مزدور طبقے سے کولہو کے بیل کی طرح کام لیا جاتا ہے۔ جہاں بقول ڈاکٹر انوار احمد کے" ڈھول کی تھاپ پر بھوک رقص کرتی دکھائی دیتی ہے۔"٥

پتھیرا بنیادی طور پر مضبوط اور پر عزم کردار کے طور پر سامنے آتا ہے جو غیرت مند ہونے کے ساتھ ساتھ من کا سچا اور دھن کا پکا ہے وہ اپنی اور اپنی بیگم کی خوشیوں کو اپنی موت کے عوض خریدنے کی صلاحیت اور ہمت رکھتا ہے۔ اس کا نام پتھیرا اس وجہ سے نہیں پڑا کہ وہ اینٹیں پاتھتا ہے بلکہ اس وجہ سے اُسے اس نام سے پکارا جاتا ہے کہ اُس کے بازوؤں میں بے پناہ قوت تھی وہ مستحکم مزاج اور مضبوط قوتِ ارادی کا مالک تھا۔

"اس کا بدن چلچلاتی دھوپ میں تانبا بن گیا تھا۔ اور اُس کے تانبے کے مضبوط ہاتھ حیرت انگیز تیزی سے مٹی کو پانی میں سوند سکتے تھے۔ اسکی انگلیاں کمال پھرتی سے گندھی ہوئی مٹی کو سانچے میں ڈال کر کچی اینٹوں کی تخلیق کر سکتی تھیں۔"٦

پتھیرا جتنا قوی جسم اور مضبوط قوتِ ارادی کا مالک تھا اتنا ہی دل کا نرم اور حساس طبعیت کا مالک تھا۔ وقت اور حالات کی ستم ظریفیاں اُسے کبھی شکستہ حال نہ کر سکیں۔ البتہ اولاد کی تمنا نے اُسے اندرونی طور پر بہت کمزور کر دیا تھا

جسکی وجہ سے اُسکی بیگم بھی اکثر اداس نظر آتی تھی۔ لیکن جب اولاد کی تمنا پوری ہوئی تو وہ پہلے کی طرح جوشیلا اور چاق و چوبند نظر آنے لگا اور بیگم جان کے احساسات اور خوشیوں کی بھی قدر کرنے لگا۔ احساسات کا پاس تو شاید اُسے پہلے بھی تھا لیکن احساس محرومی نے اُسے خاموش کر دیا تھا۔ بیٹے کی پیدائش پر وہ نہال ہو جاتا ہے۔ اور اپنی خوشی کو بھرپور طریقے سے مناتا ہے کہ پورا گاؤں عش عش کر اٹھتا ہے۔

"دوسرے دن بھانڈ آئے تو منہ مانگا انعام پا کر نہال ہو گئے، بہشتی نیم کے پتوں کا سہرا سر ول سے باندھ کر ہٹا تو پتھیرے نے دو روپے اسکی مٹھی میں تھما دیے دائی کو چھینٹ کو جوڑا اور پانچ روپے دے کر رخصت کیا گیا۔ بڑی بوڑھیوں نے منہ میٹھا کیا اور جھولیاں بھر بھر کے دعائیں دیں۔"۷

جس طرح اُس نے اپنے بیٹے کی پیدائش پر خوشی کا اظہار کیا تھا اسی طرح اب بیٹے کے ختنے کروانے کے لیے بھی وہ خاص اہتمام کرنے کا خواہاں تھا۔ لیکن قسمت کی ستم ظریفی کہ اخراجات کے لیے اُس کے پاس نہ کوئی اور ذریعہ اور وسیلہ تھا اور نہ ہی روپیہ پیسہ۔ وہ اپنی اس خوشی کو اپنی بساط اور حیثیت سے بڑھ کر منانا چاہتا تھا یہی وجہ ہے کہ وہ ٹھیکیدار کے لیے ایک دن میں زیادہ سے زیادہ اینٹیں بنا کر انعام کا مستحق قرار پاتا ہے لیکن اس مقابلے کو جیتنے کے لیے اسے اپنی جان کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ "بیگم جان کو یوں محسوس ہوا جیسے زمین پھٹ گئی ہو۔ اور وہ اس میں دھنسی جا رہی ہو۔" اینٹیں پاتھتے پاتھتے پتھیرا اپنی زندگی ہار جاتا ہے۔ " بیگم جان کی ایک چیخ سنائی دی اور وہ پتھیرے کے ٹھنڈے جسم سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگی۔"۸

مجموعی طور پر پتھیرا کا کردار مستحکم، مضبوط پر عزم اور جوشیلا کردار ہے۔ غربت اور استحصال زدہ معاشرے کا بانکا کردار ہے جو بھٹہ مزدور کی نمائندگی کرتا ہے۔ اور خواہشات اور تمناؤں کے ہاتھوں بک جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اپنے عہد کا ترجمان بھی۔ کیونکہ جس عہد میں یہ افسانہ لکھا گیا اس عہد کے سماج کی مکمل تصویر افسانے میں کر دی گئی ہے۔

پتھیرا کا کردار سماج کا ناقابل فراموش اور جاندار کردار ہے اور صادق حسین کی کردار نگاری کا عمدہ نمونہ اور شاہکار کردار ہے۔

افسانہ "جب قوس قزح کی آنکھ کھلی" میں رخسانہ کا کردار مرکزی کردار ہے۔ رخسانہ پڑھی لکھی تعلیم یافتہ سمجھدار عورت ہے جو پیشے کے اعتبار سے پروفیسر ہے۔ رخسانہ کا کردار ایک ایسی عورت کا کردار ہے جو محبت کے لطیف جذبات سے بڑی اچھی طرح سے آشنا ہے اور نہ مٹنے والی محبت کی دعویدار ہے۔

رخسانہ سماجی طور پر ایک مجبور کردار کی نمائندگی بھی کرتی ہے جو اپنی روزمرہ پیشہ ورانہ زندگی سے اکتا چکی ہے اور احساس تنہائی اور وقت اور حالات کے ہاتھوں مجبور اور بے بس دکھائی دیتی ہے۔ اور وہ اپنے احساسات کو اپنی

پیاری دوست کے خط میں بیان کرتی ہے کہ وہ زندگی سے کتنی اکتا چکی ہے۔ "کاش ! میں تمھیں بتا سکتی کہ آج میرے دل پر کیا گزر رہی ہے۔"۹ وہ چاہتی ہے کہ کوئی اس کے ساتھ ہو جسے روبرو ہو کر وہ اپنے محسوسات سے آگاہ کر سکے کیونکہ خط میں بھی تمام احساسات کو قلمبند نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس کی یہ تمنا بھی پوری نہیں ہو سکتی۔

رخسانہ ایک حقیقت پسند اور منصفانہ کردار ہے جو انسانی جذبات کا احترام کرنے والی ہمدرد خاتون ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی محبت کی قربانی صرف اس لیے دیتی ہے کہ گل نواز کی ہنستی بستی ازدواجی زندگی میں تلاطم نہ آئے۔ وہ اپنی دوست کو بتاتی ہے کہ وہ گل نواز خان (جس سے وہ محبت کرتی ہے) اب بھی اسے اپنانے کے لیے تیار ہو سکتا ہے۔ مگر وہ اس کے گھر میں قیام کے دوران وہ یہ بات جان جاتی ہے کہ گل نواز کی ازدواجی زندگی بہت سکون سے بسر ہو رہی ہے۔ لہٰذا وہ اسکی پر سکون زندگی کو برباد کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی اور یوں وہ اپنی محبت کو قربان کر دینے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ " معصومیت اور زندگی سے بھر پور گھر میں ، اگر ایک ہلکی سی لرزش بھی آجائے تو یہ کتنا بڑ ظلم ہو گا۔"۱۰ اس لحاظ سے رخسانہ کا کردار مثالی اور باعمل کردار ہے۔ جسکی حساسیت اور ہمدردانہ جذبات اور وسیع النظری اسے بہت ساری زندگیوں سے کھیلنے سے روک دیتی ہے۔ اور وقت اور حالات کے ساتھ احساس تنہائی کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لیے خود کو سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ "تو میری چندرا! کل رات کو یہاں سے چل پڑوں گی اور ڈھاکے کے پہنچ کر اتوار کا انتظار کروں گی۔"۱۱

صادق حسین کے بیشتر کردار زندگی کے تمام دکھوں کے ساتھ ہر قدم پر مصالحت کرنے کے عادی ہیں اور زندگی کے دھارے کے ساتھ ساتھ چلنے کو ہی اپنے لیے راہ نجات جانتے ہیں۔ رخسانہ کا کردار بھی انھی مصالحت پسند اور حقائق شناس کرداروں میں شمار ہوتا ہے۔

"مولا پہلوان" کا کردار صوبہ پنجاب سے تعلق رکھنے والا ایک طاقتور جوشیلا، بے باک، نڈر، مردانہ وجاہت رکھنے ولا بہادر کردار ہے جو اپنی انا اور جیت کی خاطر محبت کو اپنی راہ کا کانٹا نہیں بننے دیتا۔ اس کا مقصد صرف فتح کا حصول ہے۔ اور اس مقصد کے حصول کے لیے وہ محبت جیسے لطیف جذبات کو بھی پس پشت ڈال دیتا ہے۔ پر عزم اور باہمت نوجوان جو اپنے مقصد پر ڈٹے رہنے کو ترجیح دیتا ہے۔ اگرچہ ریشماں کی محبت اسکی راہ میں حائل ہوتی ہے اور وہ دل کے ہاتھوں مجبور بھی ہو جاتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے سے جڑے افراد کی توقعات پر پورا اترنے کے لیے اپنی محبت کی قربانی دے دیتا ہے۔ وہ ریشماں کی یاد کو مٹانے کے لیے اور اپنے خاندانی وقار کو قائم و دائم رکھنے کے لیے اپنے استاد کی باتوں کو یاد کرتا ہے۔ استاد اسے کہا کرتا تھا کہ "عورت کا خیال پہلوانی کے کس بل توڑتا ہے۔"۱۲ یہ خیال آتے ہی مولا دل ہی دل میں بہت شرمندہ ہوتا ہے۔ " چنانچہ اس نے ریشماں کی یاد کو جنجھوڑ کر دل سے نکال دیا۔"۱۳

بنیادی طور پر مولا پہلوان کا کردار رومانوی کردار ہے جس کے دل میں ریشماں کی محبت گھر کر جاتی ہے اور وہ کُشتی کے داؤ پیچ میں سستی اور لاپرواہی برتنے لگتا ہے۔ اور ایسی ذہنی کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے کہ تمبا کو نوشی اور حقے کے کش لگانا شروع کر دیتا ہے۔ "ایک دن اطلاع ملی کہ مولا پہلوان نے امام دین درزی کی دکان پر حقے کے دو چار گہرے کش لگائے تھے اور اس کے بعد وہ کافی دیر تک کھانستا رہا تھا۔ "۱۴

"مولا پہلوان" رومان پسند اور حساس دل رکھنے والا شخص ہے۔ لیکن سماج کی زنجیروں میں جکڑا ہوا اور مجبور کردار جو مقصدیت کو کسی بھی طور پر فراموش نہیں ہونے دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اکھاڑے میں اترتے وقت ذہنی طور پر بہت زیادہ کشمکش کا شکار ہوتا ہے۔ کیونکہ اسکی محبت ریشماں اس کے حریف "رحیا" کی بہن ہوتی ہے جو اس سے کُشتی ہارنے کا وعدہ لیتی ہے۔ باطنی کشمکش کا شکار مولا بہت زیادہ پریشان ہوتا ہے کیونکہ ایک طرف اس کی محبت ریشماں کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگتے ہیں۔ دوسری طرف اس کے استاد اور خاندان والوں کی اس سے وابستہ امیدیں اسے عجیب دوغلی کیفیت میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ لیکن جب اس کے کان میں اس کے اپنے استاد کے تحسین و تشفی والے الفاظ پڑتے ہیں تو یکدم اس کی کھوئی ہوئی طاقت اُمڈ آتی ہے اور وہ اپنے حریف رحیا کو زبردست شکست سے دوچار کر دیتا ہے۔ "مولا ایک بھوکے شیر کی طرح رحیا کی طرف بڑھا۔ پھر بڑی پھرتی سے رحیا کو اپنے فولادی بازوؤں میں سمیٹ کر پٹک دیا۔ "۱۵ اُس کا مقصد کو فراموش نہ کرنے والا عمل ہی اُسے صادق حسین کے مثالی اور ان مٹ نقوش چھوڑنے والے باعمل کرداروں کی صف میں شامل کر دیتا ہے۔ مولا پہلوان کے کردار کو صادق حسین نے حساسیت کی انتہا پر تخلیق کیا ہے۔ جو خالص دیہاتی سماج کا آئینہ دار ہے اور اپنی مٹی، ماحول اور خاندانی وقار کے ساتھ ساتھ گاؤں برادری کی عزت کو اپنی داخلی و دلی کیفیات اور جذبات پر ترجیح دیتا ہے اس لحاظ سے یہ منفرد کردار ہے۔

صادق حسن کے افسانوی مجموعے "پھولوں کے محل" میں اسلم کا کردار غربت کی چکی میں پسا ہوا مجبور کردار ہے جو یکے بعد دیگرے دس بیٹیوں کی پیدائش کی وجہ سے مایوس اور افسردہ ہے اور معمولی سرکاری ملازم ہے۔ اور کرائے کے دو کمروں پر مشتمل ایک چھوٹے سے مکان میں رہائش پذیر ہے۔ سماجی سطح پر عدم تحفظ اور عدم اطمینان کا شکار ایسا کردار، جسے غربت، تنگدستی اور سفید پوشی اُسے دوسرے لوگوں کے ساتھ موازنہ کرنے پر اکساتی ہے۔

> "دفعتاً وہ محمود کا مکان دیکھ کر رُکا اور پھر کچھ سوچ کر آگے بڑھ گیا۔ محمود اس سے کم تنخواہ پاتا تھا مگر ٹھاٹ سے زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس کے ڈرائنگ روم کی کھڑکیوں اور دروازوں پر پھولدار کپڑے کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ اسکی بیوی نفیسہ عمدہ عمدہ ساڑھیاں اور اُن سے میچ کرتی ہوئی چولیاں پہنتی تھی۔ "۱۶

اسلم کی نفسیاتی اور ذہنی کیفیت ناقابل بیان ہے۔ گیارہویں بچے کی پیدائش اُسے اور زیادہ حساس بنا دیتی ہے۔ اُسے طرح طرح کے خیالات جنجھوڑنے لگتے ہیں۔ عجیب تذبذب اور کش مکش کی حالت میں وہ بڑی بیٹی کو پہاڑی

سے مار گرانے کی تدبیر کرتا ہے۔ تو کبھی نوزائدہ بچی کو پیدائش سے قبل سے اُسے موت کے گھاٹ اتارنے کا سوچتا ہے تاکہ ان تلخ حقائق سے اسے چھٹکارا مل سکے۔ "پھر اسے تیسرے خیال نے اکسایا، کیوں نہ رفعت کو سیر کے بہانے باہر لے جاوں اور اسے پہاڑ کی چوٹی سے دھکیل کر بوجھ کم کر لوں۔"کے مالی تنگدستی اور بیٹیوں کی پیدائش اسے نفسیاتی بنا دیتی ہیں۔ لیکن اگر دیکھا جائے تو مجموعی طور اپر اسلم کا کردار جاندار اور سنجیدہ کردار ہے جو مفلوک الحال اور عدم طمانیت کا شکار ہونے کے باوجود انسانیت کا الاؤ اپنے اندر روشن کیے ہوئے ہے۔ جسے فطرت ہر بار حقیقت کا تلخ جام پیش کرتی ہے۔ جسے پی کر وہ اندر ہی اندر روتا ہے لیکن باہر سے مسکرانے پر مجبور ہوتا ہے اس حوالے سے دیکھا جائے تو اسلم کا کردار مثبت کردار ہے جو وقت اور حالات کے مطابق خود کو ڈھال لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اور ابتداء میں جس گیارھویں بچے کی پیدائش پر وہ نالاں ہوتا ہے افسانے کے آخر میں اسی کی زندگی کے لیے دعا کرتا ہے۔

> "اسلم کا دل دھائیں دھائیں کرنے لگا۔ ایک لمحہ اور۔۔۔۔ اگر بچی کی آواز نہ آئی تو۔۔۔۔۔ اسلم نے محسوس کیا۔ جیسے اس کی حرکتِ قلب بند ہو جائے گی۔ اس کے بدن میں لہو کا ہر قطرہ طوفان بن کر صرف ایک نقطے کا طواف کرنے لگا۔"۱۸

صادق حسین انسانی نفسیات کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ انسانی عظمت کے بھی قائل ہیں۔ اُن کے نزدیک تمام انسان یکساں نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک ہر انساں خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیوں کا بھی مجموعہ ہے۔ کوئی بھی انسان مکمل طور پر خوبیوں کا مالک نہیں ہو سکتا اُن میں کوئی نہ کوئی خامی والا عنصر بھی موجود ہوگا۔ بالکل اُسی طرح کوئی بھی انسان مکمل طور پر خامیوں کا منبع بھی نہیں ہو سکتا اس کے اندر کوئی نہ کوئی اچھائی موجود ہو گی۔ بظاہر کوئی بھی انسان برا نہیں ہوتا وقت اور حالات اُسے ایسا بنانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ لیکن تمام تر برائیوں کے باوجود محبت جیسے لطیف جذبات کہیں نہ کہیں اُس کی ذات میں پنہاں ضرور ہوتے ہیں۔

" دادو "کا کردار بھی ایسا ہی کردار ہے جسے لوگ نہ صرف حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں بلکہ اس سے نفرت کا برملا اظہار بھی کرتے ہیں۔ ذیل میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

> "ڈھولک پر کھیتوں میں، کنویں پر، جب بات میں بات نکل کر دادو کے نام تک پہنچ جاتی تو نوجوان لڑکیاں ناک بھوں چڑھا لیتی۔ سگھڑ عورتوں میں دادو کا ذکر چھڑتا تو اُسے جھولیاں بھر بھر کر بد عائیں دیتیں۔ چوپال پر بڑے بوڑھوں کی گفتگو میں دادو کا نام آتا تو کان پکڑ کر استغفار پڑھتے۔"۱۹

الغرض جو بھی برائی تھی چاہے اُس میں دادو کا عمل دخل ہو یا نہ ہو اس کے نام سے منسوب کر دی جاتی تھی۔ کیونکہ وہ ایک بد معاش و بد قماش تھا۔ اور بدنام زمانہ کو معاشرے میں عزت اور پیار کی نگاہ سے دیکھنا جرم عظیم سمجھا جاتا ہے۔ دادو کا کردار بے شک ایک منفی کردار کی صورت میں سامنے آتا ہے لیکن تمام تر برائیوں کے باوجود اپنے گاؤں کی

ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کی عزت و توقیر کا خیال بھی رکھنا جانتا ہے۔ اور گاؤں کی عزت (مریم) کے لیے اپنی جان کی قربانی دے کر مثالی اور قابلِ احترام کردار کے طور پر لوگوں کے دلوں میں اپنا مقام بنالیتا ہے۔ دادو اپنی مٹی سے وفا کی عمدہ ترین مثال پیش کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے امر ہو جاتا ہے۔ اور اپنے گاؤں والوں کے لیے پسندیدگی کے تاثرات ہمیشہ کے لیے چھوڑ جاتا ہے۔

"دادو مریم کے گھر کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ راستے کی مٹی پر خون کی دھار تیزی سے بہہ رہی تھی۔۔۔۔ دادو کا کرتا لہو میں ڈوب کر سرخ ہو گیا تھا۔ مریم کا باپ صافہ دادو کے سینے پر رکھے خون کے فوارے کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔"۲۰

اس طرح دادو کا ٹھکرایا ہوا اور ناپسندیدہ کردار افسانے کے اختتام پر پر عزم ء باہمت اور مثبت کردار بن جاتا ہے۔

صادق حسین کے افسانے "خون اور پانی" میں امانت میاں کا کردار بھی مختلف صورتوں میں سامنے آتا ہے۔ بہر حال انسانی نفسیات کا ترجمان کردار ہے جسے احساس ندامت اندر ہی اندر ملامت کرتا ہے اور وہ اپنی کوتاہیوں پر نادم بھی ہوتا ہے۔ ہتھکڑیاں لگتے وقت جب اُسکا بڑا بیٹا یوسف پولیس والوں سے التجا کرتا ہے کہ میرے ابا جان بے گناہ ہیں انہیں چھوڑ دو تو امانت میں کے دل سے یہ آواز آتی ہے۔ ''میں بے گناہ نہیں ہوں''۲۱

بنیادی طور پر امانت میاں کا کردار متوسط طبقے کی نمائندگی کرتا ہے۔ جو اپنے بچوں کی پرورش اور بہتر مستقبل کی خاطر جھوٹ، چوری اور رشوت خوری جیسی خرافات کو اپنانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اس کا ضمیر اُسے ملامت کرتا رہتا ہے کہ "اس ظاہری رکھ رکھاؤ اور چمک دمک کے نیچے گہرا اندھیرا ہے اور یہ اندھیرا تھمنے یا رکنے والا نہیں۔"۲۲ لیکن اس کے باوجود اس بڑھتے ہوئے اندھیرے میں روشنی کا دیپ جلانے کی خاطر ہر طرح کے سرد و گرم سے گزر جاتا ہے۔ اس لحاظ سے امانت کا کردار منفی کردار کی صورت میں نظر آتا ہے "ملازمت کے دوران میں غرض منداُسکی مٹھی گرم رکھتے تھے۔ وہ جوڑ توڑ کر کے فائل اوپر بھجوا دیتا"۲۳ امانت میاں کا کردار کبھی منفی کردار کی صورت میں سامنے آتا ہے تو کبھی نفس امارہ اور نفس مطمئنہ کی جنگ میں پستا ہوا باطنی کش مکش میں مبتلا کردار کی صورت میں افسانے میں دکھایا گیا ہے۔ جو جیل کی سلاخوں میں بیٹھ کر اپنی پوری زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔

افسانے کے اختتام میں اپنوں کے رویوں اور بے حسی کی وجہ سے امانت میاں کا کردار منفی و ناپسندیدہ کردار ہونے کے باوجود قاری کی تمام تر ہمدردیاں اپنے لیے سمیٹنے میں کامیاب ہو کر مثالی اور جاندار کردار بن جاتا ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب امانت میاں کی بیٹی اپنے خاوند کے حوالے سے اپنے باپ کو بتاتی ہے

"وہ نہیں جانتے کہ آپ جیل میں تھے۔ انہیں بتایا گیا ہے کہ آپ اس دنیا میں نہیں ہیں:

نئی آبادی کے مکان نمبر سات سے باہر نکل کر امانت میاں نے محسوس کیا جیسے وہ تمام علاقہ اجاڑ ہے۔"۲۴

افسانے "خون اور پانی" میں ظفر کا کردار بھی توجہ طلب ہے جو معاشرتی سطح پر ناپسندیدہ شخص ہے۔ اور شراب، جوا، اور دیگر سماجی برائیوں میں مبتلا ہو کر بدنام زمانہ بن جاتا ہے۔ لیکن باقی بہن بھائیوں کی نسبت باپ کے لیے اس کے دل سے محبت ختم نہیں ہوتی۔ شبنم اور یوسف جہاں باپ کو قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں وہاں ظفر باپ کو خوش دلی سے قبول کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ "میرے ابا۔ استاد نے چیخ کر کہا اور پھر دوڑ کر امانت میاں سے لپٹ گیا۔"۲۵

صادق حسین نے ظفر کے کردار کے ذریعے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ معاشرے میں ایسے کردار موجود ہوتے ہیں جنہیں چند غلطیوں کی وجہ سے ظالم سماج برائی کی دلدل میں دھکیل دیتا ہے وہ حقیقی طور پر اتنے برے نہیں ہوتے جتنا سماج انہیں برا بنا دیتا ہے یا برا بننے پر مجبور کر دیتا ہے۔ جیسے افسانے میں ظفر شراب اور جوئے کی وجہ سے بدنام زمانہ تو ہو جاتا ہے لیکن انسانیت کے معیار سے نہیں گرتا۔ اسے رشتوں کی پہچان ہوتی ہے اور اس معاملے میں وہ افسانے کے باقی کرداروں کی طرح بے حسی کا مظاہرہ نہیں کرتا۔

"سورج مکھی" ایک معصوم کردار ہے جو عدم تحفظ کا شکار ہے اور پیار کی متلاشی ہے۔ سورج مکھی کے پھول کی مانند اُسے جہاں سورج کی روشنی اور حرارت محسوس ہوتی ہے وہ اپنا رخ بدل لیتا ہے بالکل اُسی طرح سورج مکھی جس کا حقیقی نام لالہ رخ ہے۔ سورج مکھی کے پھول کی طرح محبت کی تلاش اور تحفظ کی جستجو میں بہروپیوں سے ٹکرا جاتی ہے۔ سفاک زمانے سے تعلق رکھنے والے خود غرض مردوں سے یکے بعد دیگرے جب سورج مکھی کا پالا پڑتا ہے تو اس پر حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ تمام مرد خود غرض اور مطلبی ہوتے ہیں۔ اور اُن کے نزدیک عورت کی حیثیت ان کی ہوس کو پورا کرنے والے کھلونے سے کم نہیں۔

> "رفتہ رفتہ وہ مرد کو ریاضی کی مشق سمجھ کر ضرب تقسیم کرنے لگی۔ لیکن ایک ہجر کی شام اس کے دل کو آناً فاناً تسلیم کرنا پڑا کہ مرد ریاضی کی مشق نہیں۔ وہ تو سچا موتی ہے جس کی آب سے زندگی نمو پاتی ہے۔ وہ پہلی ہی ملاقات میں اپنے دل کی امانت سونپ سکتا ہے۔ وہ چند ہی لمحوں میں منگنی کی انگوٹھی پہنا سکتا ہے۔"۲۶

یکے بعد دیگرے تلخ تجربات نے سورج مکھی پر مرد کی نفسیات اور اصلیت واضح کر دی پہلی فرم کا مینیجر، دوسری فرم کا مینیجر اور آفتاب تینوں کے رویوں میں مماثلت ہوتی ہے جو محبت کے آڑ میں عورت کو اپنی ہوس کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ آفتاب جو اسکی محبت میں آہیں بھرتا ہے اور شاعری کرتا ہے جب وہ اسے ہوس کا نشانہ بنانے لگتا ہے۔ تو سورج مکھی کے دماغ میں مرد ذات کے حوالے سے جو تنفر بھرا الاؤ بھڑک رہا ہوتا ہے وہ اسے پوری

دنیا کے مردوں سے انتقام کے لیے اکسا تا رہتا ہے۔ اس الاو کو ٹھنڈا کرنے کی غرض سے اور ذہنی کش مکش سے چھٹکارا پانے کے لیے وہ آفتاب کا قتل کر دیتی ہے۔

"سورج مکھی دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی جیسے وہ میدان کارزار میں محاذ پر ڈٹ گئی ہو اُسکا سینہ تن گیا۔ اُس کے اندر سے آواز آئی میں لالہ رُخ ہوں۔ سورج مکھی مر گئی ہے۔ میں چابی دیا ہوا کھلونا نہیں ہوں۔" ۲۷

صادق حسین نے اپنے افسانوں کے ذریعے اپنے عہد کی سماجی پیچیدگیوں اور المیوں سے آگاہی دلائی ہے کہ یہ معاشرتی المیے اور مسائل ہر طرح کے طبقے اور سماج کا حصہ ہیں۔ ''سورج مکھی'' کے کردار کے ذریعے انھوں نے اعلیٰ طبقے کے سماجی اور نفسیاتی مسائل کو سامنے لاتے ہوئے ہم پر یہ واضح کیا ہے کہ عورت چاہے جس سماج سے تعلق رکھتی ہو اس کا تعلق چاہے اعلیٰ طبقے سے ہو، متوسط طبقے سے یا غریب طبقے سے اُسے مرد کے تحفظ کی ضرورت ہمیشہ ہوتی ہے۔ اور وہ تحفظ اور محبت صرف اُسکا حقیقی شریک سفر ہی دے سکتا ہے۔ باقی مردوں کے لیے عورت کی حیثیت ایک کھلونے سے کم نہیں۔ صادق حسین نے سورج مکھی کے کردار کے ذریعے یہ بھی واضح کیا ہے کہ بے جا آزادی انسان کو بے راہ روی پر ڈال دیتی ہے۔ عورت کو متعین کردہ حدود کے اندر ہی خود کو محفوظ رکھنا چاہیے۔ لیکن اعلیٰ خاندانوں اور طبقات میں عورت کو کھُلی آزادی میسر ہوتی ہے۔ جس کے نتائج بھیانک صورت میں سامنے آتے ہیں۔

مجموعی طور پر سورج مکھی کا کردار با ضمیر اور مضبوط کردار ہے جو اپنی خواہشات کا گلہ گھونٹ کر اپنی سرگرمیوں اور غلطیوں پر ندامت محسوس کرتی ہے اور انتقام کی آگ میں جھلس کر آفتاب کا قتل کر دیتی ہے۔" اس نے بغیر سوچے سمجھے سیب میں سے چاقو نکال کر دائیں ہاتھ کی گرفت میں لے لیا اور بجلی کی طرح کوند کر اس نے آبدار پھل آفتاب کے سینے میں ٹھونک دیا۔" ۲۸

صادق حسن نے سورج مکھی کے کردار کے ذریعے ہم پر واضح کیا ہے کہ اچھائی ہر حال میں برائی پر غلبہ پا لیتی ہے۔ وہ انسان کی باطنی کشمکش کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں اور ہنر کے ذریعے پیش کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔

افسانہ "دو چھٹانک چاول" کی کہانی اس کے مرکزی کردار "مانگو" کے گرد گھومتی ہے۔ افسانے کے ابتدائی حصے میں "مانگو" مضبوط اور خود دار کردار کی صورت میں دکھائی گئی ہے۔ جو بڑھاپے اور غربت کے باوجود اپنی خودداری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ عمر کے اس حصے میں جہاں انسان کو خود تحفظ کی ضرورت ہوتی ہے بوڑھی مانگو جوان بیٹی کی عزت کی رکھوالی کے لیے ڈھال بن جاتی ہے۔ لاغر ہونے کے باوجود وہ نئے دیوتا کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہتی ہے۔ جب نیا دیوتا اُسکی بیٹی راجو پر غلط نگاہ رکھتا ہے تو بوڑھی مانگو اُس کی نیت کو بھانپ جاتی ہے اور مردانہ وار مقابلہ کر کے اس کی درگت بناتی ہے۔ بوڑھی مانگو ہر وقت اس سے مقابلے کے لیے تیار ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب نیا دیوتا اپنی طاقت اور رتبے کے بل بوتے پر بوڑھی مانگو کو دھمکی دیتا ہے تو بوڑھی مانگو گرجتے ہو بولتی ہے۔" اور پھر تم دیکھو گے کہ میں

تمھارا کلیجہ نوچ نوچ کر چباڈالوں گی۔"۲۹ حالانکہ بھوک اور قحط سالی کے سبب بوڑھی مانگو اور اسکی بیٹی راجو کے پاس پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے کوئی سامان نہیں ہوتا اور نیادیوتا اس آگ کو بجھانے کا سودا "راجو" کی عزت کے بدلے کرنا چاہتا ہے۔ مگر بوڑھی مانگو ہار نہیں مانتی۔ "اس نے ہر بار چاندی کے کالے دل پر تھوک دیا۔ ہر بار بوڑھی مانگو کا سوٹا اس تیزی سے بلند ہوا کہ نئے دیوتا کو سر پیر رکھ کر بھاگنا پڑا۔"

غربت اور بے بسی کی عکاسی کرنے والا مانگو کا کردار تیسری دنیا کے کرداروں کی نمائندگی کرتا ہے۔ جہاں انسان کی بنیادی ضروریات کی عدم تکمیل انسان کو سسکنے اور بلکنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ افسانے کے ابتدائی حصے میں بیٹی کی عزت کے تحفظ کے حوالے سے بوڑھی مانگو میں جوانوں جیسی قوت عود آتی ہے۔ افسانہ پڑھ کر قاری کے دل میں بوڑھی اور نحیف و نزار مجبور مانگو پر ترحم کے جذبات ابھر آتے ہیں۔ اور قاری اسکی حالت پر نوحہ کناں ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے لیکن افسانے کے اختتامی حصے میں مانگو افسانے کی ابتدائی حصے کی مانگو کے بالکل برعکس دکھائی دیتی ہے۔ اور وہی مانگو جو افسانے کے آغاز میں یہ دعویٰ کرتی ہے کہ "میں بھوکی مر جاؤں گی لیکن عزت کو ہاتھ سے نہ جانے دوں گی۔"۳۰ وہی مانگو افسانے کے اختتامی حصے میں راجو کی عزت کے عوض لائے ہوئے "دو چھٹانک چاولوں" پر بھوکے عقاب کی طرح جھپٹ پڑتی ہے۔ ڈاکٹر انوار احمد مانگو کے کردار کے حوالے سے اپنی رائے کا اظہار کچھ اس انداز سے کرتے ہیں:

> "دو چھٹانک چاول کی مانگو یہ کہنے کے باوجود کہ قسم ہے اس دھرتی کی جسکی کوکھ سے رزق پیدا ہوتا ہے کہ میں بھوکی مر جاؤں گی مگر اپنی عزت کو ہاتھ سے نہیں جانے دونگی۔ اپنی بیٹی راجو کی طرف سے عزت کے عوض لائے ہوئے مٹھی بھر چاولوں پر بھوکے عقاب کی طرح جھپٹتی ہے اس وقت وہ پریم چند کی بوڑھی کاکی دکھائی دیتی ہے۔ جسکی محض ایک حس زندہ ہے یا پھر گھیسو اور مادھو کی ہم زاد جو انسانی اقدار کے حوالے سے مسخ ہو چکے ہیں۔"۳۱

مانگو کے کردار کے ذریعے صادق حسین نے بھوک اور افلاس جیسے عالمی معاشرتی المیے کو واضح کر کے اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ پیٹ کی آگ یعنی بھوک انسان کے تمام حواس مختل کر دیتی ہے۔ اور پیٹ پوجا کے لیے انسان بعض اوقات انسانی اقدار کو بھی فراموش کر دیتا ہے۔

"دو چھٹانک چاول" میں مرکزی کردار کے علاوہ ذیلی کردار "نیادیوتا" اور "اسٹیشن ماسٹر" کے کردار ظالم اور سفاک افراد کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ ستم گزیدہ اور حالات کے ستائے ہوئے انسانوں کی مجبوریوں کو نیادیوتا اور اسٹیشن ماسٹر جیسے لوگ اپنی ذاتی تسکین اور لذتوں کے حصول کے لیے خرید لیتے ہیں۔ اور انہیں غلط مقاصد کے لیے استعمال

کرتے ہیں۔ یہی لوگ طاقت کے بل بوتے پر غریبوں کا معاشی اور سماجی استحصال کرتے ہیں۔ جیسے "دو چھٹانک چاول "کا" نیادیوتا" مٹھی بھر چاولوں کے عوض بوڑھی مانگو کی مجبوری یعنی اسکی بیٹی کی عزت لوٹ لیتا ہے۔

بحیثیتِ مجموعی اگر دیکھا جائے تو صادق حسین نے تیسری دنیا کی نمائندگی کرنے والی مانگو کی دو متضاد کیفیات کو بیان کر کے انسانی نفسیات سے آگاہی کا ثبوت دیا ہے اور افسانے میں ایک مکمل تاثر برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں ۔لیکن یہ تاثر دل و دماغ میں چنگاریاں سی پیدا کر دیتا ہے۔ اور تاریخ کی تاریک ترین حقیقت پر غور کرنے کے لیے مجبور بھی کرتا ہے کہ کس طرح سماجی شکنجے میں ایک طبقے کو دبایا اور کچلا گیا کہ ان کی ساری شخصیت ہی ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی ۔یہاں تک کہ مانگو اور راجو جس عزت اور خودداری کی حفاظت کرنے کی دعویدار تھیں۔ بھوک نے ان کی اُس حس کو بھی شکست دے دی۔ مذکورہ کردار استحصال زدہ معاشرے کی ستم کاریوں اور مجبوریوں کے بہترین عکاس ہیں۔

صادق حسین کے افسانوی کردار ان کی داخلی بصیرت اور سماج سے متعلق آگاہی کی عمدہ مثال پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا سماجی شعور گہرا اور عمیق ہے انھوں نے دیہاتی سماج سے تعلق رکھنے والے مختلف کرداروں سے متعارف کروایا ہے۔ جہاں انھوں نے دیہاتی سماج سے تعلق رکھنے والے غریب، بے بس اور نچلے طبقے کے افراد کو کرداری صورت میں افسانوں میں جگہ دی وہاں وہ دیہاتی سماج کے متوسط اور باعزت طبقے کے افراد کی نمائندگی کرتے بھی نظر آتے ہیں۔

صادق حسین کے افسانے "خون کی پگڈنڈی" میں سجاول کا کردار متوسط طبقہ سے تعلق رکھنے والا جوشیلا اور انتقامی کردار ہے۔ جو خون کا بدلہ لینا جانتا ہے اور آنے والے وقت کا شدت اور بے تابی سے انتظار کر رہا ہوتا ہے کہ کب وہ اپنے دوسرے بھائی کے خون کا بدلہ نیازو کے کے خون سے ہولی کھیل کر لے اور اپنے سینے کی آگ ٹھنڈی کر سکے۔

سجاول کا کردار ایسے دیہاتی طبقے کی نمائندگی کرنے والا انتقامی کردار ہے جہاں خون کا بدلہ خون سے لینا روایت میں شامل ہے۔ اور وہ اپنے خاندان کے خون کا بدلہ فرض عین کی طرح لیتے ہیں اور باقی تمام فرائض پر اس فرض کو ترجیح دے کر اولین فرض کی صف میں شامل کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سجاول دنیاوی کاموں میں مگن رہنے کے باوجود بھائی کے انتقام کی یاد سے غافل نہیں ہوتا۔ "اس کا فرض اسے پکارنے لگا، انتقام خون کا بدلہ خون، اور جب اسے یہ خیال آتا تو باقی تمام خیالات پس پشت چلے جاتے اور پھر وہ اپنے جسم کی گرمی خود محسوس کرنے لگتا۔" ۳۲

سجاول کے کردار کے ذریعے دیہی معاشرت سے تعلق رکھنے والے افراد کی جھلک پیش کی گئی ہے۔ اور اُن کے رویوں کی عکاسی بھی کی گئی ہے دیہی سماج سے تعلق رکھنے والے افراد پختہ عزائم کے مالک ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ، وہ قول کے صادق ہوتے ہیں جس چیز کا ارادہ باندھ لیں وہ کر کے دم لیتے ہیں۔ ہمارے دیہاتوں کی عمومی روایت ہے کہ

چھوٹی چھوٹی باتوں پر قتل وغارت گری ہوتی ہے۔اور خون کا بدلہ خون سے لینے کو دیہاتی افراد ترجیح دیتے ہیں۔ یہاں دیہاتی لوگوں کے افعال وافکار کا تذکرہ کرتے صادق حسین نے قارئین کی توجہ اس جانب دلائی ہے کہ دیہاتی افراد کی توجہ اور سوچ کے دائرے محدود ہوتے ہیں۔ خون کا بدلہ خون دائمی دشمنی کو جنم دیتا ہے۔ لہذا صاحب عقل و دانش اس طرح کی دشمنیوں سے گریز کرنے کو فوقیت دیتے ہیں۔ معاشرتی رویوں کی جھلک پیش کر کے صادق حسین قاری کے ذہن میں ایک نئی سوچ کو جنم دیا ہے۔ اور واضح کیا ہے کہ قتل و غارت ایک قبیح فعل ہے۔ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے۔ لہذا اس طرح کا قدم اٹھانے سے پہلے انسان کو سوچ سمجھ سے کام لینا ہوگا۔اور جذبات کی بجائے تحمل، بردباری کا مظاہرہ کرنے کی عادت کو اپنانے میں انسان کی فلاح و بہتری کا راز مضمر ہے۔

صادق حسین کے افسانوی کرداروں میں نفس اور ضمیر ہمیشہ زندہ اور متحرک صورت میں نظر آتے ہیں۔ نیکی ہر حال میں غالب نظر آتی ہے۔اس کے علاوہ ان کے افسانوی کرداروں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے انھوں نے چاہے کتنے ہی منفی اور معاشرتی طور پر ناپسندیدہ کرداروں کو افسانوں میں جگہ دی ہو لیکن اندر کے انسان کی سچائی ان کے تمام کرداروں میں برقرار رہی ہے۔ جو ان کی شخصیت کے مثبت پہلوء کو اُجاگر کرتی ہے۔ سجاول کا کردار بھی جوشیلا، پر عزم اور انتقامی کردار تو دکھائی دیتا ہے لیکن ساتھ سماجی بیڑیوں اور رشتوں کی زنجیروں میں پھنسا مجبور اور بے بس کردار بھی ہے۔ صادق حسین نے اس کی شخصیت کے دوسرے حساس اور مثبت پہلو کو بھی سامنے لایا ہے۔ جہاں پدرانہ محبت غالب آجاتی ہے اور وہی مضبوط سجاول بیٹی کی محبت کے آگے مجبور اور بے بس دکھائی دیتا ہے اور اپنے حریف کو انتقام کا نشانہ بنانے کی بجائے اسے معاف کر دیتا ہے۔

> "یکا یک سجاول کے ہاتھ کانپنے لگے۔ نہ جانے کیوں یکدم اس کا گلا بھر آیا۔اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے دو بڑے بڑے قطرے نکلے۔ اُس نے چھری زور سے پھینک دی اور اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چاندنی سے نکل کر درختوں کے طویل سائے میں گم ہوگیا۔"۳۳

صادق حسین کے بیشتر افسانوی کردار دیہاتی سماج کے عکاس ہیں۔ لیکن انھوں نے دیہاتی سماج سے ہٹ کر متوسط اور پڑھے لکھے شہری افراد کو بھی افسانوں میں جگہ دی۔ افسانہ "اینٹ کی بیگم" میں بیک وقت چار افراد جو ٹرین کے مسافر ہیں اور اپنی اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہیں۔ کردار کی صورت میں افسانے میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اس افسانے کا مرکزی کردار "میں" کے صیغہ یعنی واحد متکلم کی صورت میں دکھایا گیا ہے۔ جس کے بارے میں پڑھ کر قاری کو یہی گمان ہوتا ہے کہ وہ مصنف خود ہے۔ افسانہ چونکہ علامتی انداز میں تحریر کیا گیا ہے اس لیے اس افسانے میں لفظ "اینٹ کی بیگم" عورت کے لیے استعمال ہوا۔ مصنف نے چاروں کرداروں کے حوالے سے عورت کے بارے میں نفسیات و خیالات کی ترجمانی کی ہے۔ مرکزی کردار واحد متکلم عورت کے بارے میں عام مردوں کی نسبت الگ اور

جداگانہ رائے رکھتا ہے جس کے نزدیک "عورت صرف چاہے جانے کی مستحق ہے۔"۳۴ یہی وجہ ہے کہ وہ ازدواجی زندگی کے بندھن مین بندھ جانے کے باوجود اپنی پہلی محبت رضیہ کو نہیں بھول سکا۔ جواب کسی دوسرے شخص کی منکوحہ ہے۔ واحد متکلم کے صیغہ کی صورت میں مصنف کا کردار ہی سامنے آتا ہے جو مثبت کردار ہے اور ماضی کی یادوں کے سہارے حال کو خوشگوار بنانے کا بھی قائل ہے۔ اور عورت کے بارے میں روایتی سوچ کی بجائے مثبت سوچ رکھتا ہے۔

"جو مجھے دیکھ کر اکثر اداس ہو جاتی تھی۔ جسے دیکھ کر میں قوس قزاح کی باتیں کرتا تھا۔ ایک دن جس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے لاکھوں موتی ٹپک ٹپک کر دھرتی کے سینے میں جذب ہو گئے تھے۔ جو ایک دن چپ چاپ پالکی میں بیٹھ کر دوسرے گاؤں چلی گئی تھی اور میں بڑے چاؤ سے ایک دوسری رضیہ کو شہر سے لے آیا تھا۔ جس کے ہاتھ درانتی کی بجائے پیانو سے آشنا تھے۔ جسے پا کر میں پہلی رضیہ کے گاؤں کی جانب دیکھتے ہوئے آنسو بہایا کرتا تھا۔"۳۵

افسانے میں دوسرا کردار جو جاندار اور زندہ دل کردار کی صورت میں ابھر کر سامنے آتا ہے وہ ہے مصنف کے پارٹنر کا کردار۔ جو خوش مزاج اور زندہ دل ہے اور فوراً دوسروں کے دلوں میں جگہ بنا لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

"ڈبے میں قدم رکھتے ہی اس نے خود اپنا تعارف کرنے کے بعد نہایت پر تکلف انداز میں ہم سب کو سگریٹ پیش کئے تھے۔ اور پھر باتوں باتوں میں اس قدر بے تکلف ہو گیا تھا کہ ہمیں سفر کے دلچسپ ہونے کا یقین ہو گیا۔"۳۶

پارٹنر کا کردار جتنا زندہ دل ہے اتنا ہی عورت کے حوالے سے محدود نظریے اور سوچ کا مالک ہے۔ وہ عورت کو بے اعتبار رشتہ قرار دیتا ہے۔ اُس کے نزدیک "عورت نا قابل بھروسہ ہوتی ہے۔" اس لیے اس کے ساتھ جیسا چاہو ویسا سلوک کرو۔ "اگر میں نے اینٹ کی بیگم غلط ڈسکارڈ کر دی تو اس میں کون سی بری بات ہے؟ آخر اینٹ کی بیگم کا اعتبار ہی کیا۔"۳۷ افسانے میں تیسرا کردار انجینئر کا کردار ہے جو ہر حال میں اپنی مرضی کو عورت پر تھونپنا چاہتا ہے۔ انجینئر کا کردار روایتی مرد کا کردار ہے جو عورت کو اپنی وراثت سمجھ کر اس پر اپنی مرضی تھونپنے کا قائل ہے اور عورت کی نفسیات سے ناآشنا اور ناواقف اور انا پرست ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسکی بیوی ہمیشہ کے لیے اس سے دور ہو جاتی ہے اور زہر کو ذریعہ بنا کر اپنی زندگی اور اپنی بیٹی کی زندگی کا خاتمہ کر دیتی ہے۔

"ہیلن مجھ سے زیادہ پیانو سے پیار کرتی تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ وقت نئے سُر نکالنے میں صرف کرتی تھی۔ اور میں چاہتا تھا کہ وہ صرف مجھ سے پیار کرے۔ وہ اپنی بچی کو بھی پیانو سکھاتی تھی۔ لیکن میری تمنا تھی کی میری بچی بڑی ہو کر ڈاکٹر بنے"۳۸

اس حوالے سے دیکھا جائے تو انجنیئر کا کردار انا پست ہے جو سمجھوتہ کرنا نہیں جانتا۔

افسانے کا چوتھا کردار ڈاکٹر کا ہے جو عورت کے حوالے سے مثبت سوچ رکھنے ولا شخص ہے اور دوسروں کو جینے کی امنگ دلانے والا ہمدرد بھی۔ ڈاکٹر کا کردار بظاہر تو عورت کے ظاہری حسن کا قائل ہے لیکن وہ عورت کو عزت ا ور تکریم دینا بھی جانتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ پیشہ درانہ زندگی میں قدم رکھتا ہے تو اسی خودکشی کرنے والی لڑکی سے شادی کرلیتا ہے جسکی زندگی اس نے بچائی تھی۔

"زندگی اور موت کی کش مکش کے بعد اس کے چہرے پر چھائی ہوئی زردی نے اسے اور حسین بنا دیا تھا۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ بڑی نحیف آواز میں مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ مجھے مرنے کیوں نہیں دیا۔۔ اس لیے کہ تمھیں زندہ رہنا ہے۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔"۳۹

افسانہ "اترن" میں کشور کا کردار متوسط اور سفید پوش طبقے کی نمائندگی کرنے والا کردار ہے۔ کشور مضبوط، با عمل اور سمجھوتہ کرنے والی سنجیدہ اور سمجھدار خاتون ہے۔ جو وقت اور حالات کے دھارے پر خود کو ڈال لینے کا گر جانتی ہے۔ اور تنگدستی کے باوجود خودداری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ اس کے دل میں کوٹ کی خواہش حسرت بنتی چلی جا رہی ہے وہ اپنے خاوند کی آمدن اور گھریلو حالات کو سمجھتی ہے لیکن سردی سے بچنے کے لیے اپنی بنیادی ضرورت کو پورا کرنے کی بھی خواہاں ہے۔

"کشور کو اپنے گھریلو حالات کا احساس تھا۔ وہ جانتی تھی کہ گرم کوٹ خریدنا اُن کے بس کی بات نہیں، چلو اگلے جاڑوں میں سہی۔۔۔ وہ دل ہی دل میں کہہ کر اپنے آپ کو تسلی دیتی۔"۴۰

کشور ایک خوددار عورت ہے جو تنگدستی کو اپنی انا اور خوداری پر غالب نہیں آنے دیتی۔ کشور کے دل میں نئے کوٹ کی تمنا حسرت بن جاتی ہے لیکن اس کا خاوند نیا کوٹ خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا اور مجبوراً اُس کے لیے لنڈے کا کوٹ لے آتا ہے لیکن جب کشور کو یہ بات معلوم ہوتی ہے تو وہ اس کو پہننے سے انکار کر دیتی ہے۔ اس کی غیرت اور خودداری یہ سب گوارا نہیں کرتی کہ وہ اترن پہنے۔ جبکہ ماضی میں وہ ایک خوشحال اور خوشگوار زندگی گزار چکی ہوتی ہے۔ اچھے حالات میں جب اُن کے گھر میں ہر چیز کی ریل پیل اور خوشحالی تھی کہ وہ اپنا اترن کسی مجبور یا بے بس عورت کو دے دیا کرتی تھی۔ "اور ایسا کرتے ہوئے اُسے عجب طمانیت اور مسرت کا احساس ہوتا تھا۔ جیسے اس نے کسی کو دے کر بہت کچھ حاصل کر لیا ہو۔"۴۱ لیکن جب اُسکا خاوند اس کے لیے لنڈے کا کوٹ لاتا ہے تو اُسے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ "جیسے اُس نے کچھ پا کر بہت کچھ کھو دیا ہو۔"۴۲ اس طرح وہ لنڈے کا کوٹ پہننے سے انکار کر دیتی ہے اور خود سردی میں ٹھٹھرنے کو ترجیح دیتی ہے۔

"کشور کی نگاہیں ایک سوالیہ نشان بن گئیں اور وہ سوالیہ نشان اس کی سسرالی حویلی کے درودیوار کو ہلانے لگا۔ اس کے خیالات دم کے دم میں وہاں جا پہنچے جہاں وہ مہاوٹ میں اپنا گرم جوڑا اتار کر کسی مسکین کو دے دیتی تھی۔ اور

ایسا کرتے وقت اُسے عجیب مسرت کا احساس ہوتا تھا۔ جیسے اُس نے کچھ دے کر بہت کچھ پالیا ہو۔ آج اُسے یوں لگا
جیسے اس نے کچھ پا کر بہت کچھ کو دیا ہو۔" ۴۳

کشور کا کردار اس سماج کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتا ہے جہاں غربت کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں خواہشات سر اٹھاتے ہی دم توڑ جاتی ہیں۔ لیکن کچھ لوگ اس سماج میں ایسے بھی ہیں جو خودداری کو خواہشات پر ترجیح دیتے ہیں۔

صادق حسین کے افسانے "کچنار" میں بلقیس کا کردار ابتداء میں حساس اور مضبوط کردار کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ لیکن افسانے کے اختتام میں وہ بے بس مجبور اور کمزور کردار کی صورت میں دکھائی دیتی ہے۔ افسانے کے ابتداء میں بلقیس اپنے شوہر کی محبت کے حوالے سے بہت زیادہ حساس ہوتی ہے۔ اُسے دوسروں کے ساتھ گھلنا ملنا اور خواتین کے ساتھ کھلم کھلا بات کرنا پسند نہیں۔ وہ چاہتی تھی کہ اُسکا خاوند صرف اُسے توجہ دے۔

بلقیس کا کردار دیہاتی لیکن متوسط طبقے سے تعلق رکھنے ولا کردار ہے۔ جس کے گھر میں روپے پیسے کی کمی نہیں اور نوکرانیاں دن میں دو دو وقت اس کے گھر کے کام کاج کیلئے آتی تھیں۔ اور چلی جاتی تھیں۔

افسانے میں بلقیس کا کردار ابتدائی سطح پر حساس ہونے کے ساتھ ساتھ مضبوط اور روایات کا پاسدار کردار ہے۔ جو بیوہ ہو جانے کے باوجود اپنے خاندانی وقار اور عزت کی رکھوالی و پاسداری کرنا جانتی ہے۔

"وقت کا ہاتھ بلقیس کے گھاؤ سیتا گیا اور پھر وہ ایک چٹان بن کر بیچ ساگر کے کھڑی ہو گئی۔ اسکی برداری میں نوجوان بیواوں نے چٹان بن کر ہی تو حالات کا مقابلہ کیا تھا۔ اُسے پُورا پورا احساس تھا کہ اُس کی رگوں میں راجپوتی خون دوڑ رہا ہے۔ وہ اُس خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ جسکی بیٹیاں بیوہ ہو کر عمر بھر اپنے سرتاج کے نام پر بیٹھی رہیں۔" ۴۴

یہی وجہ ہے کہ جب وقت اور حالات اُسے مختلف جگہوں پر لے جاتے ہیں جہاں جوانی اور جذبات کی شدت اُسے بہکنے کے لیے آمادہ کرتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ سنبھل جاتی ہے۔ مسیحا کے روپ میں شیطانی صفت میاں اکرم کے رویے سے دلبرداشتہ ہو کر وہ پورا دن روتی رہی اور دل ہی دل میں تہیہ کرتی ہے کہ راجو کی خوب خبر لے گی۔ جس نے ہمدردی کا مظاہرہ کر کے اسے میاں اکرم کے پاس بھیجا۔ "اس حرافہ کو چٹیا سے پکڑ کر آنگن میں نہ گھسیٹوں تو راجپوت کی بیٹی نہیں۔" ۴۵

جہاں ابتدائی سطح پر بلقیس کا کردار کا ایک مضبوط اور چٹان کی طرح سخت کردار ہے وہیں وقت کے اتار چڑھاؤ کی وجہ سے آخر میں بلقیس کے کردار کے ذریعے ہم پر واضح کیا گیا ہے کہ ہمارے معاشرے میں تنہا جوان اور بیوہ عورت کو تحفظ حاصل نہیں ہوتا اور وہ مضبوط اور باکردار ہونے کے باوجود عدم تحفظ کا شکار رہتی ہے۔ بلقیس کا کردار بھی ایسا ہی

عدم تحفظ کا شکار کردار ہے۔ جسے احساس تنہائی نفسیاتی کش مکش اور الجھن میں مبتلا کر دیتا ہے۔ احساس تنہائی اُسے اس دوراہے پر لا کھڑا کرتا ہے کہ وہ مردوں کا سامنا کرتے ہوئے دلی احساسات کے ہاتھوں مجبور اور بے بس دکھائی دیتی ہے۔

> "لمحات چنگاریاں بن کر اندھیرے میں بکھرنے لگے۔ بوٹی بوٹی میں کچنار کے پھولوں کا رس بجلی بن کر دوڑنے لگا۔ بلقیس کے ہونٹوں کے کونے لرزنے لگے۔ اُس لرزش کی سلگتی ہوئی اندھی آگ بڑھ کر ایک لمحے کا فاصلہ طے کرنی لگی۔"٦٦

بلقیس کے کردار کے ذریعے صادق حسین نے عورت کی نفسیات کی ترجمانی بہت عمدہ انداز میں کی ہے۔

افسانہ "بونے" کی کہانی بیک وقت دو کرداروں کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔ دو ایسے کردار جو معاشرتی لحاظ سے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک کردار غریب طبقے سے تعلق رکھنے والا اور دوسرا امیر طبقے اور مغربی تہذیب کے دلدادہ لوگوں کے گروہ سے تعلق رکھنے ولا کردار ہے۔

افسانے کا مرکزی کردار "حفیظ" ایک عام مشرقی تہذیب سے تعلق رکھنے والا غریب شخص ہے جسے اتفاقیہ طور پر بڑے لوگوں اور اونچی سوسائٹی سے تعلق رکھنے والے افراد کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا اتفاق مل جاتا ہے اور وہ انگریزی کلب میں جاتا ہے۔ جہاں اسے مغرب پرست لوگوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ حفیظ اندر ہی اندر پریشان بھی ہوتا ہے کیونکہ وہ لوگوں کی ظاہری چمک دمک دیکھ کر متحیر ہے اور اپنا موازنہ کلب میں آئے ہوئے دیگر افراد سے کرتا ہے تو احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔

> "حفیظ ایک عجیب بے چارگی کے عالم میں تھا۔ جیسے ابھی کوئی اس پر وار کر بیٹھے گا۔ اگر جمیل اس سے پوچھ بیٹھے کہ آپ کا کیا شغل ہے تو پھر۔۔۔۔۔؟ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کے باوجود اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔"٦٧

منور کا کردار اعلیٰ معاشرت سے تعلق رکھنے والا مغربی تہذیب کا دلدادہ کردار۔ انتہائی مشفق غمگسار، ملنسار ہونے کے ساتھ ساتھ مجبور اور بے بس کردار بھی ہے جو اپنی دھرتی اپنے گاؤں سے تعلق رکھنے والے افراد کے لیے خاص محبت کے جذبات سے بھرپور ہے۔ منور کا تعلق بلاشبہ اونچی سوسائٹی سے ہے لیکن وہ اس مغربی کلچر اور تہذیب کو سخت ناپسند کرتی ہے اور اس سے راہ فرار حاصل کرنا چاہتی ہے۔ لیکن ایسا کرنا اس کے بس سے باہر ہے۔ کیونکہ یہاں بھی سماجی رکاوٹیں اسے مجبور کر دیتی ہیں۔ جس سماج کا وہ حصہ ہے اُسے اُس سماج میں گھٹن محسوس ہوتی ہے۔ وہ اپنی گھٹن زدہ زندگی کے بارے میں حفیظ کو بتاتی ہے کہ "میری زندگی گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ چکر کاٹ رہی ہے۔"٦٨ اور جب وہ روزمرہ کے معمولات سے متعلق حفیظ کو آگاہی دلاتی ہے تو وہ حیران ہو جاتا ہے۔

"مجھے ہر روز وقت پر ناشتا کرنا ہوتا ہے۔ دن کے ٹھیک ایک بجے لنچ، ٹھیک چار بجے شام کی چائے، ٹھیک نو بجے رات کا کھانا اور پھر ایک معین وقت پر جچا تلا ٹھنڈا، مکینکل خاوند کا پیار بر تھ ڈے پر پھولوں کے ساتھ قیمتی تحفے ہر عید پر ایک جڑاو زیور۔"۴۹

اس حوالے سے دیکھا جائے تو منور کا کردار قابل رحم کردار بھی ہے۔ اور حقیقت نگاری کا مجسم نمونہ بھی۔ یہی وجہ ہے کہ حفیظ اس کی داستان حیات سننے کے بعد اُس کے لیے اس حد تک ہمدردی کے جذبات رکھتا ہے۔

منور اور حفیظ کے کرداروں کے ذریعے صادق حسین مشرقی اور مغربی تہذیب کے تصادم کو سامنے لا کر اپنا مطمع نظر ہم تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے ہیں کہ مغربی تہذیب کو اپنانے والے حقیقی سکون اور اطمینان کو ترستے ہیں۔ کیونکہ بظاہر چمک دمک رکھنے والی مغربی تہذیب در حقیقت اندر سے اتنی ہی کھوکھلی ہے۔ لیکن پاکستانی سماج پر مغربی تہذیب کے اثرات اب بھی باقی ہیں۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ ایک بار جو اُس تہذیب کے اثرات کو مکمل طور پر اپنی زندگی میں شامل کرلیتا ہے پھر اُس سے نکلنا اُسے اتنا ہی دشوار محسوس ہوتا ہے۔

صادق حسین حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں۔ کردار سازی میں بھی آپ نے فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ کردار سازی کے وقت آپ نے کرداروں کے خیالات جذبات احساسات مخصوص ذہنی کیفیات، ہیجانات اور اضطراب کو لفظی جامہ پہنایا بلکہ اس میں انفرادیت، حقیقت اور اصلیت کے علاوہ افسانوی دلکشی شاعرانہ لطافت اور نفسیات کو بھی شامل رکھتے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ کی کہانیاں زیادہ تر ان کرداروں کے گرد گھومتی ہیں جو کسی نہ کسی المیے یا سماجی مسائل میں گرفتار ہوں۔ لیکن آپ نے کرداروں کو اُن کے تمام مسائل سمیت اُن کی کیفیات و حالات کو بھی بیان کیا۔ اس لیے اُن کے کردار غیر حقیقی معلوم نہیں ہوتے بلکہ ہمارے معاشرے کے جیتے جاگتے کردار نظر آتے ہیں۔ روبینہ کنول آپ کی کردار نگاری کے حوالے سے رائے دیتی ہیں:

"میرے نزدیک صادق حسین کی کہانیاں کرداروں کے گرد گھومتی ہیں جو کسی نہ کسی المیے کا شکار ہوتے ہیں۔ ان کی غربت افلاس بے بسی بھوک ان کے خاص مسائل ہیں۔ ان کے افسانوی کردار حقیقی اور زندہ ہیں اس لیے کہ ان کا انتخاب ہمارے ارد گرد بکھرے ہوئے لوگوں سے کیا گیا ہے۔"۵۰

صادق حسین کے افسانوی کرداروں کو مطالعہ کرنے سے یہی حقیقت سامنے آتی ہے کہ آپ نے اپنے معاشرے میں سے حقیقی کرداروں کو افسانوں میں جگہ دی۔ اس لیے ان پر غیر حقیقی ہونے کا شائبہ نہیں ہوتا۔

صادق حسین کے دوسرے افسانوی مجموعے "شہر اندر شہر" میں سماجی شعور (بحوالہ کردار)

صادق حسین کا دوسرا افسانوی مجموعہ "شــہر انــدر شــہر" ۱۳افسانوں پر مشتمل ہے اب اس کے کرداروں کا تنقیدی جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔"شــہر انــدر شــہر "کا پہلا افسانہ "اس پل پر" کی کہانی بظاہر ایک ہی مرکزی کردار کے گرد گھومتی ہے۔اس کا مرکزی کردار "دلبر خان" جو نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والا حقیقت پسند کردار ہے۔جو اُن پہلوؤں پر باریکی سے سوچتا ہے جو شاید ہی اس سماج سے تعلق رکھنے والا کوئی دوسرا فرد سوچتا ہو۔پل پر لوگوں کی قسمتوں کا حال جانتے اُسے کم و بیش تیس سال ہو چکے ہیں اور طویل اور تھکا دینے والے عرصے میں اُس نے زمانے کے بے شمار اُتار چڑھاؤ دیکھے ہیں اور بھکاریوں کی تو اس نے تقریباً تین نسلوں کو قریب سے دیکھ چکا تھا۔ وہ اُن کی طرز زندگی اور ذریعہ معاش کو قریب سے دیکھ چکا تھا۔ وہ اُن کی زندگیوں کے حوالے سے کبھی کبھی بڑی سنجیدگی کے ساتھ غور بھی کرتا ہے اور سوچتا بھی ہے۔

> "وہ سوچتا ہے کہ پل کی سیڑھیوں پر بھیک مانگنے والی مخلوق کو تو یہ احساس ہی نہیں رہا کہ سکھ کیا ہے اور دُکھ کیا ہے۔ وہ تو مسکین صورت بنا کر دستِ سوال دراز کرتے ہیں۔ وہ تو مسکین کے رحم کے جذبے کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر روزی پیدا کرتے ہیں۔"۵۱

یعنی دلبر خان کی سوچ کے ذریعے صادق حسین نے یہ واضح کیا ہے کہ بھکاریوں کی زندگی جانوروں سے کم نہیں۔ جن کی زندگی کا مقصد صرف دو وقت کی روٹی اور چھپر کا حصول ہے جہاں وہ سکون کی نیند سو سکیں۔ وہ لوگ محنت کرنے سے عاری اور سست ہوتے ہیں اور صرف دوسروں پر انحصار کرنا جانتے ہیں اور یہ چیز انسانیت کی معراج کے خلاف ہے۔انسان کی زندگی بے مقصد نہیں۔ اور نہ ہی پل یا سڑک کنارے بھیک مانگ کر اور پیٹ بھر کر کھانا کھا کر سو جانے تک محدود ہے۔بلکہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور درجہ کمال تک پہنچنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے اگر وہ کوشش و چاہت اور ہمت سے کام لے۔

دلبر خان حقیقت اور انسانی زندگی کو مشاہداتی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ وہ خود سے انسانی حقائق سے متعلق سوال کرتا ہے اور خود ہی جواز بھی پیش کرتا ہے۔ مثلاً جب سیڑھی پر بیٹھا ہوا فقیر آواز بلند کرتا ہے۔"سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے"۵۲ تو دلبر خان سوچتا کہ سکندر خالی ہاتھ اگر اس دنیا سے جاتا ہے تو یہ اسکا اپنا مقدر تھا آج کل تو کوئی خالی ہاتھ دوسری دنیا میں نہیں جانا چاہتا۔ کیونکہ آج کل کے دور میں ہر انسان کو دولت کی ہوس اور لالچ ہی اتنی زیادہ ہے کہ ان کی تمام کوششوں کا ذات کا محور صرف دولت ہے۔

صادق حسین نے دلبر خان کی اس حقائق شناسی کے ذریعے ہمارے معاشرے پر گہری چوٹ کی ہے کہ آج کے انسان نے مایا کی کھوج میں خود کو گم کر دیا ہے۔ اور زندگی صرف روپے کے حصول تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ دلبر خان کا کردار ایک سمجھدار اور حق شناس کردار ہے جسے زمانے کی اونچ نیچ نے بہت سمجھدار بنا دیا۔ کبھی اُسکا بھی معاشرے میں اک نام تھا۔ وہ تقریریں کرنے میں مہارت رکھتا تھا۔ اور سب اُس لوگ اُسکی خود اعتمادی اور تقریر کرنے کے فن کے گرویدہ تھے۔ پھر وقت نے پلٹا ایسا کھایا کہ اس کا مقصد صرف دوسروں کے مقدر کے حال جاننے تک محدود ہو گیا۔ صادق حسین نے دلبر خان کے کردار کے ذریعے یہ نکتہ بھی واضح کیا ہے کہ انسان کی زندگی ایک ڈگر پر نہیں چل سکتی اُس میں اونچ نیچ اور اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں، کبھی وقت کی مہربانیاں اُسے بلندی تک پہنچا دیتی ہیں تو کبھی اسکی ستم ظریفیاں اُسے پستی میں دھکیل دیتی ہیں۔ اس لیے انسان کی حتی المقدور کوشش کرنی چاہیے کہ وہ مصائب زمانہ اور زندگی کی مشکلات کو نہ صرف برداشت کرے بلکہ ہر قدم پر مصالحت اختیار کرنے کا عادی بھی بنا لے۔

افسانہ "جھولی" کی کہانی بیک وقت دو کرداروں کے گرد گھومتی ہے۔ "استاد مودی اور اسکا بیٹا فخری"۔ اور دونوں کردار بحوالہ شخصیت ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یعنی دو متضاد کرداروں کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ استاد مودی کا کردار کسی حد تک منفی اور انا پرست کردار ہے جو خودی کے خول سے باہر نہیں نکلتا اور حکم چلانا پسند کرتا ہے۔ استاد مودی ان پڑھ اور انا پرست ہے۔ وہ اپنے آپ کو ماہر اور تجربہ کار سمجھتا ہے جو صرف فیصلہ سنانا اور حکم دینا جانتا ہے۔ اس نے ساری زندگی راج دھانی کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ بڑھاپے میں جب اُسکی تمام صلاحیتیں اسے صلب ہوتی نظر آتی ہیں تو وہ اپنی انا کی شکست کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ لہذا جب بیکری میں کام کرنے والے مزدور اپنے مطالبات کا اظہار کرتے ہیں تو وہ خود کو بے بس محسوس کرتا ہے اور وہ کسی سے مشورہ لینا چاہتا ہے کہ اس صورتحال سے کیسے نمٹا جائے لیکن اسکی انا اُسے اجازت نہیں دیتی کہ وہ بیٹے سے مشورہ کر لے۔

> "آج اسکا دبدبہ متزلزل ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے تو بیکری اور گھر میں اُس کی بات قانون کی حیثیت رکھتی تھی۔ آج کایا پلٹ ہو گئی۔ اس کے دل میں پہلی بار خواہش پیدا ہوئی کہ ان حالات میں کسی سے رائے لینی چاہیے فخری باہر گیا ہوا تھا مگر اس کو موجود ہونا ایک برابر تھا اس لیے کہ استاد مودی اپنے بیٹے سے مشورہ لینے میں اپنی ہتک سمجھتا اس کی انا بولی: میں نے ہمیشہ مشورہ دیا ہے لیا نہیں۔" ۵۳

استاد مودی کا کردار کسی حد تک بے رحم کردار بھی ہے کیونکہ وہ بیکری کے ملازمین کی تنخواہیں بڑھانے کے خلاف ہے اور اکثر باپ اور بیٹے کے درمیان اس حوالے سے بحث و تکرار ہوتی رہتی ہے، استاد مودی پیشہ ورانہ مہارت رکھنے والا اور شاطر انسان ہے۔ جو اپنے فن کی باریکیاں دوسروں کو نہیں بتاتا۔ اور کاروبار چلانے کے تمام گر جانتا ہے۔ مگر اُستاد مودی انسانی ہمدردی کے جذبات سے عاری کردار ہے کیونکہ جب اُسکا بیٹا کیک کی صورت میں ایک فقیر کا مجسمہ

بناتا ہے تو وہ اُسے تحقیر آمیز لہجے میں کہتا ہے کہ :"صاحبزادے! لوگ ہماری دکان پر دکھ درد کی تصویریں خریدنے نہیں آتے وہ خوشی کی تلاش میں آتے ہیں۔"۵۴

افسانے کا دوسرا کردار "فخری" ہے جو استاد مودی کا بی۔اے پاس ہونہار بیٹا ہے۔ فخری کا کردار ایک مثبت اور انسانی ہمدردی سے سرشار کردار کی صورت میں نظر آتا ہے۔ اس کے اور اس کی باپ کی شخصیت میں واضح تضاد نظر آتا ہے۔ فخری غریبوں اور مسکینوں کے دکھ درد کو سمجھتا ہے اسی لیے وہ انسانی ہمدردی کے جذبے سے سرشار ہو کر فقیر کو دھسا دینے چلا جاتا ہے اور اپنے والدین کو یہ باور کراتا ہے کہ اس پر فقیر کا حق ہے۔

اس کے علاوہ وہ بھکاریوں کا خیال کرتا ہے اور انہیں بیکری کا بچا کھچا سامان کھانے کے لیے دیتا ہے تو بھکاری عورتیں اُسے جھولی بھر کے دعائیں دیتی ہے۔

> "بھکارنیں جھولیاں پھیلائے، جھوٹن کے ڈھیر کے پاس کھڑی تھیں۔ ایک بھکارن ننگ دھڑنگ بچے کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولی! خدا تمھارا بھلا کرے اس دفعہ جھولی میں پھینکنا۔"۵۵

افسانے میں دو مخصوص کیک کی تیاری کے ذریعے در حقیقت صادق حسین نے باپ اور بیٹے کی شخصیات کے تضاد کو سامنے لایا ہے۔ استاد مودی ایک ایسا کیک تیار کرتا ہے جس پر انسانی دل بنا ہوتا ہے جس میں دو سوراخ ہوتے ہیں۔ جبکہ فخری ایسا کیک تیار کرتا ہے جس میں فقیر کا مجسمہ کیک کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ استاد مودی اپنے جذبات کو کیک میں سمو دیتا ہے اس بات کی ترجمانی کرتا ہے کہ اُسے اپنے بیٹوں کے کھو جانے کا غم ہے وہ اپنی اولاد کے غم کو محسوس کر سکتا ہے جبکہ غریبوں کے دکھ درد کو سمجھنے سے عاری ہے جبکہ فخری کا بوڑھے فقیر کا مجسمہ بنانا اس انسان دوستی اور غریبوں کی غمگساری اور ہمدردی کو ظاہر کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اسکی نرم دلی کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ وہ دوسروں کے احساسات کو خود پر طاری کر لیتا ہے۔

> "یکایک اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ بوڑھا ہو گیا ہو۔ کمر دوہری ہو گئی ہو اور سر کے بال سفید۔ سردیوں کی رات میں وہ ایک دکان کے تھڑے پر بڑا تھر تھر کانپ رہا ہو۔ کھانستے کھانسے اُس کا بُرا حال ہو گیا ہو۔ پچھلی سردیوں میں اُس نے ایک بوڑھا بھکاری عین اُس حالت میں دیکھا تھا۔ ایک دردناک منظر دیکھ کر وہ دوڑتا ہوا اپنے گھر چلا گیا۔ اُس کا سانس پھول رہا تھا۔"۵۶

صادق حسین کے افسانے "خون کا معبد" میں رخشندہ کا کردار ابتداء میں عدم تحفظ اور ذہنی کش مکش میں مبتلا کردار کی صورت میں سامنے آتا ہے لیکن افسانے کے آخری حصے میں وہی مضبوط اور مثبت کردار کی صورت میں دکھائی جاتی ہے۔ رخشندہ ایک ایسے خاندان کی بہو ہے جہاں لہو سے عبادت کرنا اُن کا شیوہ ہے۔ یعنی اس کنبے کے تین افراد نے وقتاً فوقتاً دھرتی کے تحفظ کے لیے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے تھے۔ رخشندہ اپنے خاوند کی شہادت کے بعد انجانے

خوف اور کرب میں مبتلا ہو کر عدم تحفظ کا شکار ہو جاتی ہے۔ کیونکہ وہ خاوند کے بعد اپنے بیٹے کو نہیں کھونا چاہتی۔ اُسے ہر وقت بیٹے کے کھو جانے کا خوف ستاتا رہتا ہے اور وہ دل ہ دل میں سوچتی ہے اور فیصلہ کرتی ہے کہ وہ اپنے بیٹے کو کبھی فوج میں نہیں بھرتی ہونے دے گی۔"میرا بیٹا ٹھیکیدار بنے گا۔ اپنے نانا کی طرح میں اسے سپاہی نہیں بننے دوں گی۔"۵۷ وہی رخشندہ جسے ابتدا میں انجانے خوف اور اندیشوں نے گھیرا ہوا تھا۔ افسانے کے آخری حصے میں خاندانی تعویذ اپنے بیٹے کے گلے میں ڈال دیتی ہے جو اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ اپنے بیٹے کو وطن عزیز کے لیے قربان کرنے کو تیار ہے۔ کیونکہ چاندی کے خول میں لپٹا ہوا وہ تعویز تین نسلوں سے اس بات کی گواہی دیتا ہے جس نے اس تعویذ کو پہنا اُس نے شہادت کا عظیم رتبہ پایا۔ اور اب وہی تعویذ رخشندہ اپنے ہاتھوں سے اپنے بیٹے کو پہناتی ہے جو اُس کے رویے اور سوچ میں واضح تبدیلی کو پیش کرتا ہے۔

صادق حسین نے اس افسانے میں رخشندہ کے کردار کے ذریعے یہ واضح کیا ہے کہ گھریلو رویے اور ماحول انسان کی شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ رخشندہ کا دل کبھی اتنا بڑا نہ ہوتا اور نہ اتنا حوصلہ اُس کے اندر پیدا ہو سکتا تھا کہ اپنے خاوند کے بعد وہ اپنے بیٹے کو وطن کے لیے قربان کر دے۔ اُسے یہ حوصلہ ماں جی سے ملا تھا۔ کیونکہ وہ ماں جی جو رشتے میں اس کی ساس تھیں اُن کی شخصیت کا بغور جائزہ لیتی تھی۔ ''ماں جی'' جب کبھی اپنے خاوند اور سسر کی بہادری اور شجاعت کے قصے سناتی تھیں اور اُن کی شہادت کے واقعات کا تذکرہ رخشندہ سے کرتی تھیں تو اُن کی آنکھوں میں ایک مخصوص چمک ہوتی تھی جسے وہ ہمیشہ محسوس کرتی تھی۔"جب آفتاب محاذ پر گیا تھا اس وقت ماں جی کی آنکھوں میں چمک تھی۔"۵۸ اور اب آفتاب (رخشندہ کا خاوند) کی شہادت پر اس نے ماں جی کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔"ماں جی کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ اور آنکھوں میں آنسو تھے۔"۵۹ یہ ماں جی کے چہرے کی طمانیت اور آنکھوں کی چمک اور لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ ساتھ شہاب کے مشاغل کا بھی اثر تھا کہ وہ اپنے رویے اور سوچ میں تبدیلی لے آتی ہے اور اپنے بیٹے کو وطن کے لیے قربان کرنے اور سرحدوں کی حفاظت کرنے کے لیے تیار کرتی ہے۔"ایک دن جب وہ لان میں ٹہلنے کے لیے نکلتی ہے تو یہ دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔"شہاب کی چھروں والی بندوق درخت کے پاس پڑی ہے اور وہ خود کھرپی سے مٹی کھود رہا ہے۔"۶۰ وہ شہاب سے سوال کرتی ہے کہ بیٹا یہ کیا ہو رہا ہے تو وہ جواب دیتا ہے کہ مورچہ کھود رہا ہوں۔ وہ اپنی بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "اس مورچے میں بیٹھ کر میں اپنے ملک کی سرحدوں کی حفاظت کروں گا۔" ۶۱ شہاب کا یہ شوق اسے چوکنا کر دیتا ہے اور آخر میں وہ پرنم آنکھوں کے ساتھ بیٹے کے شوق کو ترجیح دیتے ہوئے چاندی کے خول والا

خاندانی تعویذ بیٹے کے گلے میں ڈال دیتی ہے۔ مجموعی طور پر رخشندہ کا کردار مثبت کردار ہے۔ اور صادق حسین کی مثبت سوچ کا آئینہ دار بھی۔

افسانہ "دشمن" کی پوری کہانی چھیماں کے گرد گھومتی ہے۔ چھیماں محبوب سے والہانہ محبت کرتی ہے اور اسکا بر ملا اظہار گیتوں میں کرتی ہے۔ لمحہ لمحہ وہ اس محبت کی تپش کو محسوس کرتی دکھائی گئی ہے۔ اس حوالے سے چھیماں کا کردار کسی فلمی ہیروئن کے درجے سے کم نہیں۔ مثلاً سائیں بادشاہ کے مزار کے قریب بس سٹاپ پر جب وہ دیگر خواتین کے ساتھ کھڑی ہوتی ہے تو گاؤں کی خواتین شیرے کے بارے جب اپنی اپنی رائے کا اظہار کرتی ہیں تو چھیماں کے دل میں گدگدی سی ہونے لگتی ہے۔ جب ادھیڑ عمر عورت اُس کے محبوب شیرے کے حوالے سے اپنی نفرت کا اظہار کرتی ہے کہ گولی مارو یہ راجپوتوں کی اولاد ہے تو چھیماں کو ایسا محسوس ہو جیسے کسی نے اس کے سینے میں گولی مار دی ہو۔

اس کے ساتھ چھیماں ایک غیر مند کردار کی صورت میں بھی دکھائی گئی ہے۔ جب اُس کا ماہیا اُسے بھگا کر لے جانے کی بات کرتا ہے تو وہ اُسے یہ کہہ کر منع کر دیتی ہے۔

"شیرے! میری بستی کی بیٹیاں پگڑی کا شملہ گرنے نہیں دیتیں۔

میں اپنے بابل کی پگڑی کا شملہ نیچا نہیں ہونے دوں گی۔ تم سہرا باندھ کر آؤ اور دو بول پڑھا کے مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ۔"[۶۲]

صادق حسین کے افسانوی کردار ہمیشہ خیر کا درس دیتے ہیں اور ان میں شر کا کوئی پہلو شاذ ہی نظر آتا ہے۔ جیسے چھیماں کا کردار ایسا مضبوط کردار ہے جو محبت کے آگے باپ کی عزت کو ترجیح دیتی ہے۔ اور اس کی شان اور عزت کی پاسداری کرتی ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو چھیماں کا کردار ایک غیرت مند کردار ہے۔

چھیماں کسی فلمی ہیروئن کا کردار لگتی ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے چھیماں کے کردار کے ذریعے چند غیر معمولی چیزوں کا ذکر بھی کیا ہے جن کا معمول کی زندگی میں ہونا شاید ہی ممکن ہو مثلاً چھیماں کا باپ کے دشمنوں سے مقابلے کے لیے بندوق اٹھا کر نکلنا اور گولی چلانا۔ اس کے علاوہ چھت پر چھیماں کی شیرے سے ملاقات اور شادی بیاہ پر سریلے گیتوں کا جادو جگانا، یہ سب فلمی ہیروئن کے انداز معلوم ہوتے ہیں۔

صادق حسن کے افسانے میں بابو رفیق کا کردار معاشی لحاظ سے عدم استحکام کا شکار ہے جو نچلے متوسط طبقے کی نمائندگی کرتا ہے بابو رفیق حالات کی ستم ظریفیوں اور مجبوریوں کی زنجیروں میں جکڑا ہوا بے بس کردار ہے۔ جسے اپنی روزمرہ ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لالے پڑے رہتے ہیں۔ ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کی غرض سے اُسے کبھی ایک سے قرض لینا پڑتا ہے تو کبھی دوسرے شخص سے۔ معاشی پریشانیاں اور سوچیں اسے ذہنی اور جسمانی طور پر

بہت کمزور بنا دیتی ہیں اور وہ بیمار ہو جاتا ہے۔ در حقیقت صادق حسین نے بابو رفیق کے کردار کے ذریعے سرکاری ملازمین کی حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالی ہے اور ان کے مسائل کو بھی اجاگر کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ وہ سماج کو باریکی کے ساتھ دیکھنے کے قائل ہیں۔ بابو رفیق ایک سرکاری ملازم ہے اور نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ ایمانداری کے ساتھ اپنے فرائض تو پورے کرتا ہے لیکن اتنی مشقت کے بعد اُسکی ماہوار تنخواہ اتنی محدود ہوتی ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی خواہشات اور ضروریات زندگی کے لیے ترستا ہے۔ بالآخر مسلسل محنت اور ناقص غذا کی وجہ سے اسکی صحت متاثر ہوتی ہے اور وہ بیمار پڑ جاتا ہے کیونکہ معاشی پریشانیاں اُسے ہر وقت ذہنی طور پر مضطرب کیئے رکھتی ہیں۔

"تازہ اور خشک میوے تو اس کی دسترس سے باہر تھے۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ لحمیات، اور حیاتین کی کمی کی وجہ سے انسانی جسم کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ اگر اُسے ان باتوں کا علم نہ ہوتا تو شاید اسے اتنا دکھ نہ ہوتا۔ اب اُس کی بیوی امید سے تھی۔ ایک بیمار زندگی سے نئی زندگی طلوع ہو کر اس گھر میں کیا کرے گی۔ اُسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے وہ کولہو کے بیل کی طرح چکر کاٹ رہا ہو۔"۶۳

اس افسانے میں صادق حسین نے " بابو رفیق "کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات و مسائل، غموں و مشکلات کو معاشرتی تناظر میں گرفت میں لینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اور غریبوں کی تنگدستی کو بیان کر کے سماجی ناہمواریوں کو کامیابی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

صادق حسین کے افسانوں کا مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ انھیں افسانہ نویسی کے لیے خام مواد اپنے ارد گرد کے ماحول سے ہی مل جاتا ہے جسے وہ مشاہدے کی عینک سے پرکھ کر اپنے افسانوں میں جگہ دیتے ہیں اسی طرح اُن کے افسانوی کرداروں کو بھی ذہن میں تخلیق نہیں کرنا پڑتا۔ بلکہ وہ انھیں زندگی ہی سے تراشتے ہیں۔ وہ چلتے پھرتے کرداروں کا بغور جائزہ لیتے ہیں اور انھیں سمجھنے کے بعد تخلیق کرتے ہیں۔ صادق حسین کے بیشتر کردار زندگی کے تمام نشیب و فراز کے ساتھ ہر قدم پر مصالحت کرنے کے عادی ہیں اور زندگی کے دھارے کے ساتھ ساتھ بہنے کو ہی اپنے راہ نجات جانتے ہیں۔

افسانہ "حمید اکڑیل" کی کہانی بیک وقت دو کرداروں کے گرد گھومتی ہے۔ حمید اکڑیل اور شرفو۔

حمید اکڑیل کا کردار ایک وقت میں مختلف صورتوں میں رنگ بدلتا دکھائی دیتا ہے۔ کہیں وہ خوددار کردار کے طور پر سامنے آتا ہے۔ تو کہیں خود غرض اور مطلبی، اور اسی طرح کہیں وہ حساس دل رکھنے والے ہمدرد انسان کی صورت میں نظر آتا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ افسانے کا مرکزی کردار ہے اور پوری کہانی اسی کے گرد گھومتی ہے۔

بنیادی طور پر حمید اکڑیل غریب اور مفلوک الحال طبقے سے تعلق رکھنے والا خوددار شخص ہے۔ جو روزی روٹی کے حصول کے لیے گاؤں چھوڑ کر شہر کا رخ کرتا ہے لیکن یہاں بھی اُسے معاشی طور پر پریشانی کا سامنا رہتا ہے یہاں تک کہ کوئی اسے مزدوری والا کام بھی نہیں دیتا تو وہ ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لیے خون بیچنا شروع کر دیتا ہے۔ مگر مسلسل خون بیچنے کی وجہ سے اس کی صحت خراب سے خراب تر ہو جاتی ہے اور آخر کار یہی خرابی صحت اسے موت کے منہ میں دھکیل دیتی ہے۔

حمید اکڑیل غربت اور تنگدستی کے باوجود اپنی خودداری برقرار رکھتا ہے اور اپنے دوست کی طرح ایمان بیچ کر گداگری کے پیشے کو اختیار نہیں کرتا۔ اور خون بیچ کر گزارا کرنے کو ترجیح دیتا ہے۔

حمید اکڑیل اپنے دوست شرفو کے پیشے کو نہ صرف حقیر سمجھتا ہے بلکہ اُس کے پیشے سے نفرت کا برملا اظہار بھی کرتا ہے۔ "نہیں شرفو! تیرا پیشہ ذلیل ہے میں تیری کمائی نہیں کھا سکتا۔" اور اس کے ذرائع آمدنی پر تنقیدی جملے کہتا ہے۔

"شرفو: تواُن کتوں سے بھی بدتر ہے، اندھا بن کر بھیک مانگتا ہے۔ چھوڑ اس ذلیل پیشے کو مردوں کی طرح روٹی کمانا سیکھ۔ مجھے دیکھ میں حلال کر کے کھاتا ہوں۔" ۶۴

شرفو کے ساتھ کی گئی تمام باتیں حمیدے کڑیل کی خودداری کو ظاہر کرتی ہیں۔ حمید اکڑیل خوددار ہونے کے ساتھ ساتھ ہمدرد و مہربان اور حساس طبعیت کا مالک بھی ہے جو دوسروں کے دکھ درد اور تکالیف کو اپنا درد سمجھ کر ان کی مدد کرنے کو تیا ہوتا ہے۔ اُسے جونہی پھول بیچنے والے کی ماں کی بیماری کی خبر ملتی ہے وہ فوراً اُس کی مدد کرنے کیے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ "حمید اکڑیل پانچ روپے کا نوٹ پھول والے کے ہاتھ میں تھما کر گرجا؛ دفع ہو، پھر تجھے یہاں دیکھا تو ہڈی پسلی توڑ دوں گا۔" ۶۵

بظاہر لاپرواہ دکھائی دینے والا حمید اکڑیل اندر سے اتنا ہی حساس دل کا مالک ہوتا ہے کیونکہ یتیمی کے بچپن میں اُس نے ہمیشہ اپنی ماں کو محنت اور مشقت کرتے دیکھا۔ اور اسکی ماں کی کہی ہوئی باتیں کہ "بیٹا میں دکھی ہوں تمھاری نانی اور پرنانی بھی دکھی تھیں۔" ۶۶ نے اسے اندرونی طور پر بہت کمزور اور حساس بنا دیا تھا یہی وجہ ہے کہ وہ دوسروں کے دکھ کو اپنا درد سمجھ کر اسے ختم کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔

افسانے میں بعض مقامات پر حمید اکڑیل خود غرض اور مطلبی کردار کی صورت میں بھی نظر آتا ہے۔ اسکی وجہ معاشی بدحالی ہے جسکا وہ شکار ہوتا ہے۔

صادق حسین نے حمید اکڑیل جیسے کردار کی تخلیق سے یہ بات باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ پیٹ کی آگ بہت ظالم ہوتی ہے جسے مٹانے کے لیے انسان خودداری، شرافت اور ایمانداری جیسے تمام جذبات کے آگے شکست تسلیم کرلیتا ہے۔

حمید اکڑیل چونکہ خون بیچ کر گزر واوقات کرتا ہے لہذا وہ ٹریفک کے حادثات پر غمزدہ ہونے کی بجائے خوشی کا اظہار کرتا ہے کیونکہ انھی حادثات سے تو اس کی روزی روٹی جڑی ہوتی ہے۔ یہاں حمید اکڑیل خود غرض اور بے حس کردار کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ ذیل میں اس حوالے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

"پروردگار! تو روزی رساں ہے ،کاریں چلانے والوں کے ذہن پر ایسی ابتری نازل کردے ہر چوراہے میں حادثہ ہو۔ اور ایسے لوگوں کا خون بہہ نکلے جو میرا لہو موئی رقم دے کر خرید سکیں۔" ۶۷

وہی حساس دل رکھنے والا خوددار حمید اکڑیل اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مطلبی بن جاتا ہے۔ صادق حسین کے افسانوں کی کمال خصوصیت بھی یہی ہے کہ اُن کے الفاظ قاری کو ان پہلوؤں پر بھی سوچنے پر مجبور کردیتے ہیں جہاں ایک عام انسانی آنکھ وہ سب سے محروم نظر آتی ہے۔ ان کے کردار بہت خوب ہوتے ہیں۔ اور اپنی چھوٹے چھوٹے کرداروں کے ذریعے وہ کہانی کا تانا بانا کامیابی کے ساتھ بن کر اسے بامِ عروج تک لے جاتے ہیں۔

افسانے کا دوسرا کردار "شرفو" ہے۔ شرفو غریب طبقہ کی نمائندگی کرنے والا شخص ہے جو معاش کے حصول کے لیے گداگری جیسے حقیر پیشے کو اپنالیتا ہے۔ لیکن رشتوں کی اہمیت کو نہ صرف سمجھتا ہے بلکہ انھیں نبھانا بھی جانتا ہے۔ وفاشعار کردار جو مشکل وقت میں دوست کو اکیلا نہیں چھوڑتا بلکہ اسکی مدد کرتا ہے۔ اسکی روزی روٹی اور دوا پیسے کا انتظام کرنے کی تمام ذمہ داریاں اپنے سر لے لیتا ہے۔ درحقیقت صادق حسین نے شرفو کے کردار کے ذریعے سماج کے اندر رشتوں کی اہمیت کو سمجھنے اور نبھانے کے ساتھ وفاشعاری کا درس بھی دیا ہے۔ یہاں اُن کی سوچ ارسطو کے اُس قول کو درست ثابت کرتی ہے کہ انسان ایک معاشرتی حیوان ہے اور معاشرے میں رہتے ہوئے اسے ایک دوسرے پر انحصار کرنا پڑتا ہے لہذا انسان کو سماجی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے رشتوں کی اہمیت سے آگاہ ہونا چاہیے اور انہیں نبھانے کی استعداد اور صلاحیت بھی اپنے اندر پیدا کرنی چاہیے۔

شرفو کی اپنے دوست حمید اکڑیل کے لیے جان نثاری کی مثال اس کے اس جملے سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ "ڈاکٹر صاحب! میرا سارا خون نکال لیجئے۔" ۶۸ اور جب شرفو حمیدے کڑیل کو ہسپتال میں دم توڑتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ حمیدے کے گلے لگ جائے اور وہ دل ہی دل میں سوچتا ہے کہ کاش ایسا نہ ہوا ہوتا۔ کاش وقت ایک بار پھر پیچھے کو لوٹ جائے جہاں سے ان دونوں نے روزی روٹی کی تلاش میں اپنے نئے سفر کا آغاز کیا تھا۔ شرفو کی بے بسی کی مثال ملاحظہ ہو:

"شر فو کا جی چاہا وہ دوڑ کر حمیدے سے لپٹ جاتے اور رو رو کر کہے "اُٹھ حمیدے، اپنے گاؤں لوٹ چلیں۔ ہم وہاں ہل چلائیں گے، فصلیں کاٹیں گے، محنت مزدوری کریں گے۔"۶۹

صادق حسین کا افسانہ "انسان" کا مرکزی کردار "منگو" ہے۔ جس کے گرد افسانے کی پوری کہانی گردش کرتی ہے۔ جو مہذب معاشرے کے اندر غربت وافلاس کے ہاتھوں شکست کھایا ہوا۔ ایک ٹھکرایا ہوا شخص ہے۔ بنیادی طور پر منگو کا کردار معصوم ہے جو بہت جلد ہی زمانے کی ستم ظریفیوں اور ناانصافیوں کی وجہ سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ اور وقت اور سماج کے ہاتھوں ہونے والی تذلیل اسکی شخصیت کو فنا کر کے اسے بے بس، مجبور اور سماجی طور پر ٹھکرائے ہوئے مظلوم کردار کی صورت میں سامنے لاتی ہے۔ یہاں پر بھی صادق حسین استحصالی معاشرے کی زبوں حالی پر نوحہ کناں ہیں۔

صادق حسین کردار نگاری کے فن سے بخوبی آشنا ہیں۔ ان کا ہر کردار حقیقی زندگی سے ابھرتا ہوا نظر آتا ہے اور کردار نگاری کرتے وقت وماحول ومعاشرت اور سماجی عناصر کے ساتھ ساتھ اپنے فکر و تخیل اور محسوسات کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔

منگو کا کردار بھی ہمارے سماج سے اٹھا ہے منگو کی نفسیاتی کشمکش کو صادق حسین نے جس انداز سے پیش کیا ہے وہ صادق حسین کی معاشرتی نبض شناسی اور نفسیاتی آگاہی کی عمدہ ترین دلیل پیش کرتا ہے۔ صادق حسین انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں اور گہرائیوں سے واقف ہیں اور اس کا اظہار اپنی تحریروں میں جابجا کرتے ہیں۔ سید احتشام حسین صادق حسین کی کردار نگاری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"افسانے کو پر اثر بنانے کے لیے وہ کسی قسم کے اینچ پینچ یا واقعاتی کرتب سے کام نہیں لیتے۔ کرداروں کو اپنی اور اپنے ماحول کی نفسیات کے ساتھ واقعات کا جزو بنا دیتے ہیں۔ اسکا نتیجہ ہوتا ہے ایک خوبصورت تازہ کار اور ذہن پر نقش چھوڑ دینے والا دل آویز افسانہ"۷۰

"منگو" غریب طبقے سے تعلق رکھتا ہے زمانے کی ناانصافیاں اسکی شخصیت کی مسخ کر دیتی ہیں اور وہ اپنے آپ کو انسانوں سے کم تر کوئی دوسری مخلوق تصور کرتا ہے۔ بچپن میں سوتیلی ماں کا سلوک اور بہیمانہ رویہ اسکی شخصیت کی توڑ پھوڑ کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے جب اس کی سوتیلی ماں اسے گرج کر کہتی ہے "اتنے لمبے لمبے بال پشو کے کانوں پر ہوتے ہیں۔ تم انسان نہیں جانور ہو۔"۷۱ اسی طرح بچپن میں اسکا باپ اسے ڈنگر کہہ کر پکارتا تھا۔ بچپن سے اسے اپنے جانوروں جیسے نام سنتے سنتے اسے واقعی محسوس ہونے لگا تھا کہ "وہ سچ مچ اگر جانور نہیں تو دوسرے انسانوں سے مختلف ضرور ہے۔"۷۲ والدین کے انتقال کے بعد معاشرے کے باقی افراد اُسے مختلف جانوروں والے ناموں سے پکارتے ہیں۔ اور صرف اس وجہ سے تحقیر آمیز رویے کا اظہار کرتے ہیں کہ اس کے پاس روپیہ پیسہ نہیں اور وہ گندے اور میلے

کو پیلے حلیے میں نظر آتا ہے۔ سماجی سطح پر ٹھکرائے جانے کی وجہ سے اس کی ناموس اور غیرت کے ساتھ ساتھ خودداری بھی خاک میں مل جاتی ہے۔ حالانکہ ابتداء میں وہ ایک خوددار اور معصوم کردار کی صورت میں نظر آتا ہے۔

سنگاپوری خان نے جب پہلی مرتبہ سے "ابے! او کتے! کہہ کر پکارا تو منگو کی شخصیت کو زبردست دھچکا لگا تھا اور یکدم اس کی حیرت و حمیت جاگ جاتی ہے اندر ہی اندر وہ اس رذیل طرزِ تخاطب پر تلملا اٹھتا ہے۔ اور بدلہ لینے کی ٹھان لیتا ہے لیکن معاشی بیڑیاں اسے خاموش رہنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔

"اس دن کالا مینڈھا دو قدم پیچھے ہٹ کر ٹکر مارنے پر تُل بیٹھا تھا۔ کالے سانپ نے پھن پھیلا لیا تھا۔ لیکن منگو منہ سے کچھ نہ بولا تھا۔ روٹی کپڑا، چارپائی اور بستر رہنے کے لیے ایک کوٹھڑی سب نے مل جل کر اس کے غصے اور اس کے وجود کے درمیان ایک حصار کھینچ دیا تھا۔ اس نے اپنی یاداشت کو دھکیل کر بہت پیچھے پھینک دیا تھا۔"[۳۱]

صادق حسین نے منگو کے کردار کے ذریعے معاشی سطح پر عدم استحکام کے شکار افراد کی مجبوریوں کی تصویر کشی عمدہ انداز میں پیش کی ہے۔ اور ساتھ احساس سے عاری انسانوں کو بڑا معنی خیز پیغام بھی دیا ہے کہ معاشرے میں ہر انسان کی اپنی عزت نفس ہوتی ہے۔ اور دوسروں کو ان کی عزت نفس کو مجروح کرنے کی قطعاً اجازت نہیں۔ اسی طرح کے سماجی رویے درحقیقت انسان کی شخصیت کو فنا کر دیتے ہیں اور معاشرے میں ذلت اور رسوائی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔

'منگو'' کے کردار کے ذریعے انسانی نفسیات کے پیچیدہ پہلوؤں اور گہرائیوں کو بھی کمال خوبی کے ساتھ صادق حسین نے سپردِ قلم کیا ہے۔

قصاب کی دکان کے تھڑے پر کتوں کے درمیان بیٹھنا اور تحکمانہ انداز میں ان پر رعب جھاڑنا، افسانے کے اختتام پر بارود کے گولوں کی بوچھاڑ پر منگو کا قہقہے لگانا اور کھل کھلا کر ہنسنا، ظاہری طور پر غیر معمولی اور نیم پاگل پنے کی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن درحقیقت اس کا یہ ردعمل اس کی شخصیت کی پیچیدگیوں کے پرت کھولتا ہے جس پر زمانے کی ستم ظریفیوں ناانصافیوں اور غیر منصفانہ رویوں نے گہری ضربیں لگا لگا کر اسے انسانوں سے بھی کم تر بنا دیا۔ معاشرے کے المناک حقائق کی تصویر کشی کر کے مہذب معاشرے پر صادق حسن نے گہرا طنز کیا ہے۔ جہاں غربت کو جرم سمجھا جاتا ہے اور جہاں روپیہ پیشہ مختلف طبقوں اور ذات پات کے نظام کی بنیاد ڈالتے ہیں۔ اور یہی سماجی تفاوت انسانی زندگیوں پر اس طرح اثر انداز ہوتا ہے کہ روٹی مہنگی اور انسان سستا ہو جاتا ہے۔ اور اس معاشرے میں غربت انسان کی خودداری پر ایسی ضربیں لگاتی ہے کہ انسان کی خودی مٹ جاتی ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو منگو کا کردار

مجبور اور بے بس کردار ہے۔ منگو کا کردار غیر فطری یا غیر انسانی نہیں بلکہ یہ صادق حسین کی بے پناہ قوتِ مشاہدہ کا نتیجہ ہے اور اُن کے عمیق سماجی مطالعے کا ترجمان بھی ہے۔

صادق حسین کے دوسرے افسانوی مجموعے شہر اندر شہر کے نویں افسانے "کرموں" میں بیک وقت تین کردار نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ جن میں میر زمان یعنی ''میرا'' کا کردار مرکزی ہے۔اور کرم جان جس کے نام پر افسانے کا عنوان کرموں پڑااور تیسرا کردار میر زمان کی ماں یعنی ماسی جنتے ہے۔

"میر زمان" اس افسانے کا مرکزی کردار ہے سب پیار سے اسے ''میرا'' کہہ کر پکارتے ہیں خالص دیہاتی کردار ہے۔ میر زمان محنتی، جفاکش، دھن کا پکااور وعدوں کی پاسداری کرنے ولا کردار ہے۔ جو کسی بات کا فیصلہ کرلے تو اس پر قائم رہتا ہے اس نے کرم جان سے وعدہ کیا تھا کہ میں صرف تمھارے لیے دیارِ غیر کی خاک چھانوں گا اور وہ اس وعدے پر قائم رہتا ہے اور یہاں تک کہ اس کی محبوبہ شادی ہو جانے کے بعد بیوہ ہو کر میکے آجاتی ہے۔ میرا پانچ سال بعد لوٹتا ہے تو بھی اخلاص کا پیکر ہوتا ہے اس کے دل سے "کرموں" کی محبت ختم نہیں ہوتی اور وہ بیوہ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ میر زماں روایات کا پاسدار کردار بھی ہے اور اپنے بزرگوں کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں کا احترام کرتا ہے یہی وجہ ہے وہ دوسرے ملک جا کر بھی جب خط میں کرم جان کا ذکر کرنا چاہتا ہے لیکن مروت کے مارے ذکر نہیں کر سکتا۔

"میر زمان دل میں اٹھتی خواہش دبا کر، خط میں کرم جان کے متعلق کوئی بات نہ لکھواتا۔ وہ سوچتا کہ خط لکھنے ولا دل میں کیا کہے گا۔ اس کی ماں کے دل میں خیال آئے گا میر زمان بے شرم ہو گیا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے گاؤں میں اس بات کو برا سمجھا جاتا تھا کہ ایک کنوارا کسی کنواری کا نام اس طرح زبان پر لائے۔"[۴۷]

افسانہ کرموں کا دوسرا کردار "کرموں" یعنی کرم جان ایک خالص دیہاتی لڑکی ہے۔ جو اپنی محبت کو ماں کے فیصلے کے آگے قربان کر دیتی ہے۔اور سعادت مندی کا ثبوت دیتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو کرم جان کا کردار معصوم اور شرم و حیا کا پیکر ہے۔ لیکن ایک لحاظ سے کرموں کا کردار مجبور اور بے بس بھی نظر آتا ہے جب وہ نہ چاہا کر بھی ماں کے فیصلے کے آگے گھٹنے ٹیک دیتی ہے اور دوسرے دیہات کے رہائشی نوجوان سے شادی کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتی ہے۔ اور پھر شادی کے فوراً بعد بیوگی کی زندگی اور یتیمی کا احساس یہ دو باتیں ہی اسے مجبور اور بے بس ظاہر کرنے کے لیے کافی نہیں بلکہ ظالم سماج کی طرف سے ملنے والی ستم ظریفیہ یاں الگ۔ جب میر زمان کی ماں اس بات پر ناراضگی کا اظہار کرتی ہے کہ وہ بیوہ کرم جان سے اگر شادی کرلے گا تو میں اس بوٹیاں نہ نوچ لوں اس طرح کے رویے کرم جان کے دل کو چھلنی کرنے کے لیے کافی تھے اور وہ دل ہی دل میں اپنے پیاروں کے اس طرح کے روپ عیاں ہونے پر افسوس کرتی ہے۔

"ہر تیر کرم جان کے سینے میں لگا۔اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ماسی بھاگ بھری یہ تو کہہ رہی ہے۔اس نے ماسی بھاگ بھری کی طرف سے اس طرح دیکھا جیسے کوئی زخمی ہرنی شکاری کی طرف دیکھے۔"۵؎

ماسی بھاگ بھری رشتوں کی اہمیت سے آگاہ مگر سماجی روایات کو برقرار رکھنے والی خالص دیہاتی سوچ کی مالک خاتون ہے جسکی غیرت گوارا نہیں کرتی کہ اس کا بیٹا کسی بیوہ سے شادی کرلے بھلے وہ اس سے کتنی محبت ہی کیوں نہ کرتا ہو۔لہذا جب اُسے اپنے بیٹے کے عزائم سے آگاہی حاصل ہوتی ہے تو وہ اس پر شدید قسم کے رد عمل کا اظہار کرتی ہے۔

"بکواس بند کرو اس کی بوٹیاں نوچ نہ لوں تو کہنا اس گھر میں میرے اجازت کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔تو ایک بیوہ ہے۔میرا بیٹا کنوارہ ہے۔یہ ناممکن ہے میں یہ کبھی نہ ہونے دوں گی۔"۶؎

لیکن یکدم ہی ماسی بھاگ بھری کا دل موم ہو جاتا ہے اور وہ کچھ سوچنے کے بعد کرم جان کی اور میر زمان کی شادی کے لیے رضامندی ظاہر کر دیتی ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ بنیادی طور پر ماسی بھاگ بھری نرم دل کی مالک ہے لیکن معاشرتی مجبوریوں اور روایات کے آگے مجبوری کی وجہ سے وہ کوئی خاص فیصلہ نہیں لے سکتی۔اُسے اس بات کا خوف ہوتا ہے کہ گاؤں والے اس وجہ سے طرح طرح کی باتیں بنائیں گے کہ اس نے اپنے کنوارے بیٹے کی شادی ایک بیوہ سے کر دی ہے۔کیونکہ دیہاتوں میں ایسی باتوں کو معیوب گردانا جاتا ہے۔

افسانہ "آخری گاؤں" میں بظاہر تو کوئی مرکزی کردار نظر نہیں آتا لیکن چھوٹے موٹے ضمنی کرداروں کا ذکر کر کے صادق حسن افسانے کی فضا بنانے میں کامیاب رہے ہیں۔اس افسانے میں اگر "گیتوں کے شکاری" کو مرکزی کردار کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔کیونکہ پوری کہانی اسی کردار کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔غائبانہ کردار کی صورت میں صادق حسین نے کردار کو بہت خوبصورتی سے جگہ دے کر قاری کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔"گیتوں کا شکاری" جسے بعد میں گیتوں کا محافظ کے نام سے لوگ پکارتے ہیں۔ایک انقلابی کردار کی صورت میں صادق حسین نے اس کا نقشہ کھینچا ہے۔جو ایک کتاب لکھنے کی غرض سے گاؤں گاؤں جاتا ہے اور وہاں کے ثقافتی ورثے سے متعلق معلومات حاصل کرتا ہے۔تو اپنے اخلاص اور رویے سے گاؤں والوں کو بہت متاثر کرتا ہے۔اس کے علاوہ وہ اُن کی سوچ میں تبدیلی لانے کا باعث بنتا ہے۔اور انھیں بہت ساری باتوں کا شعور دلاتا ہے کہ دیہاتی معمول کے مطابق زندگی تو گزار رہے ہوتے ہیں لیکن آگہی کے خلاء کی وجہ سے وہ بہت ساری چیزیں جو ان کے ارد گرد ماحول میں موجود ہوتی ہیں اسے محسوس کرنے سے عاری ہوتے ہیں۔"گیتوں کا شکاری" آخری گاؤں کے لوگوں میں موجود نہ ہو کر بھی اُن میں احساسات کے وہ چراغ روشن کر دیتا ہے کہ بنا دیکھے گاؤں کے لوگ اس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں اور دل ہی دل میں اس کے شکر گزار بھی۔اور اس طرح وہ دوسرے گاؤں کے لوگوں میں اجتماعی شعور کو بیدار کر کے اُن کے دلوں میں گھر کر جاتا ہے۔

"تو نے درانتی کے گیت سنے ہیں؟ نمبر دار کی بیٹی نے سرو قامت جٹی سے کہا۔

"ہاں"

سچ مچ ہمارے ارد گرد گیت بکھرے ہوئے ہیں۔

"تم ٹھیک کہتی ہو۔"

ہمیں یہ احساس دیا کس نے۔؟

"گیتوں کے شکاری نے۔۔۔۔"

"وہ جسے ہم نے ابھی تک دیکھا بھی نہیں"۷۷

گیتوں کا شکاری فطرت سے لگاؤ کے جذبات کو دیہاتیوں میں نہ صرف فروغ دینے کا باعث بنتا ہے بلکہ اُن کے ثقافتی ورثے سے متعلق معصوم دیہاتیوں کو آگہی فراہم کرتا ہے۔ لوگ گیتوں کے شکاری کے حوالے سے مختلف طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ جسے صادق حسین نے ضمنی کرداروں کی زبانی اس طرح بیان کیا ہے۔

گاؤں کی گوری چٹی لڑکی کے بقول "شہری بابو کی آنکھیں دمکتی رہتی ہیں۔"۷۸ پٹواری کی بیٹی شہری بابو کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح کرتی ہے۔ "میرا بابل کہتا ہے کہ اس کی باتیں سُن کر غصہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے"۷۹۔ ان تمام باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ گیتوں کا شکاری ایک مثالی کردار ہے جو اپنے رویے حسنِ اخلاق اور تعلیم کی وجہ سے گاؤں والوں کے دل جیت لیتا ہے۔

افسانہ "ایک رات میں" کا مرکزی کردار مہتاب یعنی تاباں ہے۔ مہتاب صابر و شاکر خاتون ہے جو ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنا جانتی ہے۔ شادی سے پہلے ہر طرح کی پریشانی سے آزاد اور بے فکری کی زندگی گزارتی ہے۔ لیکن شادی کے بعد ازدواجی زندگی اس کے لیے بہت ساری تبدیلیوں کا سامان لاتی ہے۔ عملی زندگی میں قدم رکھتے ہی اُسے بہت سی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ابتداء میں اس کے خاوند کے رویے میں تبدیلی آجاتی ہے تب اُسے اپنی سہلیوں کی کہی ہوئی باتیں یاد آتی ہیں کہ "مرد کی فطرت کا کچھ پتا نہیں چلتا کہ اُسے کل جو پسند تھا وہ آج بھی پسند ہوگا یا نہیں۔"۸۰ زندگی معمول کے مطابق گزر رہی ہوتی ہے کہ اچانک سے کسی معمولی بات پر اس کا خاوند اس سے جھگڑ پڑتا ہے۔ اور اُسے میکے بھیج دیتا ہے جبکہ بچہ اپنے پاس رکھ لیتا ہے۔ ماں باپ کے گھر آکر مہتاب کا سکون غارت ہو جاتا ہے وہ اپنے ننھے بچے کے لیے تڑپتی ہے۔ اُس کی راتوں کی نیند غائب ہو جاتی ہے لیکن وہ اپنی دلی کیفیت کو اپنے والدین پر عیاں نہیں ہونے دیتی اور چپکے چپکے آنسوؤں کو پی جاتی ہے۔ صرف اس وجہ سے کہ اس کے ماں باپ کو اس کے رونے کی وجہ سے تکلیف نہ ہو۔ اس وقت وہ جس کرب سے گزر رہی ہوتی ہے اسکا اندازہ کوئی اور نہیں لگا سکتا۔ صادق حسین نے مہتاب کی اس کرب انگیز کیفیت کو بہت خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔

"وہ چپ سادھے چارپائی پر پڑی کروٹ بدلنے سے بھی گریز کر رہی تھی تاکہ اگر اسکی ماں جاگ رہی ہو تو وہ یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ تاباں بے قرار ہے۔ وہ بے حس و حرکت پڑی تھی تاکہ بکائن کے پیڑ کی شاخوں اور پتوں کی پرچھائیاں بھی تسلیم کرلیں کہ وہ سو رہی ہے اور اسے کوئی دکھ نہیں۔" ۸۱؎

صادق حسین نے تاباں یعنی مہتاب کے کردار کو ذریعہ بنا کر عورت کی بے بسی کو اچھوتے پیرائے میں بیان کر کے ہم پر واضح کیا ہے کہ عورت بظاہر نازک مزاج معلوم ہوتی ہے لیکن اسکا حوصلہ اور قوت برداشت اُسے مردوں سے بھی منفرد بنا دیتا ہے۔ عورت ہر ظلم کو سہہ کر دوسروں سے اپنے غم کو چھپانے کا ہنر بھی جانتی ہے۔ چاہے اس کے لیے اُسے کتنی اذیت ہی کیوں نہ اٹھانی پڑے۔ تاباں پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتی ہے اس لیے کہ اس سے بچے کی جدائی برداشت نہیں ہوتی لیکن چاہنے کے باوجود ماں باپ کے دکھ کے خیال سے رونے سے خود کو روکتی ہے اور وہ ماں باپ کے علاوہ سب پر واضح کرنا چاہتی ہے کہ اُسے کوئی دکھ نہیں۔ "وہ بے حس و حرکت پڑی تھی تاکہ بکائن کے پیڑ کی شاخوں اور پتوں کی پرچھائیاں بھی تسلیم کرلیں کہ وہ سو رہی ہے اور اسے کوئی دکھ نہیں۔" ۸۲؎

صادق حسین نے ایک ہی کردار کے دو، رخوں کو بیان کر کے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے کہ انسان کا بچپن پر سکون ہوتا ہے دنیا و مافیہا کے غموں سے آزاد اور پاک ہوتا ہے۔ بچپن میں انسان کو ہر طرح کا تحفظ میسر ہوتا ہے جو اُسے نڈر اور بہادر بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے لیکن وہی بہادری اور خود اعتمادی کا زیور لیے جب کوئی لڑکی میکے کی دہلیز پار کر کے سسرال چلی جاتی ہے تو اُسے نئے سماج اور نئے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ وہاں اسکی تمام صلاحیتیں دب جاتی ہیں اور خاص کر ممتا کے جذبے کے آگے عورت کو اپنے نفس اور اپنی ذات کو مارنا پڑتا ہے تمام جذبات پر صرف ایک جذبہ حاوی ہو جاتا ہے اور وہ ہے ممتا کا جذبہ۔ تاباں اور ماہتاب کے درمیان ہونے والی جنگ میں بالآخر جیت مہتاب کی ہوتی ہے۔

صادق حسین نے ایک ہی کردار کے دو رخوں کی تکرار کو اس افسانے میں بیان کیا ہے تاباں مضبوط اور مستحکم ہے جبکہ مہتاب عدم تحفظ کا شکار اور بے بس کردار ہے جو حالات کی ستم ظریفیوں کے آگے مجبور ہوتی ہے۔ اسی لیے تاباں مہتاب سے وعدہ کرتی ہے کہ وہ اب کبھی چونڈہ نہیں جائے گی کیونکہ اس کے خاوند نے اسکی عزتِ نفس کو مجروح کر کے اُسے گھر سے نکالا تھا۔ لیکن مہتاب ممتا کے ہاتھوں مجبور ہے اور وہ تاباں سے وعدہ نہیں کر سکتی اور سب کچھ بھول بھال کر اپنے بچے کے لیے تڑپتی بلکتی سسرال پہنچ جاتی ہے۔

افسانے کے دوسرے حصے میں مہتاب بے باک اور نڈر ہو کر کسی بھی انجام کی پرواہ کئے بغیر توپ کے گولوں سے بچتی بچاتی ہنگامی حالات میں بھی سسرال اپنے بچے کو ملنے پہنچ جاتی ہے۔ کسی بہادر سپاہی کے مانند وہ توپوں کے

گولوں کی بوچھاڑ کی پرواہ کئے بغیر ماں تا کی پیاس بجھانے کے لیے نکل کھڑی ہوتی ہے۔اس حوالے سے دیکھا جائے تو مہتاب کا کردار بہادر کردار ہے۔

"گولہ باری ہو رہی تھی۔ چھتوں اور دیواروں کے گرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔اُسے خیال آیا کہ ان حالات میں اُسے ڈرنا چاہیے۔یہ سوچ کر وہ ہنس پڑی اور اس کا جی چاہا کہ وہ زور زور سے قہقے لگائے۔اُسے زندگی میں پہلی بار محسوس ہوا تھا کہ موت کا ڈر کوئی شے نہیں۔"[۸۳]

صادق حسین مہتاب کے کردار کے ذریعے بتانے میں کامیاب رہے ہیں کہ عورت جب ماں بنتی ہے تو وہ بیٹی بہن اور بیوی کے روپ کو نوچ کر پھینک دیتی ہے۔اور صرف ماں کے روپ میں گرم گرم سانس لے کر ماں تا کو محسوس کرتی ہے اور ماں تا کو ہی سوچتی ہے۔اس کے تمام رویوں رنگوں اور رشتوں پر ماں کا روپ حاوی ہو جاتا ہے۔اور وہ خود کو صرف ماں کے روپ میں دیکھنے کو ترجیح دیتی ہے۔اور یہ ایک فطری عمل ہے۔

افسانہ درانتی کا گیت میں تین کردار نمایاں نظر آتے ہیں اور تینوں کردار ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں۔افسانے کا مرکزی کردار "اشرف" ہے جو وعدوں کا پاسدار ہونے کے ساتھ ساتھ قول کا صادق ہے۔اس کے علاوہ وہ رشتوں کی نزاکت کو سمجھنے والا ہے۔جو اپنے دوست کی وصیت کی تعمیل پوری جانثاری سے کرتا ہے۔اس کے دوست نے مرتے وقت اُسے وصیت کی تھی کہ میرے بعد میری بیوی کی حفاظت کرنا۔"اگر داراں اپنی مرضی سے دوسری شادی کرنا چاہے تو تم اپنے ہاتھوں سے اس کو رخصت کر دینا اور اس کی عزت کی رکھوالی اب تمھارے ذمے ہے۔"[۸۴] اشرف اپنے دوست کے ساتھ کئے گئے عہد کو نبھاتا ہے۔اور گاؤں میں کوئی بھی داراں کو میلی آنکھ سے دیکھے تو وہ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

جب گاؤں کا نمبردار شوشہ چھوڑتا ہے تو اشرف خان بہانے سے داراں کے گھر دودھ لینے کی لیے جاتا ہے اور یہ خبر اشرف کو پتا چلتی ہے تو وہ داراں سے رضامندی دریافت کرنے کے لیے آتا ہے کہ شاید داراں اعظم خان سے شادی کی خواشمند ہو۔ لیکن وہ داراں کی طرف سے نفی کا جواب پا کر اعظم خان کو لوگوں کے سامنے للکار کر تنبیہ کرتا ہے۔"اوئے اعظما! آئندہ تو نے داراں کے گھر قدم رکھا تو اسی درانتی سے تیرا پیٹ چاک کر دوں گا۔"اس طرح وہ اپنے دوست سے کئے گئے وعدے کو نبھاتا ہے اور ہر مشکل وقت میں داراں کا ساتھ دیتا ہے۔داراں کی رکھوالی اور تحفظ کے جرم کی پاداش میں اسے گاؤں والوں اور اعظم خان کی دل جلا دینے والی باتوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن وہ کسی چیز کی پروا نہیں کرتا۔کیونکہ وہ صرف جانتا ہے کہ حق کیا ہے۔یا پھر داراں اور اسکی بیوی فضلاں کے علاوہ گاؤں کے دو بزرگ اُن کے رشتے سے آگاہ ہوتے ہیں۔کہ داراں اور اشرف کا رشتہ کتنا پاکیزہ ہے۔اشرف کو اپنے وعدے کی

پاسداری کے عوض اعظم خان کی دشمنی ملتی ہے اور یہاں تک کہ اس عہد کو نبھاتے نبھاتے اس کا گھر بار اجڑ جاتا ہے اس کے مکان کو آگ لگ جاتی ہے اور وہ کوڑی کوڑی کا محتاج ہو کر محنت مزدوری کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

وفا شعاری کی اس سے عمدہ مثال ملنا ممکن نہیں۔ اس طرح اشرف محنتی، جفاکش، بہادر اور قول کے پکے کردار کی صورت میں افسانے میں جگہ بنانے میں کامیاب ہوا ہے۔

افسانے کا دوسرا مرکزی کردار داراں کا ہے جو گاؤں کے بہادر جوان اکبر کی بیوہ ہے۔ شادی کے کچھ عرصے بعد اس کا سہاگ اجڑ جاتا ہے اور کوئی نامعلوم انداز میں ایک رات اس کے خاوند کو موت کی نیند سلا دیتا ہے۔ داراں وفا شعار بیوی اور اپنے شوہر کی عزت کی امین ہونے ساتھ ساتھ بہادر اور نڈر کردار کی صورت میں افسانے میں دکھائی گئی ہے۔ اپنے خاوند کے نام پر بیوگی کی زندگی گزار کر وہ وفا شعار بیوی ہونے کا ثبوت دیتی ہے۔ اور آخر میں اپنے خاوند کے قاتل اعظم خان کے گھر اور فصلوں کو جلا کر انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرتی ہے۔

عورت ہو کر وہ بے باکی سے اعظم خان کے گھر کو جلا دیتی ہے۔

"داراں دیے کی لو کی طرف پشت کر کے زمین پر بیٹھی ہانپ رہی تھی۔ اس کے سر کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھوں سے خون ابل رہا تھا۔ چہرے سے پسینے کی بوندیں ٹپ ٹپ کر رہی تھیں۔ دیوار پر اس کا سایہ لمبا ہو کر چھت کو چھو رہا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ کی گرفت ابھی تک ڈھیلی نہ پڑی تھی۔ اس کی سپید سپید انگلیوں نے ابھی تک ماچس کو تھام رکھا تھا۔"۸۵

افسانے کا تیسرا کردار اعظم خان کا ہے جو مغرور اور دولت مند اور طاقت کے نشے پر اترانے والے ظالم کردار کے روپ میں دکھایا گیا ہے۔ اعظم خان گاؤں کا سب سے مالدار شخص ہے جو ہر سال گندم کی فصل کی کٹائی کے لیے خاص اہتمام کرتا ہے۔ ڈھول کی تھاپ پر گاؤں کے غریب لوگوں سے فصل کٹوانے کا مقابلہ کرواتا ہے اور جیتنے والے کو انعامات سے نوازتا ہے۔ لیکن جتنا ہی یہ دولتمند ہوتا ہے اتنا ہی کم ظرف ہوتا ہے۔ جو اپنی دولت کے بل بوتے پر دوسروں کی عزتوں پر نہ صرف کیچڑ اچھالتا ہے بلکہ ظلم کی انتہا تک پہنچ کر "داراں" کے خاوند کو نہ صرف قتل کروا دیتا ہے بلکہ داراں کے خاوند اکبر کے دوست اشرف کو بھی تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کرتا ہے۔ اُسے زیر کرنے کے لیے ہر طرح کے حربے اپناتا ہے۔ کیونکہ وہ داراں کو شروع سے پسند کرتا ہے۔ لیکن داراں اپنے خاوند سے محبت کرتی ہے۔ یہ داراں کے خاوند کو قتل کروا دیتا ہے۔ اور بعد میں بہانے بہانے سے اس کے گھر جاتا ہے لیکن جب اشرف کو پتہ چلتا ہے تو وہ اسکا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ یوں اپنے دوست سے کئے گئے عہد کو پورا کرنے کے لیے اشرف اعظم خان سے دشمنی مول لے لیتا ہے۔ اعظم خان روایتی طاقتور اور صاحب حیثیت اور ظالم شخص ہے اور اکبر کے بعد اس کے دوست اشرف کو بھی قتل کرنے کا متمنی ہوتا ہے لیکن شومئ قسمت اُس کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکتی۔

"چند ہی مہینے پہلے کی بات تھی کہ اعظم خان اشرف کو قتل کروانے کے منصوبے باندھ رہا تھا۔ مگر دھکڑانوالی میں کسی مائی کے لال کی جرات نہ تھی کہ اشرف کا مقابلہ کر سکے۔ اشرف جہاں جسم جثے میں اپنی مثال آپ تھا۔ وہاں دلیری اور بہادری میں بھی اسکا کوئی ثانی نہ تھا۔ چنانچہ قتل کا ارادہ ترک کر کے اعظم خان نے اشرف کو سونے اور چاندی کے جال میں پھانسنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔"۸۶؎

اس طرح اعظم خان سازشی، سفاک اور ظالم مغرور شخص ہے جسے اپنی دولت پر نہ صرف غرور ہوتا ہے بلکہ وہ ہر شے کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے یہاں تک کہ وہ گاؤں کی عورت کی عزت کو میلی نگاہ سے دیکھتا ہے اور دوسروں کی مجبوریوں کو خریدتا ہے۔ روپے پیسے اور زمینوں کی بہتات اسے سرکش اور مغرور بنادیتی ہے اور وہ سینہ تان کر علاقے میں چلتا ہے فصل کی کٹائی کے موقع پر جب وہ خاص میلے کا اہتمام کرتا ہے تو بہت سے لوگ اس پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور کچھ لوگ اسے حسرت اور رشک بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں تو اس کا سینہ اور چوڑا ہو جاتا ہے۔

"ہر سال ایک دنیا اس کی فصلوں کی کٹائی دیکھنے آتی تھی۔ یہ رونق، یہ گہما گہمی اسی کے دم خم سے تھی یہ سوچتے ہوئے اعظم خان نے محسوس کیا کہ وہ ان گنت نگاہوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اس خیال سے اس کا سینہ اور پھیل گیا اور اسکی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔"۸۷؎

المختصر اعظم خان کا کردار ظالم، خود مختار اور سفاک انسان کا کردار ہے۔ جو استحصالی معاشرے کی نمائندگی کرتا ہے۔

افسانہ " پتھر اور سائے "میں کوئی مرکزی کردار دیکھنے کو نہیں ملتا اس افسانہ میں انہوں نے چھوٹے موٹے ضمنی کرداروں کے ذریعے افسانے کی فضا اور ماحول کی تخلیق کر کے اپنے مطمع نظر کا اظہار جاندار انداز میں کیا ہے۔ بنگال کے ساحلوں کے قریب رہنے والے غربت اور مفلسی کے جال میں لپٹے ہوئے ضمنی کرداروں میں زینب بانو، فاطمہ ،صورتی، چھمیا اور نوری جیسی خواتین کا ذکر کر کے اُن کی مجبوریوں تمناؤں اور رہنے سہنے کے طریقوں کو بیان کیا گیا ہے اور قاری کو سوچنے پر مجبور کیا ہے کہ مفلسی کے سبب پیدا ہونے والے مسائل اور دیگر مجبوریوں کے باعث پیدا ہونے والی کش مکش کا اثر ان افراد کی زندگیوں پر بالواسطہ اور بلاواسطہ دونوں طرح سے پڑتا ہے۔ اپنے ضمنی کرداروں کو تسلسل کے ساتھ بیان کر کے انھوں نے کہانی کے ماحول اور ذریعہ معاش جیسی سماجی حقیقت کو بیان کیا ہے۔

"گزشتہ دن کے پاؤں کے نقوش مٹا کر سیپیاں اور پتھر یہاں وہاں بکھیر کر، جب سمند کے سفید سفید جھاگ الٹے پاؤں دوڑتے ہوئے نیلگوں پانی سے جا ملتے تو کاکس بازار میں رہنے والی مزدورنیں بانس کی جھونپڑیوں سے باہر نکل، ٹوکریاں ہاتھوں میں لے خلیج بنگال کے کنارے جا پہنچیں۔ ان مزدورانیوں کی ٹولیوں کو دیکھ کر سرخ سرخ کیکڑے دور بھاگ جاتے۔"۸۸؎

تمام کردار محنتی، جفاکش اور غربت کے ہاتھوں شکستہ کھائے مجبور کردار ہیں جن کی مدد سے افسانے کی فضاء بنانے میں صادق حسین کامیاب ہوئے ہیں۔

صادق حسین کے تیسرے افسانوی مجموعہ ''گلاب کے آنسو''میں
سماجی شعور بحوالہ کردار

صادق حسین کے افسانوی کردار حقیقی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو گوشت پوست کے انسان ہیں اور انسانی عادات واطوار کے مطابق چلتے پھرتے اور سانس لیتے دکھائی دیتے ہیں۔آپ کے کردار باغیانہ اور روایات سے انحراف کرنے والے نہیں بلکہ مثبت سوچ رکھنے والے باعمل کردار ہیں۔ جو صرف اور صرف خیر کا پیغام دیتے ہیں۔خواہ ان کا تعلق کسی بھی طبقے سے کیوں نہ ہو وہ خود کو ہر طرح کے ماحول میں ڈھالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔صادق حسین کے پہلے دو افسانوی مجموعوں کی طرح ان کے تیسرے افسانوی مجموعے " گلاب کے آنسو "کے کردار بھی مثبت سوچ کی عکاسی کرتے ہیں۔اس افسانوی مجموعے میں بھی انھوں نے اپنے کرداروں کے ذریعے معاشرتی ناہمواریوں اور بہت سے سماجی مسائل کو بیان کیا ہے۔اس کے علاوہ روزمرہ کے معمولاتِ زندگی کو بیان کر کے آپ نے حقیقت پسند افسانہ نگار ہونے کا ثبوت پیش کیا ہے۔

افسانہ ''تیسری حویلی''صادق حسین کے افسانوی مجموعے" گلاب کے آنسو "کا مشہور افسانہ ہے۔اور بیک وقت مختلف ضمنی کرداروں کے ذریعے افسانے کی فضا بنانے میں کامیاب ہوا ہے۔اگر دیکھا جائے تو اس افسانے میں کوئی بھی کردار مرکزی کردار کی صورت میں نمایاں طور پر نظر نہیں آتا۔البتہ تمام کردار ضمنی کرداروں کی ذیل میں ضرور آتے ہیں۔درحقیقت ان چھوٹے ضمنی کرداروں کے ذریعے صادق حسین نے تیسری حویلی کے لوگوں کی ظاہری سماجی حالت سے روشناس کروایا ہے۔ان ذیلی کرداروں کا تیسری حویلی میں قیام اور عرصہ دراز تک مقیم رہنا جس میں ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے افراد شامل ہیں اور اُن کی مفلوک الحالی کو موضوع بنا کر صادق حسین نے عام لوگوں کے سماجی شعور کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔

''تیسری حویلی'' کے تمام کردار ذیلی کردار ہیں لیکن ان ذیلی کرداروں میں سب سے نمایاں کردار ملک الطاف کا ہے جو سیاستدان ہے۔اُسکی شخصیت کے دوغلے پن کے ذریعے صادق حسین نے پاکستان کے سیاسی رہنماؤں پر گہری چوٹ کی ہے۔ جو سادہ لوح عوام کو جال میں پھنسا کر انہیں اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتے ہیں۔الیکشن میں کامیابی کے بعد یہی لوگ عوام سے منہ پھیر لیتے ہیں،ملک الطاف بھی ایسا ہی شاطر اور چالاک کردار ہے جو بلدیہ کا الیکشن لڑتا ہے اور ''تیسری حویلی'' کے افراد ہی اُسے کامیاب کرواتے ہیں کیونکہ شاہ جی کی سفارش پر تیسری حویلی کی ساری ووٹیں اُسی کو ملی تھیں۔ مگر الیکشن جیتنے کے بعد اُس نے پلٹ کر تیسری حویلی کے مکینوں کی خبر تک نہ لی۔اب دوبارہ الیکشن میں

ووٹوں کے حصول کی غرض سے جب وہ لوٹتا ہے تو مکاری سے شاہ صاحب سے معافیاں مانگتا ہے۔ اور اپنے سر کی پگڑی اتار شاہ جی کے قدموں میں رکھ دیتا ہے۔ وہ یہ روپ صرف ووٹ حاصل کرنے کی غرض سے اختیار کرتا ہے۔ نتیجتاً، شاہ جی کا دل موم ہو جاتا ہے اور وہ اُسے معاف کر دیتے ہیں۔ لیکن اس دوران بھی ملک الطاف کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ اس کی دوغلی شخصیت کو نمایاں کر دیتی ہے۔ "کیمرے کی آنکھ نے ملک الطاف کی فاتحانہ مسکراہٹ، جانچ تول کر محفوظ کر لی۔"۸۹ صادق حسین نے ملک الطاف کے کردار کے ذریعے واضح کیا ہے کہ ملکی سیاستدان اپنے مفادات کی غرض سے پستی کی انتہاؤں تک پہنچ جانے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ انھیں عوام کی فلاح و بہبود سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ ملک الطاف کا کردار دوغلا اور فراڈی کردار ہونے کے ساتھ ساتھ مغرور کردار ہے جو تیسری حویلی کے لوگوں کو کیڑے مکوڑے سمجھتا ہے۔ اور اس بات کا برملا اظہار وہ اپنی تقریر میں بھی کر دیتا ہے۔ "ملک الطاف نے کہا: کتنے دکھ کی بات ہے کہ آپ کیڑے مکوڑوں کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں۔"۹۰ ملک الطاف کی شخصیت بتاتی ہے کہ سیاسی حکمران عوام کے جذبات سے کھیل کر اپنا مقام حاصل کرتے ہیں۔ اور کیسے غریب لوگوں کے جذبات سے کھیل کر اپنے مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

افسانہ "روپ ونتی" کا مرکزی کردار "روپ ونتی" ہے جو ہندی معاشرے سے تعلق رکھنے والے رومانوی کردار کی صورت میں دکھائی گئی ہے۔ روپ ونتی محبت میں سچائی کا ثبوت پاگل ہو کر دیتی ہے۔ درحقیقت روپ ونتی معصوم اور وفا شعار نو عمر لڑکی ہے۔ جسے زمانے کے ستم اور اپنوں کی جدائی نے ذہنی طور پر مفلوج بنا دیا ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو وہ ایک نرم دل اور حساس کردار کی شکل میں دکھائی گئی ہے۔ "روپ ونتی" مغربی بنگال کے ہندو گھرانے کی نو عمر لڑکی جو اجنبی کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ روایت کے مطابق ظالم سماج کو جب اس بات کی خبر ہوتی ہے تو وہ لوگوں کے طعنوں اور رنگ برنگے الزامات کی زد میں آ جاتی ہے۔ اور معاشرے کے منفی رویے اُسے تباہی کے اس دہانے پر لا کھڑا کرتے ہیں کہ وہ اپنے حواس کھو بیٹھتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی محبت "پریتم" کو بھی پہچاننے سے انکار کر دیتی ہے۔ افسانے میں روپ ونتی کے جذبۂ عشق کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب اُس کے ننھیالی گاؤں سے تعلق رکھنے والی عورت اس کے بانسری بجانے والے پریتم کے بارے میں تحقیر آمیز جملے بولتی ہے تو روپ ونتی سے برداشت نہیں ہوتا اور وہ جذبات کی شدت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس عورت پر ٹوٹ پڑتی ہے۔

> "روپ ونتی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اس عورت کی چوٹی پکڑ دھر کے کھینچی۔ اسے پیٹھ کے بل گرا کر اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھی اور بولی۔ میں تیری جیبھ کھینچ لوں گی۔ اس کے سر کے بال نوچ ڈالے۔ اس کی باچھیں پکڑا تنے زور سے کھینچیں کہ لہو نکل آیا۔"۹۱

بحثیت مجموعی روپ وتی کا کردار وفاشعار اور مثبت کردار ہے۔ جس کے المیہ انجام پر قاری کے دل میں عجب سی چبھن اور کسک باقی رہ جاتی ہے۔ اور یوں روپ وتی کا کردار قاری کی تمام تر ہمدردیاں سمیٹنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

افسانہ "قیدی" میں "شیرو" کا کردار نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والا شہری کردار ہے۔ جو غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایسے افراد کے ہتھے چڑھ جاتا ہے جو غیر قانونی تنظیم کے سرگرم رکن ہوتے ہیں۔ اس طرح مخصوص گروہ کا اسیر اور پابند ہو جاتا ہے اور پابندیوں میں اسیری کے ساتھ ساتھ دوسروں کے لیے اپنا کام نکلوانے کا ذریعہ بھی بن جاتا ہے۔ افسانے میں اسکی حیثیت زرخرید غلام کی سی ہے جسے اپنی مرضی یا پسند سے کچھ بھی نہیں کرنے دیا جاتا۔ وہ ہر معاملے میں دوسروں کا پابند ہو جاتا ہے۔ اس طرح غالب قوتیں اسے مغلوب بنا کر اپنی مرضی کے کام لیتی ہیں۔ جس زندگی میں انسان کی اپنی مرضی کا عمل دخل شامل نہ ہو وہ دروغ گوئی کے سوا کچھ نہیں۔ ایسے میں کمزور کو آزادی کا احساس اول تو ملنا دشوار ہوتا ہے لیکن اگر ایسا تصور بھی مل جائے تو اسے یہ احساس جھوٹ لگنے لگتا ہے۔ "شیرو" کا کردار بے بس اور مجبور کردار ہے۔ وہ اپنے احساسات کے ہاتھوں مجبور ہے لیکن پارٹی کے اراکین سے براہ راست بدلہ لینے سے قاصر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اسکی بیوی مریم اُس سے اپنے نومولود بچے کے نام کے بارے میں پوچھتی ہے کہ اس کا کیا نام رکھنا ہے تو شیرو اسے کہتا ہے کہ بچے کا نام "قیدی" رکھنا۔ افسانے کے اختتامی حصے میں اُسکی بے بسی اور لاچاری محسوس کی جاسکتی ہے۔ جب وہ اپنی بیوی کو اپنے پیرو مرشد کے حوالے سے بتاتا ہے کہ ہمارا مرشد کہتا ہے کہ جیل کے اندر اور باہر ہم سب قیدی ہیں۔ اسی لیے وہ اپنی بیگم کو کہتا ہے۔ "ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم سب اپنے بچوں کا نام قیدی رکھیں گے تاکہ ایک کا نام پکارو تو سب پلٹ کر دیکھیں۔"[۹۲] یہاں بالواسطہ طور پر شیرو اپنی بے بسی کا اظہار بھی کر دیتا ہے۔ کیونکہ ایسے لوگ جو کسی تنظیم کے گروہ کا حصہ بن جائیں ان کی آزادی سلب ہو جاتی ہے چاہے وہ جیل کی سلاخوں میں ہوں یا باہر کی آزاد فضا میں ان کی حیثیت میں کمی نہیں آتی کیونکہ وہ حکم کے پابند ہوتے ہیں۔ اور ایسے لوگ جن کی مجبوریاں پیسے کے عوض خرید لی جائیں وہ کبھی آزاد نہیں ہو سکتے۔ اور خاص کر معاشرے کی وہ افراد جو غلط قسم کی تنظیموں کے رکن بن جائیں ان پر عرصہ حیات تنگ کر دیا جاتا ہے۔ کیونکہ ایک بار جو اس پارٹی کا حصہ بن گیا وہ مرتے دم تک اس پارٹی کا رکن رہے گا ورنہ پارٹی چھوڑنے والوں کی سزا موت سے کم نہیں ہوتی۔ شیرو بھی سائیں مراد کی پارٹی میں شامل ہو جانے کے بعد پچھتاتا ہے اور اپنی بیوی سے اپنی مجبوری بیان کرتا ہے کہ اب اس تنظیم کو چھوڑنا اس کے لیے ممکن نہیں کیونکہ "پارٹی چھوڑنے والے شخص کو سائیں مراد غدار کہتا ہے اور غدار کو وہ قتل کروا دیتا ہے۔" "شیرو" جیسے کردار ہمارے معاشرے میں بکھرے نظر آتے ہیں۔ جن کی مجبوریوں سے غالب قوتیں فائدہ اُٹھا کر انہیں اپنے گھناؤنے عزائم کو پورا کرنے کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ صادق حسین نے شیرو کے کردار کے ذریعے

ایسے افلاس زدہ معاشرے کی تصویر کشی بہت منفرد انداز میں کی ہے جہاں غربت ایک جرم عظیم سے کم حیثیت نہیں رکھتی۔ جہاں سادہ لوح اور مجبور لوگوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر لوگ انہیں اپنے ہتھکنڈوں کے لئے استعمال کرتے ہیں اور روپے پیسے کا لالچ دے کر ہمیشہ کے لیے انھیں اپنا غلام بنا لیتے ہیں۔ افسانے کے اختتامی حصے میں شیرو کی اپنی شریکِ سفر سے ہونے والی گفتگو اس کی داخلی کیفیات کی ترجمانی کرتی ہے۔"اور پھر ایک دن قیدیوں کی یہ نسل ہتھکڑیاں اور بیڑیاں کاٹ کر بھوک اور افلاس کے خلاف فیصلہ کن جنگ لڑے گی۔"المختصر" شیرو" دوہری اذیت کا گرفتار مسافر ہے۔اور معاشرے کا لاچار شخص ہے جو غربت کے ہاتھوں بکنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

افسانہ "قیدی" میں ایک اور اہم کردار بھی قاری کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر دیتا ہے اور وہ مرکزی کردار نہیں بلکہ ذیلی کرداروں کی صف میں شامل ہے "ماسی شرفو" کا کردار عموماً ہر گلی محلے میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ خاص کر نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی بستیوں اور کالونیوں میں ایسے کردار چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔"ماسی شرفو" کے کردار کے ذریعے صادق حسین سماجی بندھنوں کو واضح کرنا چاہتے ہیں کیونکہ ایسے چلتے پھرتے کردار بھی سماجی سطح پر بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ جیسے ماسی شرفو پورے محلے کے گھرانوں کی نہ صرف خبر رکھتی ہے بلکہ وہ خیر خواہ بھی ہے جو دوسروں کو اچھے مشورے دے کر اُن کی ڈھارس بندھاتی ہے۔اور مشکل وقت میں دوسروں کے کام بھی آتی ہے۔افسانے میں شیرو کی بیوی جب احساس تنہائی سے دوچار ہوتی ہے تو ماسی شرفو اُسے تسلیاں دیتی ہے اس کے علاوہ اس کے گھریلو کاموں جیسے سودا سلف وغیرہ لانے کے لیے ماسی شرفو کے پوتے مریم کی مدد کے لیے ہر وقت تیار ہوتے ہیں۔

ماسی شرفو مریم کو پند و نصیحت بھی کرتی ہے اور آنے والے وقت اور حالات سے متعلق اُسے آگاہی بھی دیتی ہے۔ کہ وقت اور زمانہ نازک ہے۔ لہذا اپنے بچاؤ اور دفاع کا انتظام بھی حسب ضرورت کرتے رہنا چاہیے۔ ماسی شرفو معاشرتی حالات سے متعلق بھی مریم کو باخبر رکھتی ہے اور اُسے اپنے دفاع کے لیے مناسب تدابیر اختیار کرنے کے مشورے بھی دیتی ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو ماسی شرفو ایک بہترین خیر خواہ اور فرض شناس کردار کی صورت میں نظر آتی ہے۔"دیکھو بیٹی، آج کل زمانہ بہت خراب ہے۔ چور ڈاکو کھلے بندوں پھرتے ہیں۔ دروازے بند رکھو۔"

"ماسی شرفو" جیسے کردار کی موجودگی مساوات اور بھائی چارے کا عمدہ نمونہ ہے اور معاشرے میں ایسے کرداروں کی موجودگی مشترکہ معاشرتی نظام کی اصلاح، فلاح اور بہتری کے لیے لازم اور اہم ہے۔

افسانہ "ہیلن آف ٹرائے" کی پوری کہانی کا مرکزی کردار "روبی" ہے جو اونچے طبقے سے تعلق رکھنے والی مغرور اور تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔ جسے اپنے حسن پہ ناز ہے۔اور قدیم تہذیب سے تعلق رکھنے والی ملکۂ حسن،"ہیلن" کی

شخصیت واحوال پر ڈاکٹریٹ کی سطح کا تحقیقی مقالہ لکھتی ہے۔ ہیلن کے کردار کے سحر میں وہ اس حد تک گم ہو جاتی ہے کہ وہ حقیقی زندگی میں خود کو ہیلن آف ٹرائے سمجھنا شروع ہو جاتی ہے۔اس حوالے سے دیکھا جائے تو روبی کا کردار غیر حقیقت پسندانہ اور خیالیکردار ہے جو حقیقی دنیا سے دور اپنے لیے خیالی شہزادے کی تلاش میں گم ہوتی ہے۔افسانے میں روبی کا بار بار خود کو ہیلن آف ٹرالے کہلوانا تکبر کو ظاہر کرتا ہے اور بعض اوقاتِ غیر معمولی اور افسانوی کردار بھی ۔"اس کتابی ہیلن نے روبی کا ادراک ایسا اپنے قبضے میں لیا ہے کہ اب وہ ہیلن کی آنکھ سے دیکھنا چاہتی ہے۔ ہیلن کی زبان سے بات کرنا چاہتی ہے۔"۹۳

اگر کوئی غریب یا پسماندہ طبقے کی لڑکی یوں بار بار خود کو ہیلن آف ٹرائے ظاہر کرتی تو لوگ اُسے یقیناً پاگل سمجھتے۔ لیکن یہاں پر طبقاتی تفاوت نمایاں ہوتا نظر آتا ہے۔روبی الیٹ کلاس سے تعلق رکھنے والی تعلیم یافتہ اور خوبصورت لڑکی ہے۔ وہ اپنے حُسن سے آگاہ ہے اور اس کو یہ آگہی اُس کے قریبی رشتہ داروں ،والدین اور دوستوں نے دلائی۔" روبی کی سہلیاں بھی نہایت خلوص سے کہا کرتی تھیں ،روبی تم تو ہیلن آف ٹرائے ہو۔"۹۴ ایک دن روبی کی ماں اور اس کی دوست ڈاکٹر شمائلہ میں بھی روبی کے رویے کے حوالے سے بحث شروع ہوتی ہے تو اس کا نتیجہ بھی یہی نکلتا ہے کہ روبی کے اس مغرور اور اکھڑ رویے کے ذمہ دار بھی اس کے اپنے ہیں۔ ہیلن کا کردار رومانوی کردار کی شکل میں اس وقت ابھر کر سامنے آتا ہے جب وہ اُس نوجوان کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔"اس نے اپنا سر شہزادے کے سینے پر رکھ دیا۔اس طرح جیسے سورج کی پہلی کرن سے شرما کر شبنم کے ایک دھڑکتے ہوئے موتی نے پھول کی پتیوں کی چادر اوڑھ لی ہو۔"۹۵

روبی یعنی ہیلن آف ٹرائے کا کردار مغرور اور خود مختار کردار ہے جو اپنی سلطنت میں ہر ایک کی مداخلت کو (اپنی مرضی کے خلاف) پسند نہیں کرتی۔

> "مسٹر ندیم!آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔آپ لوگوں کو اس کے سوا آتا ہی کیا ہے۔ مگر یاد رکھئے میں ہیلن آف ٹرائے ہوں۔ ہیلن کے لیے دس سال تک جنگ لڑی گئی تھی۔ ہیلن کو لے جانے والا شہزادہ پیرس بہادر تھا۔"۹۶

اس حوالے سے ہیلن یعنی روبی کا کردار اپنی نوعیت کا منفرد کردار ہے۔اور اعلی طبقے کی سماجی روایات کا عکاس بھی۔

صادق حسین کے افسانوی کردار جیتے جاگتے کردار ہیں جو ہمارے معاشرے کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ان کے کردار مثالی اور اخلاقی لحاظ سے مضبوط کردار ہیں جن کے اندر کا انسان ابھی مرا نہیں زمانے کی ستم ظریفیوں اور وقت کی بے رحمیوں کے باوجود پر عزم اور حوصلے والے کردار ہیں۔اُن کے کرداروں میں جذبات کی سچائی واضح طور پر

دیکھی اور محسوس کی جاسکتی ہے۔ صادق حسین کے کردار زندہ جاوید کردار ہیں۔ وہ انسانی گہرائیوں سے واقفیت رکھتے ہیں۔ اور انسانی نفسیات کو باریکیوں سے پہچاننے میں مہارت رکھتے ہیں۔ اُن کے کردار دھندلے یا مبہم کردار نہیں بلکہ واضح اور فعال کردار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ معاصر افسانہ نگاروں میں کردار نگاری کی وجہ سے منفرد مقام بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

افسانہ "ثانی انکل" میں ثانی انکل کا کردار اونچے طبقے کی نمائندگی کرنے والا مثبت اور حق شناس کردار ہے۔ اور جذبات میں سچا اور وفا شعار بھی جو اپنی بیوی سے مرنے کے بعد بھی وفا نبھاتا ہے اور اپنے دل سے اسکی حکمرانی کو جانے نہیں دیتا۔ قدم قدم پر اُسے اپنی کی باتیں اور اُس کے ساتھ گزرا ہوا وقت یاد آتا ہے۔ افسانے میں جب ننھا بچہ نوی اُس کے کھلے ہوئے تسموں کی طرف اشارہ کرتا ہے تو اُسے فہمیدہ بیگم کی باتیں یاد آتی ہیں۔ اسکی ازدواجی زندگی میں کبھی ایسا دن نہیں آیا تھا یا ایسا کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا تھا کہ اس کے جوتوں کے تسمے کھلے رہ گئے ہوں یا قمیض کا بٹن ٹوٹا ہوا اور اُسے اسکی خبر نہ ہوئی ہو۔ کیونکہ اس کی سگھڑ بیوی اُس کے تمام کام کر دیا کرتی تھی اور اسکی ایک ایک چیز کا خیال رکھا کرتی تھی۔

"فہمیدہ بیگم کی یاد تحت الشعور کی حدیں پھلانگ کر جیتے جاگتے شعور کی راہوں پر سفر کرنے لگی۔ اس کی ازدواجی زندگی میں ایسا واقعہ کبھی نہیں آیا تھا کہ وہ گھر سے باہر نکلا ہو اور اس کے جوتے کے تسمے کھلے رہ گئے ہوں۔ فہمیدہ بیگم تو خود اپنے ہاتھوں سے اسکی قمیض دھوتی استری کرتی، قمیض کا بٹن ٹوٹ جاتا تو اس کی جگہ نیا بٹن ٹانک دیتی۔ وقت پر اس کے گرم سوٹوں کی خشک شوئی کرا لیتی۔ احتجاج کے باوجود جوتے پالش کر دیتی۔ وہ باہر جانے لگتا تو ایک ہی نگاہ میں بھول چوک پکڑ لیتی۔ "۹۷

ثانی انکل وفا شعار ہونے کے ساتھ ساتھ صابر و شاکر شخص بھی ہے جو بہت سی محرومیوں کے باوجود خوشی خوشی زندگی گزارتا ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو وہ زندہ دل کردار ہے اور ہم پر واضح تاثر چھوڑتا ہے کہ زندگی زندہ دلی کا نام ہے مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں۔ اولاد کی نعمت سے محرومی کو ثانی انکل نے کبھی خود پر طاری نہیں کیا۔ بلکہ وہ خدا کی رضا کے مطابق اپنی رضا کو ڈھالنے میں ہی مصلحت سمجھتا ہے اور اولاد کی محرومی پر جب کبھی فہمیدہ بیگم دلگرفتہ اور مایوس ہوتی تو یہ اُس کی ڈھارس بندھاتا اور زندگی کے تلخ حقائق سے روشناس کرواتا۔

"دیکھو بیگم! اس نے کہا: ''ہر بات میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ اولاد نالائق ہو تو زندگی وبال ہو جاتی ہے بچہ اپاہج ہو تو ماں باپ جیتے جی مر جاتے ہیں اس لیے ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ "۹۸

"ثانی انکل" اپنی محرومیوں کو دبا کر خوشی خوشی خدا کی رضا میں راضی رہنے والا شخص ہے۔ اور اپنی محرومیوں کو چھپا کر دوسروں میں گھل مل جانے والا شخص ہے۔ جو اپنے اخلاق سے دوسروں کو متاثر کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ اپنے

علاقے کا ہر فرد نہ صرف اُسے پہچانتا ہے بلکہ اُسکی عزت کرتا ہے۔ بوڑھے جوان، بچے، خواتین، ملازم سب اُس کی قدر کرتے ہیں اس کا احترام کرتے ہیں۔ وہ ہر دلعزیز کردار اور بچوں میں ''ٹافی انکل'' کے نام سے مشہور ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اس کا اصل نام تاجدار ہے۔ ٹافی انکل جذبات کا سچا اور کھرا انسان ہے۔ جو بیوی سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ ماضی پرستی میں گم رہنا اور حسین یادوں کے سہارے زندہ رہنے میں پر سکون رہتا ہے۔

"ٹافی انکل" کے کردار کو دیکھ کر بلاشبہ انسان یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ زندہ دل انسان ہونے کے ساتھ ساتھ مضبوط انسان بھی ہیں جو کم حوصلہ لوگوں کو جینے کا قرینہ سکھا جاتے ہیں۔ اور وقت کے تھپیڑوں کے آگے انسان کو گھٹنے ٹیکنے کی بجائے مصالحت پسندی کا درست دیتے ہیں اور زندگی کی اہمیت سے آگاہی دلا کر انسان پر واضح کرتے ہیں کہ زندگی اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ بہت بڑی نعمت ہے۔ جسے ہر حال میں انسان کو خوشی خوشی گزارنا چاہیے۔ ٹافی انکل ننھے بچے کی جان بچانے کی خاطر اپنی جان کی قربانی دے کر امر ہو جاتا ہے۔ اور قاری کی ہمدریاں سمیٹ کر اُسکی سوچوں کو نیا رخ دے جاتا ہے۔ ٹافی انکل کا کردار ہر طرح کے سماج سے جڑے افراد کے لیے ایک بڑا درس ہے جو زندگی سے مایوس اور محرومیوں پر واویلا مچا کر بے صبری اور ناشکری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ٹافی انکل کا کردار اُن لوگوں کے لیے بھی سبق ہے جو زندگی کے مصائب سے دلبرداشتہ ہو کر احساس محرومی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ "ٹافی انکل" مردہ روحوں میں تحریک پیدا کرنے والا مثبت کردار ہے جو لوگوں کو زندگی گزارنے کے اصولوں سے نہ صرف آشنائی دلاتا ہے بلکہ انسان کو پر عزم بنانے اور انھیں آگے بڑھنے کا حوصلہ بھی دیتا ہے۔ بلاشبہ صادق حسین نے اسے حساسیت کے اونچے پیمانے پر تخلیق کیا ہے اور اس کردار کے ذریعے جو کام وہ انسانی فلاح اور اصلاح کے حوالے سے لینا چاہتے ہیں اس میں سو فی صد کامیاب ہوئے ہیں۔

صادق حسین کی کردار نگاری خالصتاً اپنے ماحول، مٹی اور سماج سے نمو پاتی ہے اور مٹی میں پروان چڑھتی ہے۔ اُن کے تمام کردار بلاشبہ مشرقی روایات اور احساسات سے جنم لیتے ہیں۔

افسانہ "سپر پاور" میں سردار شیر افضل کا کردار ایسے افراد کی نمائندگی کرتا ہے جو طاقت کے نشے میں غرق ہو کر دوسروں پر اپنا رعب اور دبدبہ قائم رکھتے ہیں اور اپنی طاقت اور دولت کے بل بوتے پر دوسروں کو محکوم اور مغلوب بنا لیتے ہیں۔

شیر افضل اونچے طبقے کی نمائندگی کرنے والا کردار ہے۔ جو خود کو سپر پاور سمجھ کر پورے گاؤں کی قسمت کا مالک تصور کرتا ہے۔ گاؤں میں اسی کی مرضی چلتی ہے۔ اور وہ اپنی اس طاقت اور مرتبے پر اتراتا ہے اور اس کا برملا اظہار بھی کرتا ہے۔

"میں اس گاؤں کی سپر پاور ہوں۔ میرے لیے ضروری ہے کہ اس مرتبے کی حفاظت کروں۔ گاؤں بھر میں میرے مخبروں کا جال پھیلا ہوا ہے۔ مجھے لمحہ لمحہ کی خبر ملتی رہتی ہے۔"۹۹

گاؤں کے افراد اُس کی عائد کردہ پابندیوں سے تنگ ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ گاؤں سے باہر شہر جاتا ہے تو لوگ پیچھے سکھ کا سانس لیتے ہیں اور آزادی کے ساتھ ادھر ادھر گھومتے اور کام کاج کرتے ہیں۔

بظاہر تو شیر افضل ظالم اور جابر کردار کی صورت میں نظر آتا ہے لیکن اندر سے خوفزدہ رہتا ہے کہ رعایا کہ بدلتے اطوار سے اسے خطرے کی بو محسوس ہوتی نظر آتی ہے اور اُسے اپنی جان کا خطرہ بھی لاحق رہتا ہے۔ اور موت کا خوف ہر وقت سر پہ منڈلاتا محسوس کرتا ہے۔

"یہ الگ بات ہے کہ دبدبے کی نمائش کے لیے دن کی روشنی اور دیکھنے والی آنکھ کی ضرورت ہے۔ اندھیرے میں جب کوئی نہیں دیکھ رہا تو یہ فولاد کیوں پگھلتا جا رہا ہے۔ میں کیوں تنہا محسوس کر رہا ہوں۔ قبر کا اندھیرا تو اس اندھیرے سے کہیں زیادہ خوفناک ہوگا۔"۱۰۰

"شیر افضل" کے کردار کے ذریعے صادق حسین نے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے کہ وقت ایک سا نہیں رہتا۔ ہر عروج کے بعد زوال بھی آتا ہے۔ لہذا انسان کو آنے والی صورت حال لے لیے خود کو تیار رکھنا چاہیے کیونکہ وقت کے پلٹا کھانے میں دیر نہیں لگتی۔ وہی شیر افضل جو ابتدا میں طاقت اور دولت کے نشے میں چور متکبرانہ رویے کا مالک ہوتا ہے اور اپنی طاقت کے بل بوتے پر پورے علاقے میں اپنی دھاک بٹھالیتا ہے۔ افسانے کی اختتامی حصے میں وہی ڈومنا مکھیوں کے کاٹنے کی وجہ سے بے بسی کی موت مرتا۔ صادق حسین نے شیر افضل کے ذریعے معاشرتی سطح پر ایک اہم پیغام چھوڑا ہے کہ یہ دنیا مکافاتِ عمل ہے۔ لہذا کسی بھی معاملے میں انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی حدود کو تجاوز نہ کرے۔ کیونکہ انسان کو اس کے کیے کا پھل ضرور ملتا ہے۔

افسانہ "قانون اور کانٹے" میں کردار قابل توجہ اور مرکزی حیثیت کے حامل ہیں۔ کانسٹیبل شوکت اور دوسرا شاہ جی۔ "کانسٹیبل شوکت" افسانے کا مرکزی اور نمایاں کردار ہے جو سماجی زندگی کے مثبت حقائق کو واضح کرتا ہے۔ "کانسٹیبل شوکت" محنتی، فرض شناس اور ایماندار ہونے کے ساتھ ساتھ معصوم کردار بھی ہے۔ جسے زمانے کی اونچ نیچ بہت کچھ سکھا دیتی ہے۔ شوکت دیہات سے تعلق رکھنے والا شریف النفس نوجوان ہے جسکی تربیت شریف خاندان میں ہوئی۔ اور اُسے بچپن سے ہی اچھائی کا درس دیا جاتا ہے۔ بزرگوں کی نصیحت اور تربیت اُس کی شخصیت کے مثبت پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ٹریفک پولیس میں نوکری کرنے کے باوجود وہ رشوت جیسی سماجی برائی سے دور رہتا ہے۔ حالانکہ اس پیشے سے منسلک افراد اُسے رشوت خوری کے نہ صرف مشورے دیتے ہیں بلکہ اُسے تمام گر بھی سکھاتے ہیں۔

"کانسٹیبل خلجی بولا۔ گر میں بتا دیتا ہوں، عمل کرنا تمھارا کام ہے۔ اسامی دیکھ کر چالان کی دھمکی دو اور اپنا کام کرو۔ حرکت میں برکت ہے۔ ایک آدھ بھرتی کا اصلی چالان کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔"[101]

شوکت کا کردار بتاتا ہے کہ ایماندار شخص کو ثابت قدم رہنے کے لیے بہت سی مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے لیکن خوفِ خدا اور آخرت کے انجام کا ڈر اُسے تمام منفی سرگرمیوں سے روکے رکھتا ہے اور اُس کے پایہ استقلال میں لغزش نہیں آتی۔ کیونکہ ایسے افراد کی تربیت کے پیچھے اُن کے بزرگوں کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ شوکت کے باپ اور دادا بھی اسی پیشے سے وابستہ رہے۔ لیکن رشوت خوری جیسی لعنت سے دور رہے۔ انھوں نے حق حلال کا نوالہ خود بھی کھایا اور اُسے بھی کھلایا اسی وجہ سے شوکت پر زمانے کی اونچ نیچ اثر انداز نہیں ہوتی اور وہ ثابت قدم رہتا ہے۔ صادق حسین نے اس کردار کے ذریعے بتایا ہے کہ مثبت تربیت انسان کی شخصیت کو نکھارنے کا سبب بنتی ہے۔

افسانے کا دوسرا کردار حوالدار شاہ جی کا ہے۔ اور افسانے میں اس وجہ سے اہمیت رکھتا ہے کیونکہ وہ لوگوں میں اچھائی اور برائی میں فرق کرنا سکھاتا ہے۔ حق شناس ہونے کے ساتھ ساتھ حق گو بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کانسٹیبل شوکت کی معصومیت اور فرض شناسی کو بھانپ جاتا ہے اور قدم قدم پر اُسکی رہنمائی کرتا ہے۔ اُسے درست سمت دکھاتا ہے اور ایمانداری کی راہ اختیار کرنے پر اس کی تعریف کرتا ہے۔ شاہ جی کا کردار نصیحت کرنے والے بزرگ کا کردار ہے۔ جو خود ٹریفک پولیس کے شعبے سے منسلک ہو کر بھی رشوت جیسی خرافات سے دور رہتا ہے۔ افسانے میں قدم قدم پر شوکت اور دیگر افراد کو نصیحت کرنا اُس کے مثبت کردار ہونے کا ثبوت پیش کرتا ہے۔

"ایک دن شاہ جی نے شوکت کو اپنے پاس بٹھا کر کہا" برخوردار جس سیدھی لکیر پر تم چل رہے ہو اس سے بھٹک نہ جانا۔ اس وقت ہم دو نہیں بلکہ تین ہیں۔ ایک تم، دوسرا میں اور تیسرا ہمارا خدا۔"[102]

مندرجہ بالا کرداروں کے ذریعے صادق حسین نے زندگی کے مثبت پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ اور سماجی زندگی کو برائیوں سے پاک کرنے کی ترغیب بھی دی ہے۔

صادق حسین کے متفرق افسانوں میں سماجی شعور (بحوالہ کردار)

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ صادق حسین کے تین افسانوی مجموعے منظرِ عام پر آئے۔ لیکن ان کے بیشتر افسانے ایسے بھی ہیں جو ان کے کسی افسانوی مجموعے کا باقاعدہ حصہ نہیں رہے مگر وقتاً فوقتاً مختلف ادبی رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ اور صادق حسین کی وفات کے بعد ان کی سب سے چھوٹی صاحبزادی یاسمین پرویز اور ان کے چھوٹے صاحبزادے لیفٹیننٹ طارق کی باہمی کوششوں سے ان کے افسانوں کا کلیات بنام " صادق حسین کے افسانے " ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا۔ ان کے اس کلیات میں وہ تمام افسانے بھی شامل ہیں جو ان کے کسی افسانوی مجموعے کا حصہ نہیں ۔ذیل میں ان متفرق افسانوں کے کرداروں کا تجزیہ پیش کیا جا رہا ہے۔

افسانہ "خوشبو کی بستی "کا مرکزی کردار " تتلی " ہے۔ جو تعلیم یافتہ اور اونچے طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ پُر اعتماد اور ذہین لڑکی ہے۔ تتلی کا کردار نفاست پسند اور من مانی کرنے والا کردار ہے۔ اور عموماً اونچے طبقے سے تعلق رکھنے والی لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں کیونکہ اُن کی تربیت ہی ایسے ماحول میں ہوتی ہے۔ ماں باپ کا لاڈ پیار اور حد سے زیادہ توجہ اُسے بہت زیادہ خود اعتماد بنا دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنی ازدواجی زندگی کے فیصلوں میں بھی آزاد ہوتی ہے اور کھلم کھلا اپنی رائے کا اظہار کرتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس کی چوبیسویں سالگرہ کے موقع پر مہمانوں کے چلے جانے کے بعد اس کا والد پروفیسر شکیل اُس کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہے تو وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کی وجہ سے تمام رشتوں کو مسترد کر دیتی ہے۔ کوئی اُسے اس وجہ سے پسند نہیں آتا کہ اُس نے شام کے وقت بھی دھوپ کی عینک لگا رکھی ہوتی ہے اور کسی کو وہ اس وجہ سے مسترد کر دیتی ہے کہ ہنستے وقت اُس کے ہونٹوں کے کونوں سے جھاگ اُڑتے ہیں۔ الغرض چھوٹی چھوٹی وجوہات کی بنا پر وہ تمام رشتوں کو نظر انداز کرتی ہے۔ "ممی اس نے بھورے رنگ کے جوتے پر کالی پتلون پہن رکھی تھی۔ "۱۰۳ اسی طرح جب اس کے والدین اس سے یونیورسٹی میں اول آنے والے زبیر کے بارے میں رائے لیتے ہیں تو وہ کہتی ہے کہ "جب وہ ہنستا ہے تو اس کے ہونٹوں کے کونوں سے جھاگ اڑتے ہیں۔ "۱۰۴ اور یوں انتہائی نفاست پسند تتلی معمولی معمولی باتوں پر ہر رشتے کو ٹھکرا دیتی ہے۔ اور اپنے آئیڈیل کی تلاش میں رہتی ہے۔ تتلی کا یہ رویہ اُس کی نفاست اور کسی حد تک خود غرضی کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ کیونکہ جب اس کے والدین اس کی مرضی پوچھنا چاہ رہے ہوتے ہیں تو وہ عجیب انداز میں ان کا مذاق اڑاتی ہے۔

صادق حسین نے تتلی کے کردار کے ذریعے اونچے طبقے اور خاص کر تعلیم یافتہ طبقے کی نمائندگی کرتے ہوئے ان کے طرز رہائش اور عادات و اطوار کے ساتھ اُن کے رویوں کو بھی ظاہر کیا ہے۔ حد سے زیادہ لاڈ پیار اور خود مختاری انسان کو انا پرست بنا دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تتلی کی شادی ہو جاتی ہے تو اسکا خاوند خواہش ظاہر کرتا ہے کہ اس کی

بیوی یعنی تتلی اُسے بیڈ ٹی بنا کر دیا کرے تو تتلی اسے اپنی شان کے خلاف سمجھتی ہے اور انا کا مسئلہ بنا کر خاوند کے ساتھ سرد مہری سے پیش آتی ہے۔ گھریلو ملازمہ مسئلے کی نوعیت کو بہت جلد بھانپ جاتی ہے اور اُسے سمجھاتے ہوئے اپنی زندگی کے تجربات سے مثالیں دیتی ہے۔ "دیکھو نا! جب میرے مرد کو غصہ آتا تو وہ لٹھ لے کر کھڑا ہو جاتا۔ میں اپنے منہ کو تالا لگا لیتی۔" تتلی ملازمہ کی باتوں کو بھی نظر انداز کر دیتی ہے۔ اور انا کے ہاتھوں مجبور ہوتی ہے۔ کیونکہ اس نے زندگی میں گھر کا کوئی کام نہیں کیا ہوتا تو اب کیسے کر سکتی ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ اگر عورت اور خانہ داری کی انجام دہی کے لیے مامور ہو جائے تو وہ صرف مرد کی غلام بن جاتی ہے حالانکہ ایسی بات نہیں۔ عورت کی اولین ذمہ داریوں میں گھریلو امور کی انجام دہی شامل ہے۔ اور صادق حسین نے بھی اسی نقطہ کو واضح کیا ہے۔ مائی شریفاں (گھریلو ملازمہ) جب اُسے سمجھاتی ہے کہ یہ اتنا بڑا مسئلہ تو نہیں جسکی وجہ سے تم دونوں میاں بیوی میں اختلافات پیدا ہو رہے ہیں تو تتلی آگے سے توضیح پیش کرتی ہے "مگر اب تو وہ مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا۔ مائی شریفاں! اب یہ میری انا کا مسئلہ ہے۔"۱۰۶

صادق حسین نے ازدواجی زندگی سے متعلق یہ بات سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے جنم لینے والے اختلافات کو جب انا کا مسئلہ بنا لیا جائے تو بہت سارے معاشرتی بگاڑ پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے انسان کو سمجھداری کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ باہمی ہم آہنگی اور رشتوں کا پاس ازدواجی تعلقات کو خوبصورت اور حسین بنا دیتے ہیں اور لڑکیوں کی پرورش کے حوالے سے جو بات اس افسانے میں دیکھنے کو ملتی ہے وہ یہ کہ بہت زیادہ آزادی، تعلیمی ماحول اور خود اعتمادی کے ساتھ ساتھ والدین کو چاہیے کہ وہ بیٹیوں کو سینا پرونا اور کھانا پکانا بھی سکھائیں اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے دیگر گھریلو کاموں سے بھی واقفیت دلائیں۔ اُن کی تربیت میں یہ بات ضرور شامل کریں کہ ان تمام کاموں کے بغیر عورت کی زندگی بے وقعت اور بے معنی ہو جاتی ہے۔ لہٰذا گھر داری اور سلیقہ ہی عورت کی اصلی پہچان ہے۔ تعلیم ایک طرف، رتبہ ایک طرف اور گھر داری اور سلیقہ ایک طرف، اس حوالے سے دیکھا جائے تو تتلی کا کردار سمجھدار کردار بھی ہے جو افسانے کے اختتامی حصے میں مائی شریفاں کے مشورے کا احترام کرتے ہوئے پوری سمجھداری کا مظاہرہ کرتی ہے اور اپنی انا کا گلا گھونٹ کر خاوند کی خواہش پر سر تسلیم خم کر لیتی ہے۔ اور اگلی ہی صبح وہ ملازمہ کے دیے ہوئے مشورے پر عمل کرتے ہوئے بیڈ ٹی، ٹرے میں سجائے اپنے خاوند کو پیش کرتی ہے تو اس کا شریکِ سفر بہت خوش ہوتا ہے اور تمام ناراضگیاں اور شکوے ختم کر دیتا ہے۔ "عمران کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، اس نے کھڑے ہو کر نرگس کے پھول تتلی کے جوڑے میں لگا دیے۔"۱۰۷

صادق حسین کے افسانوں میں چھوٹے اور مختصر کردار بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جیسے افسانہ "خوشبو کی بستی" میں مائی شریفاں کا کردار مختصر لیکن اہم کردار ہے۔ مائی شریفاں نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والی سمجھدار عورت ہے جو پرانی تہذیب اور روایات کی پاسدار ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ فرض شناسی، وفاداری اور رحمدل کردار کی صورت میں بھی نظر آتی ہے۔ کیونکہ وہ اپنے مالک اور گھر والوں کی عزت کرتی ہے اور ان کے مسائل اور دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھتی ہے۔ تتلی کی پرورش اس کے ہاتھوں میں ہوتی ہے لہذا شادی کے بعد جو ب وہ تتلی کو پریشان دیکھتی ہے تو اس سے وجہ پوچھتی ہے اور بعد میں معاملے کی نوعیت سمجھنے کے بعد تتلی کو بہترین مشورے بھی دیتی ہے۔ جن پر عمل کر کے تتلی اُن کے مسائل اور پریشانیوں سے نجات حاصل کر لیتی ہے جن کی وجہ سے وہ مضطرب ہوتی ہے۔

> "ایک دن مائی شریفاں نے تتلی کو گھیر لیا۔ میں نے تمھیں گود وں کھلایا ہے۔ مائی شریفاں نے کہا۔
> قربان جاؤں۔ یہ کیا حال بنا رکھا ہے مجھے دل کی بات بتا دو۔ میں ہر مرض کی دوا جانتی ہوں۔"۱۰۸

اپنے تجربات کی روشنی میں مائی شریفاں مرد کی نفسیات سے متعلق تتلی کو آگاہی دلاتی ہے کہ مرد رعب جمانا اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے۔ "مائی شریفاں نے کہا! مرد کو سمجھنا مشکل ہے اور آسان بھی۔"۱۰۹ لہذا تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یوں سمجھداری کا مظاہر کرتے ہوئے تتلی کے معاملات کو حل کرنے میں اسکی مدد کرتی ہے۔ اس حوالے سے مائی شریفاں کا کردار سمجھدار، فرض شناس اور مثبت کردار ہے۔

"زعفران کے پھول" اپنی نوعیت کا منفرد افسانہ ہے۔ اس افسانے میں "ارشد" کا کردار قابلِ توجہ اور مرکزی حیثیت کا حامل ہے۔ ارشد اونچے طبقے سے تعلق رکھنے والا پرجوش اور باعمل انسان ہے جو اپنے فرائض منصبی کو نبھانا جانتا ہے اور اپنے پیشے کے لحاظ سے خاص نام کمانا چاہتا ہے۔ وہ وہسکی بھی صرف اس لیے پیتا ہے کہ وہ چاق و چوبند رہے۔ اور اس طرح وہ اپنی صلاحیتوں کو نکھار سکے۔ کیونکہ وہسکی پینے سے اس کے خیالات بہکتے نہیں بلکہ وہسکی اُس کی فکری صلاحیتوں کو جلا بخشتی ہے۔

> "ارشد سوچنے لگا: میں تو اسکاچ وہسکی اس لیے پیتا ہوں کہ میری پیشہ ورانہ صلاحیتوں کا نکھار قائم رہے۔ دن رات کی محنت کے بعد میرے اعصاب مضمحل نہ ہوں۔ میں تو نشے میں بہکی بہکی باتیں نہیں بلکہ غور کرتا ہوں تا کہ اپنے فن کے سمندر میں غوطہ لگائے نئے نئے خیالوں کے لعل و گہر لے کر ابھروں۔"۱۱۰

اس حوالے سے ارشد فرض شناسی اور باعمل شخص ہے جسے پیشہ ورانہ زندگی میں نام کمانے کی خاص دھن لگی رہتی ہے۔ وہ اپنے فرض کو نبھانے کے ساتھ ساتھ اپنے دکھ درد کو اپنے اندر چھپانا بھی جانتا ہے۔ اولاد کی کمی کا غم اُسے اندر ہی اندر کھائے جاتا ہے لیکن اس کے باوجود اُس نے کبھی زبان سے اس کمی اور غم کی بات نہ کی۔ اسکا یہ درد مشینوں کے شور میں دب جاتا۔ صادق حسین نے ارشد کے کردار کے ذریعے جو معاشرتی زندگی کی تصویر کشی کی ہے اس میں کچھ

افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جو تمام تر دکھوں اور محرومیوں سمیت زندگی کو منظم طریقے سے بسر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ایسے افراد مضبوط قوتِ ارادی کے مالک ہوتے ہیں جو دنیا والوں کے سامنے سر اُٹھا کر جینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ارشد بھی مضبوط قوتِ ارادی کا مالک شخص ہے۔

صادق حسین نے یہاں انسانی نفسیات سے آگاہی دلاتے ہوئے اس حقیقت سے روشناس کیا ہے کہ بظاہر متحرک نظر آنے والے افراد اندرونی طور پر اتنے ہی کمزور اور کھوکھلے ہوتے ہیں۔ ارشد کی تنہائی، شریک سفر کی جدائی اور اولاد کے نہ ہونے کا غم یہ سب باتیں مل کر اُسے اندرونی طور پر کھوکھلا کر دیتی ہیں۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود متحرک اور فعال زندگی بسر کرتا نظر آتا ہے۔

"وہ اکثر سوچتا مشینوں کے شور میں وہ خود ایک مشین بن کر رہ گیا۔ ایک ڈریگ لائن کی طرح جو بے جان ہوتی ہے مگر ایک منظم طریقے سے مٹی ریت اور پتھر ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ پہنچا دیتی ہے"[111]

ارشد مضبوط قوتِ ارادی کا مالک ہونے کے ساتھ ساتھ وفا شعار بھی ہے جو اپنی شریک حیات سے بے پناہ محبت کرتا ہے اور اس کے مرنے کے بعد بھی اُس کی یادوں کو سینے میں چھپائے زندگی بسر کرتا ہے۔ صادق حسین نے ارشد کے کردار کو نمونہ بنا کر انسانیت کے لیے ایک پیغام دیا ہے کہ ہر انسان کی زندگی میں اونچ نیچ آتی ہے۔ اگر انسان ثابت قدمی اور ہمت کا مظاہرہ کرے تو تمام مشکلات اور دکھوں کے ساتھ بھی اپنے اندر جینے کا حوصلہ پیدا کر سکتا ہے۔

صادق حسین کی کہانیاں اُن کے خیال و عمل کے عمدہ اور خوشگوار امتزاج کو ظاہر کرتی ہیں۔ آپ کے ہاں کردار نگاری اعلیٰ پائے کی ہے۔ آپ انسانی جذبات اور احساسات کے صحیح ترجمان ہیں۔ اس لیے ان کے ہاں سلیقے سے کردار کا ارتقاء اور کردار کا اضطراب بھی ملتا ہے۔

افسانہ "نروان" دو کرداروں پر مشتمل ہے۔ ستار بندھو اور مریم۔ ستار بندھو ایک شاعر ہے۔ اور افسانے کا مرکزی اور حساس کردار بھی۔ جس کی اپنی دل کی دنیا ویران ہو چکی ہے۔ ماں باپ کا ہیضے کی وباء کے باعث انتقال اور محبوبہ سے شادی نہ ہونے کا غم اس کو اندر ہی اندر چاٹ جاتا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سماجی عوامل اور رویے انسان کے اندر کو مضبوط بھی بناتے ہیں اور اسکی شخصیت کی توڑ پھوڑ بھی کرتے ہیں۔ ستار بندھو حال اور ماضی دونوں زمانوں میں خود کو گم کر دیتا ہے۔ زمانے کی ستم ظریفیاں اس کی حساسیت میں اضافہ کر دیتی ہیں لیکن وہ اپنی مضطربانہ کیفیت میں ٹھہراؤ شاعری کے ذریعے لاتا ہے۔ صادق حسین نے ستار بندھو کی شخصیت کے ذریعے جو نقطہ اجاگر کیا ہے وہ زیادہ قابل توجہ ہے۔ شاعر یا تخلیق کار کو اچھا تخلیق کار بنانے میں معاشرتی رویے اور تبدیلیاں اہم کردار ادا کرتی ہیں کیونکہ وہ جذبات کی بھٹی میں پک چکا ہوتا ہے۔ زمانے کے تھپیڑے اُس کی حساسیت پر ایسی چوٹ لگاتے ہیں کہ وہ تڑپ اٹھتا ہے اور اپنے اندرونی کرب کو لفظوں کی صورت دے کر اپنے سینے اور دماغ کے مابین ہونے والی جنگ پر قابو پا لیتا

ہے۔ غم غلط کرنے کا یہ بالکل اچھوتا انداز ہے۔ مریم کی جب شادی ہو جاتی ہے تو ستار بند ھو کی شاعری میں پہلے کی نسبت زیادہ نکھار آ جاتا ہے۔ اور اس کی شہرت ارد گرد کے علاقوں میں پھیل جاتی ہے۔ کیونکہ اس نے مریم کو کھویا اور اس کے بدلے میں درد کی دنیا اس کا مقدر بنی۔

"مونو شہنایوں کی آوازوں میں مریم کو پالکی میں بٹھا کر اپنے گاؤں لکھی پورلے جا چکا تھا۔ ستار نے رو رو کر راتیں گزاریں اس کے اندر لگی ہوئی آگ نے اس کی شاعری نکھار دی۔ دل سے نکلے ہوئے شعروں نے دلوں میں ہلچل مچادی۔"[۱۲]

پورے افسانے میں "ستار بند ھو" حساس اور سنجیدہ کردار کے روپ میں نظر آتا ہے۔ باہر کے حالات جیسے بھی ہوں اُس کے اندر کا موسم کبھی خوشگوار نہیں ہوا۔ اُداسی مستقل صورت میں اُس کی شخصیت پر قابض رہتی ہے۔ ستار بند ھو کا کردار ظاہر کرتا ہے کہ انسان کو زمانے کے تھپیڑے کمزور اور سنجیدہ بنا دیتے ہیں۔ فطرتاً تمام انسان ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ہر فرد طبعاً دوسرے افراد سے منفرد ہوتا ہے۔ لیکن دوسروں کے کرب اور دکھ کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو خود اس صورتحال سے دوچار ہو چکے ہوں۔ "ستار بند ھو" کی حساسیت اُس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب وہ معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں اور حق تلفیوں کو دیکھتا ہے۔ اُسے سماجی حالات اور لوگوں کی حالتِ زار مفلوک الحال اور بے بس لوگوں کی مجبوریاں پریشان کر دیتی ہیں۔ وہ اُن کے غموں پر کڑھتا ہے۔ اور اُن کے غموں کی ترجمانی شاعری کے ذریعے کر کے حاکمِ وقت کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔

افسانے کے اختتام پر مریم کے خودکشی کرنے پر ستار بند ھو کی شخصیت میں برپا ہونے والے تلاطم کو صادق حسین نے اپنے نوکِ قلم سے اس مہارت اور فنی چابکدستی سے بیان کیا ہے کہ قاری کی آنکھ اشکبار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی اور قاری کی تمام تر ہمدردیاں ستار بند ھو کے ساتھ ہو جاتی ہیں۔ "ستار کے سینے میں سلگتی آگ بھڑک کر شعلوں میں تبدیل ہو گئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے اپنے دل کی بات اسی وقت نہ کہہ ڈالی تو اسکا جسم جل کر راکھ ہو جائے گا۔"

افسانے میں دوسرا کردار مریم کا ہے جو معصوم اور شفاف دل کی مالک ہوتی ہے لیکن معاشرتی ناانصافیوں کے ناگ اُسے اس طرح ڈس لیتے ہیں کہ اُس کی شخصیت کا محل چکنا چور ہو جاتا ہے۔

صادق حسین نے مریم کے کردار کے ذریعے معاشرتی پہلو کی نشاندہی کی ہے وہ ہے "ظلم" کوئی بھی معاشرہ ہو وہ ظلم و جور جیسی سرگرمیوں سے بچ نہیں سکتا۔ سماجی استحصال اور ناانصافیوں کا سلسلہ ہر دور میں ہر سماج میں جاری و ساری رہا ہے۔ جہاں طاقت کا راج ہو اور ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے والا کوئی نہ ہو تو وہاں مریم جیسے معصوم اور حساس دل رکھنے والے افراد کی شخصیت کی ٹوٹ پھوٹ ہونا یقینی امر ہے۔ مریم ستار بند ھو سے بہت محبت کرتی ہے لیکن

قسمت کی ستم ظریفی کہ اُسے ستار بند ھو کا ساتھ نصیب نہیں ہوتا اور وہ والدین کے فیصلے کے آگے سر جھکا کر فرمانبردار بیٹی ہونے کا ثبوت دیتی ہے اور مونو کے ساتھ نکاح کرنے پر رضامند ہو جاتی ہے لیکن شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی اُس کی خوشیوں کو نظر لگ جاتی ہے۔ اور دیرینہ عداوت کے نتیجے میں غنی اس کے شوہر مونو کو قتل کر دیتا ہے۔ ظالم زمانے کی اس ستم ظریفی کو مریم برداشت نہیں کر سکتی اور پاگل ہو جاتی ہے یہاں تک کہ وہ خودکشی کر لیتی ہے۔

مریم بنگالی سماج سے تعلق رکھنے والی معصوم اور وفا شعار لڑکی ہے۔ مریم کا کردار صادق حسین کے ایک اور افسانوی کردار روپ ونتی سے مماثلت بھی رکھتا ہے۔ دونوں کرداروں میں مماثلت کی ایک بڑی وجہ بنگالی سماج ہے اور دونوں محبت میں ناکام ہوتی دکھائی گئیں۔ محبت میں ناکامی دونوں کو ذہنی طور پر اتنا متاثر کرتی ہے کہ وہ دونوں پاگل ہو جاتی ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ روپ ونتی زندہ رہتی ہے لیکن مریم افسانے کے آخر میں خودکشی کر کے افسانے کو المیہ انجام دے جاتی ہے۔ مریم ایک عام اور روایتی کردار ہے جسے سماجی رویے کمزور کر دیتے ہیں۔

صادق حسین کے افسانوی موضوعات روزمرہ اور حقیقی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی لیے اُن کے کردار بھی معاشرے کے جیتے جاگتے اور چلتے پھرتے کرداروں کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ اور اُن پر فرضی یا خیالی ہونے کا شائبہ نہیں ہوتا۔

افسانہ "انکار" میں میر زمان کا کردار بنیادی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ وہ افسانے کا مرکزی کردار ہے۔

"میر زمان" صوبہ بنگال سے تعلق رکھنے والا بہادر سپاہی ہے۔ جس کا پورا خاندان ہی سپہ گری کے حوالے سے مشہور ہوتا ہے۔ اس طرح بہادری اور شجاعت اس کے ورثے میں شامل ہوتی ہے۔

> "اس کی ننھیال اور ددھیال میں سات پیڑھی تک سب کا پیشہ فنِ سپہ گری تھا۔ ننھیال میں اس کے نانا اور ماموں کی جرات کے قصے دہرائے جاتے۔ ددھیال میں اس کے دادا، چچا، تایا اور چچیرے بھائیوں کی بہادری کے تذکرے ہوتے۔ شجاعت کی اس میراث نے اس کی شعور میں ڈھل کر امانت کی صورت اختیار کر لی۔"[۱۴]

میدانِ جنگ میں بہادری کے جوہر دکھاتے ہوئے میر زمان کی بینائی اور قوتِ سماعت ختم ہو جانے کے ساتھ ساتھ اُس کے دونوں بازو بھی کٹ جاتے ہیں۔ اور افسانے کے اختتام میں راولپنڈی کے عسکری ہسپتال میں جب اس کے خاندان والے اس سے ملنے آتے ہیں تو تب بھی لاشعوری طور پر اُس کی زبان سے صرف وہی لفظ نکلتے ہیں کہ "میں ہتھیار نہیں ڈالوں گا۔"[۱۵]

میر زمان جیسے کردار ہی وطن کی آن، وطن کی شان اور مان ہوتے ہیں۔ جو جذبہ شہادت اور قوتِ ایمانی سے سرشار ملکی سرحدوں پر ہر وقت اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اور اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ شہید کی جو موت ہے در حقیقت قوم کی حیات ہے۔

صادق حسین کا یہ کردار اُن کی سنجیدہ مزاجی، مٹی سے لگاؤ اور کردار نگاری میں مہارت کا غماز ہے۔

کردار نگاری کے حوالے سے صادق حسین کی کمال خوبی یہ ہے کہ وہ حقیقی کرداروں کو زندگی کی تمام تر سچائیوں اور حقائق کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور ایک عام شخص کی نفسیات سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے اُس کے اندر تک اتر کر اُس کے جذبات، سچائی کیفیات، ذہنی الجھنوں اور نفسیاتی کش مکش کے ساتھ ساتھ اس کی آرزوؤں اور حسرتوں کے سبب پیدا ہونے والے دکھوں اور غموں کو بھی اجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ اور سماج میں موجود عام شخص خواہ وہ کسی بھی مذہب یا عقیدے سے تعلق رکھنے والا ہو اس کا تعلق دیہات سے ہے یا شہر سے اُس کی شخصیت اور ذہنی الجھاؤ کو پوری فنکارانہ دسترس کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

افسانہ "انسان اور صلیب" ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔ اُن کا یہ افسانہ اس حوالے سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس میں کسی بھی ایک شخص کو مرکزی کردار ٹھہرانا مشکل ہے۔ صادق حسین نے اس افسانے کی بنت چھوٹے چھوٹے ضمنی کرداروں کے ذریعے سے کی ہے۔ لیکن یہی چھوٹے اور مختصر کردار ہی پورے افسانے کی تخلیق میں مددگار ثابت ہوئے ہیں۔ انھی کرداروں کی مدد سے انھوں نے زندگی کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو نمایاں کر کے انسان کے اندر کا مطالعہ کیا ہے۔ اور اہم ذیلی کرداروں کے باطن میں جھانک کر اُن کی اندرونی کشمکش کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں اور ہنر کے ذریعے پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

بنیادی طور پر یہ افسانہ ایک گرجا گھر میں عبادت کی غرض سے موجود مختلف افراد کی معاشرتی سرگرمیوں اور ذہنی کیفیات کو بیان کرتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مرکزی کردار وہ پادری ہے جو متی کی انجیل کی آیات کا ترجمہ پڑھتا ہے۔ اور اس کے سلجھے ہوئے اندازِ بیان نے گرجا گھر میں ایسا سحر پھونکا کہ تمام عبادت گزار اپنے نفس کو کھنگالنے اور معافی کے طلب گار ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ خوفِ خدا اُن کے دلوں میں جاگ جاتا ہے اور وقتی طور پر سب اپنے نامہ اعمال کے عوض معافی کے طلب گار ہو کر اپنے ضمیر کی جنگ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو پادری ایک متحرک کردار ہے جس کی شیریں بیانی اور جادوئی لفظ لوگوں کے دلوں پر اثر کرتے ہیں اور ہر فرد کے نفس کو جھنجوڑ کر تزکیہ کی جانب رغبت دلاتے ہیں۔

> "اے میرے خدا! اے میرے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟ پادری متی کی انجیل کے ستائیسویں باب کی چھیالیسویں آیت پڑھ کر لمحہ بھر کے لیے رُکا۔ اُس نے خطبہ گاہ سے سامعین کی طرف دیکھا۔ اُس کی نیلی نیلی آنکھوں میں آنسو چمکے اور پھر آناً فاناً اس بارہ لفظوں کے جملے سے فصاحت و بلاغت کے چشمے اُبل پڑے۔ پادری کا سُلجھا ہوا اندازِ بیاں سحر پھونکنے لگا۔ اس کی باوقار پر خلوص اور رقت انگیز آواز نے کلیساء کے در و دیوار پر گھمبیر درد کی پرچھائیں پھیلا دیں۔" [۱۶]

افسانے میں ضمنی کرداروں میں "پروفیسر ڈیوڈ"،"مسز فریڈرک"،"ملبارن"،"مسٹر ہملٹن"، "مسز ہملیٹن"، "رونلڈ"، "لوسی"، "میکالے پائلٹ"،اور"ناول نویس کرشن" کی معاشرتی زندگی اور نفسیاتی کشمکش کو بیان کرکے صادق حسین نے پورے گرجاگھر کی فضاء کامیابی کے ساتھ تخلیق کی ہے۔

"پروفیسر ڈیوڈ"یونیورسٹی میں پروفیسر ہوتا ہے اور فلسفہ پڑھاتا ہے۔ گرجاگھر میں آخری صف کے وسط میں بیٹھ کر وعظ کو لفظ بہ لفظ پورے انہماک کے ساتھ سنتا ہے۔ لیکن تمام ماحول پر عمیق نگاہ ڈالنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ "انسان سوگیا ہے اور اگر سویا نہیں تو جاگ رہا ہے لیکن اسکا ذہن صلیب پر لٹکا ہوا ہے۔"یعنی ہر شخص خود کو مجبور اور بے بس تصور کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے اپنی پیدائش یا سماجی مشکلات کی وجہ سے شکوہ کرتا نظر آتا ہے کہ "اے اللہ تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔ بھری دنیا میں مشکلات و مصائب کے بیچ کیوں چھوڑ دیا؟"۱۷ پروفیسر ڈیوڈ کی سوچ سماجی تناظر سے بالکل درست معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ حقیقت بھی یہی ہے موجودہ دور کا انسان دنیا کے ہجوم میں بھی تنہائی کا شکار ہے۔ اور اس کی بنیادی وجہ بھی انسان ہی ہے۔ لیکن "مسٹر ڈیوڈ" پر اُمید شخص کی صورت میں دکھایا گیا ہے۔افسانے کے اختتام میں انجیل مقدس اُٹھا کر اس کا ہونٹوں پہ مسکان سجائے حال کی قید سے نکل کر مستقبل کا سوچتے ہوئے رخصت ہونا اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وہ گرجاگھر میں موجود دیگر افراد کی طرح مایوس نہیں بلکہ بلند حوصلے اور ہمت کا مالک ہے اور وہ موقع کو غنیمت جان کر اپنی زندگی کو اصلاحی پہلوؤں کے حوالے سے بہترین بنانے کا خواہشمند ہے۔اس کے اندر ابھی اتنی ہمت ہے کہ وہ معاشرتی مسائل کا سامنا کرکے پرامید زندگی بسر کرسکے، خود بھی مطمئن ہوسکے اور اپنے خدا کو بھی راضی رکھ سکے۔"وہ حال کی قید سے نکل کر مستقبل کی ایک دلکش وادی میں جاپہنچا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب وغریب مسکراہٹ کھیلنے لگی۔"۱۸

"مسز فریڈرک "ضمیر کے ہاتھوں مجبور اور بے بس کردار ہے جو معاشرتی ذمہ داریوں کو پورا کرتے کرتے آمدنی کے ناجائز ذرائع حاصل کرتی ہے اور چوری کے مال اور رقم سے اپنا اور اپنی بیٹی کا نہ صرف پیٹ پالتی ہے بلکہ اپنی منہ بولی بہن "ملبارن" کے دوا دارو کا بندوبست کرتی ہے غربت کے ہاتھوں مجبور اور بے بس کردار ہے لیکن احسان فراموش نہیں اور رشتوں کی صداقت واہمیت کو سمجھنے والی اور جاننے والی ہے۔ مسز فریڈرک کی بیٹی جب بیمار ہوجاتی ہے تو اس کے پاس اتنے پیسے نہیں ہوتے کہ وہ بیٹی کا علاج کرواسکے لہذا وہ چوری کرتی ہے مگر پکڑی جاتی ہے "اس دن وہ عین ارتکابِ جرم کی حالت میں وہ پکڑی گئی۔" ۱۹ اس مشکل وقت میں ملبارن اس کی مدد کرتی ہے۔اور دوسرے دن مسز فریڈرک کو اسکی مدد کرنے کے حوالے سے سارا ماجرا سناتی ہے کہ کیسے اس نے مسز فریڈرک کی مدد کے لیے پیسے اکٹھے کئے،تب سے مسز فریڈرک اسے اپنا مسیحا سمجھ کر اسے اپنا حقیقی دوست سمجھنے لگتی ہے اور اسے منہ بولی بہن کا

درجہ دیتی ہے کیونکہ وہ احسان فراموش نہیں ہوتی۔" اس دن سے مسز فریڈرک اسے اپنی منہ بولی بہن سمجھنے لگی تھی۔"۲۰؎ ہمدردی اور غمگساری کے جذبات مسز فریڈرک کی شخصیت میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوتے ہیں۔ خاوند کا سایہ سر پر نہ ہونے کی وجہ سے وہ معاشی طور پر عدم استحکام کا شکار ضرور ہوتی ہے لیکن انسانیت کی جذبات سے عاری نہیں ہوتی۔

"مسٹر ہملٹن" شراب نوش اور ظالم شخص ہے جو شراب کے نشے میں د ھت ہو کر اپنی بیوی مسز ہملٹن کی مار کٹائی کرتا ہے اور اُسے تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ لیکن گرجاگھر میں اُس کی موجودگی ظاہر کرتی ہے کہ اسکا ضمیر ابھی سویا نہیں ہے۔"اس وقت مسٹر ہملٹن کا جی چاہ رہا تھا کہ باآواز بلند اپنے گناہوں کا اعتراف کرلے اور اپنی رفیقہ حیات کا ہاتھ چوم کر کہہ دے اب میں شراب پی کر تجھے نہیں پیٹوں گا۔"۲۱؎

"مسز ہملٹن" مظلوم کردار ہے جو سماجی بیڑیوں کی گرفت میں بری طرح سے جکڑی ہوئی ہے۔ لیکن روایتی وفاشعار بیوی کی حیثیت سے اپنی تمام ذمہ داریاں نبھانا جانتی ہے۔ اُس وفاشعاری کے صلے میں اُسے اپنے خاوند کی طرف سے کبھی بھی تعریفی کلمات سننے کو نہیں ملے بلکہ اُلٹا وہ خاموشی کے ساتھ اُس کی مار پیٹ سہتی رہتی ہے۔ لیکن اندرونی طور پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ گرجاگھر میں بیٹھ کر وہ موت کی دعا کرتی ہے کیونکہ وہ اپنے خاوند کے رویے سے دلبرداشتہ ہے۔ اور ایسی زندگی سے تنگ ہے جہاں روز مر مر کر جینا پڑتا ہو۔ وہ خاوند کی بے اعتنائیوں اور ناانصافیوں پر اکثر سوچتی ہے۔ "مر جانا کتنا آسان ہے۔ مر مر کے جینا کتنا مشکل ہے۔"۲۲؎ صادق حسین نے "مسز ہملٹن" کے ذریعے سماج میں عورتوں پر ہونے والی ستم ظریفیوں کو سامنے لایا ہے۔ ہمارے معاشرے میں عورتوں کے ساتھ ظلم اور نارسائی عام ہے۔ اور افسوسناک بات یہ ہے مہذب اور تعلیم یافتہ معاشرے میں بھی عورت کی سماجی حیثیت کو تسلیم نہیں کیا گیا بلکہ مرد اسے اپنی جاگیر سمجھتا ہے۔ صادق حسین قاری کی توجہ اُن معاشرتی مسائل کی طرف دلاتے ہیں جہاں ہر کسی کی سوچ رسائی حاصل نہیں کر پائی۔ چھوٹے چھوٹے سماجی مسائل سے لے کر بڑے بڑے سماجی مسائل اور پہلوؤں پر روشنی ڈال کر صادق حسین نے معاشرے کے نبض شناس ہونے کا فریضہ انجام دیا ہے۔

"کلارک" سوشل اسٹیٹس کے ہاتھوں مجبور شخص ہے جو اپنی محبوبہ کے رویے سے دلگرفتہ ہے جو اُسے صرف اس وجہ سے نظر انداز کر دیتی ہے کہ اس کے پاس روپیہ پیسہ کی بہتات نہیں۔ وہ احساس کمتری کا شکار ہے اور اس حقیقت سے آشناء ہے کہ اس کا سماجی مرتبہ اتنا کم تر ہے کہ وہ پوری زندگی بھی محنت کرلے تو اپنی محبوبہ کے والد جیسا سوشل اسٹیٹس حاصل نہیں کر سکتا۔

"خدا جانے اس نے تمام عہد و پیماں یکسر کیوں بھلا دیے تھے یہ سوچتے ہوئے کلارک نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کی طرف دیکھا جو ٹریکٹر بل ڈوزر، ڈریگ لائن ہاٹم ڈمپ اور دوسری بھاری بھاری مشینوں کی سروسنگ کرتے

کرتے سخت اور کھردری ہوگئی تھیں۔ آج پھر اسے احساس ہوا کہ اگر وہ تمام عمر اسی رفتار سے محنت کرتا رہے تو بھی وہ ایسی ایک کار نہیں خرید پائے گا جیسی چار کاریں ڈورو تھی کے باپ کے پاس تھیں۔"[۲۳]

"کلارک" کے کردار کے ذریعے صادق حسین نے سماجی درجہ بندی کے علاوہ ایسے مادیت پرست لوگوں کی طرف توجہ مبذول کروائی ہے جن کے نزدیک انسان سے زیادہ روپے پیسے کی اہمیت ہے۔ کلارک بھی زمانے کی اسی ستم ظریفی سے دلگرفتہ ہے اور سماجی حقائق سے آگاہ ایک سچا اور محنتی شخص ہے۔ یہ معاشرتی المیہ ہے کہ موجود دور میں انسان نے سائنس اور ٹیکنالوجی میں جتنی تیز رفتاری سے ترقی کی منازل طے کی ہیں اتنا ہی انسان انسانیت کے مرتبے سے گر گیا ہے۔ موجودہ دور میں محبت سے معمور دلوں کی کمی ہے۔ اگر ہم اُن کی قدر کریں گے تو دنیا و آخرت دونوں میں انسان کو سرخروئی حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن دولت اور طاقت کا حصول انسان کو انسانوں سے دور کرنے کا موجب ہے۔ موجودہ دور میں جس کے پاس مقام و مرتبہ اور روپے پیسے کی بہتات ہے سبھی اس کو سلام کرتے ہیں جبکہ ایک عام غریب انسان کی اہمیت کیڑے مکوڑوں سے زیادہ نہیں۔ معاشرتی درجہ بندی اور امتیازات کا یہ سلسلہ روز اول سے جاری و ساری ہے اور ہر دور میں ہر سماج کے اندر اسے محسوس کیا جا سکتا ہے۔

"ملبارن" کے کردار کے ذریعے صادق حسین نے ہمارے معاشرے کے اُن پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے جہاں مجبوریاں انسان سے اُس کی اپنی شخصیت کو بھی مسمار کر دینے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ غربت و افلاس کے ہاتھوں مجبور لوگ ہر طرح کے جائز و ناجائز کام کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ملبارن جسم فروشی کا دھندا کر کے ضروریات زندگی کو پورا کرتی ہے۔ لیکن آخر میں اس کی حالت ناقابل بیان ہوتی ہے زمانے کی سفاکیاں اور غلط افعال اُسے وقت سے پہلے بوڑھا اور بیمار کر دیتے ہیں اور وہ کھٹیا پر لیٹے لیٹے کھانستی رہتی ہے اور اپنی زندگی کی سانس ہارنے کے لیے دعاگو رہتی ہے۔"بدن کی قوسیں اور خطوط اپنی آب و تاب کھو کر ویران ہو گئے ۔ وہ ملازمت سے بر طرف کر دی گئی۔"[۲۴] صادق حسین نے اس معاشرتی حقیقت سے بھی پردہ اٹھایا ہے کہ برے کام کا نتیجہ برا ہوتا ہے۔ انسان کے دل میں آخرت کا خوف موجود ہونا چاہیے۔

"لوسی" ایک نرس ہے جو خدمتِ خلق کے جذبے سے عاجز آ چکی ہے کیونکہ دوسروں کی خدمت کرتے کرتے وہ خود تہی دامن رہ جاتی ہے۔ وہ سچی اور محبت کرنے والی خدمت گزار نرس ہے لیکن قسمت کی ستم ظریفی اُس کے دل میں محبت کا بیج بونے کے ساتھ ہی اُسے اُکھاڑ دیتی ہے۔ اور یکے بعد دیگر جارج اور اکبر کی موت جیسے سانحے اس کی روح کو زخمی کر دیتے ہیں۔ وہ مضطرب ہے اور سکون حاصل کرنے کی غرض سے گرجاگھر میں عبادت کی لیے آتی ہے۔ لیکن گرجاگھر میں آتے ہی پادری کے افتتاحی جملے اس کے کانوں میں گونجتے رہتے ہیں اور اُسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ جملے اس کے اپنے دل کی پکار ہوں اسے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے اس کا جسم زندہ ہے لیکن اُس کی روح صلیب

پر لٹکی ہوئی ہے۔" پادری کے خطبے کا افتتاحی جملہ جیسے اس کے دل کی پکار تھی۔اسے محسوس ہوا کہ اسکا جسم زندہ ہے اور اس کی روح صلیب پر لٹکی ہوئی ہے۔"۱۲۵ لوسی مجبور اور مایوس کردار ہے جسے زندگی کی تلخ تجربات دلبرداشتہ کر دیتے ہیں اور وہ موت کی متمنی ہے۔" لوسی کو محسوس ہوا جیسے وہ انسان کی خدمت کرتے کرتے اب تھک گئی ہو۔ جیسے دوسروں کے بدن پر پٹیاں باندھتے باندھتے اب خود اس کا جسم زخموں سے نڈھال ہو گیا ہو۔"۱۲۶ لوسی کے کردار کے ذریعے صادق حسین نے معاشی و معاشرتی سطح پر مجبور اور بے بس خواتین کے مسائل سے پردہ اٹھایا ہے جو تن تنہا زندگی گزارنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ جن کی زندگیوں میں بہار کا گزر بھی تھوڑی مدت کے لئے ہوتا ہے۔اور مسائل کا لا متناہی سلسلہ ان کی زندگیوں میں ایسا تلاطم برپا کرتا ہے کہ وہ جینے کے ہاتھوں تنگ ہو جاتی ہیں۔

صادق حسین نے لوسی جیسے کردار کے ذریعے اس حقیقت کی جانب توجہ دلائی ہے کہ سکونِ قلب اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے لیکن یہ دولت ہر شخص کے نصیب میں نہیں آتی۔

معاشرتی سطح پر دیکھا جائے تو کوئی بھی شخص ایسا نہیں جسے کوئی مسئلہ نہ ہو۔اندرونی سطح پر ہر شخص غیر مطمئن اور بے چین ہے۔ کسی کو محبت کا غم ہے تو کسی کو روزگار کا۔ کوئی انسانیت کی ستم ظریفیوں کی وجہ سے پریشان حال ہے تو کوئی معاشرتی دروغ گوئی کا رونا روتا ہے۔

میکالے پائلٹ اور بڈھا کرنل محبت کے مارے کردار ہیں جو ماضی کی یادوں کے سہارے زندگی گزار رہے ہیں۔آج بھی بڈھا کرنل جنگ کے زمانے کو یاد کرتا ہے۔ جب ایک خاتون اُس کی زندگی میں بہار بن کر آئی تھی۔ "آج بھی کسی معصوم بچے کی طرح اس کا دل ماضی کی طرف گم تھا۔"۱۲۷

میکالے پائلٹ بھی "مونا" کو یاد کرتا ہے جو صرف اس وجہ سے اُس کے ساتھ تعلق نبھا رہی تھی کہ اُسے ماں کے علاج کے لیے روپے پیسے کی ضرورت تھی۔اور جب مونا اُس سے اس حقیقت سے آشکار کرتی تو اسے مونا کی اپنی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری ہو جاتی ہے اور میکالے اس انکشاف پر مضطرب ہو جاتا ہے۔"آج کل مجھے اسی سہارے کی ضرورت ہے یہ پیسے بچا کر میں اپنی ماں کی آنکھوں کا علاج کروا رہی ہوں۔"۱۲۸ گرجا گھر میں بیٹھے ہوئے اُسے مونا کی یاد سے زیادہ معاشرے کی ستم ظریفیوں پر دکھ ہوتا ہے جو مونا جیسی نفیس اور خوبصورت خواتین سے اس طرح کے کام کرواتے ہیں۔اس حوالے سے دیکھا جائے تو میکالے پائلٹ ایک مثبت سوچ رکھنے والا رحمدل اور ہمدرد کردار ہے۔

ناول نویس کرشن ایک حقیقت پسند کردار ہے جسے خدا کی بجائے انسان کی تلاش ہے۔ کیونکہ موجودہ دور میں انسان ملنا مشکل ہو گیا ہے۔"وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا کی میں خدا نہیں ڈھونڈتا میں تو انسان کی جستجو میں ہوں۔"۱۲۹ اور

افسانے میں دیگر کردار بھی اس کے بارے میں یہی کہتے ہیں کہ "جس طرح آج وہ گرجے میں پہنچا ہوا تھا اسی طرح مندر، مسجد، گوردوارہ اور دوسری عبادت گاہوں میں جاتا تھا۔"١٣٠ کیونکہ اسے انسان کی تلاش نہیں ہوتی۔ وہ مختلف عبادت گاہوں میں جاکر اللہ کو تلاش کرتا ہے۔ صادق حسین نے یہاں ایک اہم پہلو کی نشاندہی کرتے ہوئے قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ موجودہ دور میں نفسانفسی کا یہ عالم ہے کہ انسان اپنے منصب سے گر چکا ہے۔ لہذا کرشن انسان کی تلاش میں ہے۔ ایک ایسے انسان کی تلاش میں جو حقیقت پسند ہو اور اپنے منصب سے آگاہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں اُسے اپنا نائب بنا کر بھیجا لہذا اسے اپنے فرائضِ منصبی کو پورا کرنا چاہیے اور اس میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں برتنی چاہیے۔ یہی وجہ ہے جب وہ گرجاگھر میں ڈیوڈ فلسفی کو دیکھتا ہے تو اسے ایسا محسوس ہوتا ہے "جیسے اس کی جستجو کے آکاش پر دھنک نکل آئی ہو۔" کیونکہ ڈیوڈ فلسفی کی سوچ عام انسان کو سوچ سے بلند ہوتی ہے اور حقیقتاً درد دل رکھنے والا درد مند انسان ہے۔

صادق حسین نے تمام ضمنی کرداروں کا ذکر کر کے اور انھیں انسانیت کی لڑی میں پرو کر افسانے کی تشکیل نہ صرف مہارت کے ساتھ کی ہے بلکہ بہت سارے سماجی پہلوؤں سے آگاہی بھی دلائی ہے اور انسان کی شعوری و عقلی دہلیز پر دستک دے کر اسے غور و فکر کی دعوت بھی دی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی واضح کیا ہے کہ تمام انسانی دکھوں اور تکالیف و مسائل کا حل صرف اور صرف اللہ کی عبادت میں پوشیدہ ہے۔

صادق حسین کی تحریریں اپنے عہد کی طبقاتی آویزش کا تابناک اور گہرا نقش پیش کرتی ہیں۔ اسی لیے اُن کے کردار بھی فطری اور حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔ آپ اپنے کرداروں کے حرکت و عمل سے سماجی تصویر کشی میں مہارت رکھتے ہیں۔ آپ کے کردار فطری ہونے کے ساتھ ساتھ تہذیبی پس منظر کے عکاس بھی ہیں۔

افسانہ "چمکیلے اندھیرے" کی کہانی دو کرداروں پر مشتمل ہے

"نعیم" اونچے طبقے کی نمائندگی کرنے والا کردار ہے لیکن افسانے کے آخر میں ضمیر کے ہاتھوں باطنی کش مکش میں مبتلا نظر آتا ہے۔ یہ بھی ایک فطری عمل ہے کہ انسان بے شک وقتی طور پر اپنے ضمیر کو سُلا کر دنیا کی رنگینیوں میں گم ہو جائے اور کتنا ہی احساس سے عاری ہو کر ذاتی مفادات کو ترجیح کیوں نہ دے ایک وقت ایسا آتا ہے جب اُس کا ضمیر بیدار ہو کر اُسے سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے اور ایسے میں انسان اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں پر پچھتاتا ہے۔ لیکن وقت اور سماجی بندھنوں کی بیڑیاں اُس کے احساسات پر ایسی گرفت کر لیتی ہیں کہ وہ چاہا کر بھی اُس صورتحال سے نہیں نکل پاتا۔ نعیم کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے جب وہ ولایت سے واپس آکر اپنے باپ کی جائیداد کی نیلامی کرتا ہے تو اُس کے احساسات اُسے جھنجوڑتے ہیں۔ اور وہ اپنے ماضی کے بارے میں سوچ کر اپنی کوتاہیوں پر کڑھتا ہے لیکن اب چونکہ

صورتحال تبدیل ہو چکی ہوتی ہے کیونکہ اس کی بیوی پر تعیش زندگی کی عادی ہو چکی ہوتی ہے۔ لہذا وہ چاہ کر بھی خود کو اپنی جائیداد کو فروخت کرنے سے نہیں روک سکتا۔ اور جب تمام چیزیں نیلامی کے لیے رکھی جاتی ہیں تو بولی کا ہر لفظ نعیم کے دل سے ٹکراتا ہے اور اُسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اس کے تن پر سے لباس کو نوچ نوچ کر نیلام کیا جا رہا ہو۔ اپنے احساسات کے جاگنے پر وہ مضطرب ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اُسکا قیمتی اثاثہ اُسکی یادوں کی نیلامی ہو جاتی ہے۔

"اس کے وہ احساسات جو لکھی پور آنے سے پہلے شاید اس کے دل کی تاریک گہرائیوں میں سو رہے تھے اب جاگ اٹھے تھے۔ دل کی اس ہلچل کو دبانے کیلئے اسے وہسکی کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔"[۱۳۱]

افسانے میں دوسرا قابل توجہ کردار "نیلم" کا ہے۔ نیلم بنیادی طور پر اچھے اور ہمدردانہ دل کی مالک خاتون ہے جسے بنگال کے علاقے سے تعلق رکھنے والے قحط اور فاقہ زدہ مفلوک الحال عوام کی صورتحال دیکھ کر افسوس ہوتا ہے اور ہمدردی کے جذبات اس کے اندر اُمڈ آتے ہیں۔ نیلم ایک حساس کردار کی عکاسی کرتی ہے جو پر تعیش زندگی گزارنے کے باوجود احساس سے عاری نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ افسانے کے ابتداء میں بنگلے میں بارش سے بچنے کے لیے غریب آدمی کی حالت دیکھ کر وہ مضطرب ہو جاتی ہے۔ اسی طرح لکھی پور جانے کے لیے دوران سفر اس پر قحط زدہ افراد کی حقیقت آشکار ہوتی ہے تو وہ اپنی بے چینی اور اضطراب کو کم کرنے کے لیے وہسکی کا سہارا لیتی ہے۔ لکھی پور پہنچنے کے بعد جب نعیم غریب کسان کو جھڑک کر اسے فولز ءایڈیٹس کہتا ہے تو نیلم کا دل چاہتا ہے کہ وہ نعیم کو پنجوں سے نوچ دے۔

"نعیم نے کرسی پر بیٹھتے ہی اک سگریٹ سلگایا" "فولز ءایڈیٹس! نعیم ہاتھ کی انگلیوں سے سر میں کنگھی کرتے ہوئے بڑبڑایا اور نیلم کا جی چاہا کہ وہ اپنے چمکتے ہوئے پنجوں کو نعیم کی آنکھوں میں گاڑ دے۔"[۱۳۲]

پورے افسانے میں صادق حسین نے نیلم کی نفسیات کو جس لفظی پیرائے میں بیان کیا ہے قابل دید اور لائق تحسین ہے۔ کیونکہ نیلم پورے افسانے میں نفسیاتی و باطنی کشمکش میں مبتلا نظر آتی ہے۔ کبھی وہ انتہائی افسردہ اور غریبوں کی دادرسی کرنے والی ہمدرد خاتون کی صورت میں نظر آتی ہے تو کبھی وہ انتہائی خود غرض جو صرف اپنے عیش و آرام کی فکر میں رہتی ہے۔ وہ نعیم سے شادی صرف اس کی دولت کے لیے کرتی ہے۔ اور ولایت سے واپسی کے بعد جب نعیم اپنی جائیداد اور وراثت کی نیلامی کرتا ہے تو وہ اطمینان کا سانس لیتی ہے اور وہ مستقبل کے سنہرے لمحات کے بارے میں غور و غوض کرنا شروع کر دیتی ہے۔ نیلم کا کردار سماجی خود غرضی کے حوالے سے منفرد کردار ہے جو باطنی کش مکش کا شکار ہے۔ پورے افسانے میں وہ نعیم کے زیادہ قریب قریب رہنے کی کوشش کرتی ہے کیونکہ وہ اُسے کھونا نہیں چاہتی کیونکہ نعیم کے کھو جانے سے وہ دوبارہ نہ صرف تنہائی کا شکار ہو جائے گی بلکہ وہ ان نعمتوں سے محروم ہو جائے گی۔ جو اُسے نعیم کے توسط سے نصیب ہوئی تھیں۔

"اس کا جی چاہا کہ وہ نیم کو جھنجھوڑ کر کہہ دے کہ میں تم سے نہیں بلکہ تمھاری دولت سے محبت کرتی ہوں۔ اس سے کہہ دے کہ کل جب تمھاری لکھی پور کی ساری جائیداد بک جائے گی اور تمھارا بینک بیلنس پھر لاکھوں روپیہ ہو جائے گا۔ تو میری ہر مسکراہٹ کی قیمت دونی ہو جائے گی۔"۱۳۳

افسانے میں نیلم کا یہ ردِ عمل سماجی خود غرضی اور مفاد پرستی کی مثال پیش کرتا ہے۔ پورے افسانے میں نیلم کی نفسیات کی ترجمانی اور باطنی صورتحال اور کش مکش کو بیان کر کے یہ تاثر برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ صادق حسین انسانی نفسیات سے آگاہ ہیں۔ اور معاشرے کے بدلتے حقائق کو سمجھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

صادق حسین اک حساس افسانہ نگار ہیں۔ وہ سماجی برتاؤ کے تمام اجزاء (عادات، رسوم ورواج، زبان، اخلاق) سے پوری طرح واقف تھے۔ انہوں نے سماجی حقائق کو سمجھا پر کھا اور پھر تحریری صورت میں ان حقائق کی ترجمانی کی۔ کیونکہ یہی سماجی حقائق اجتماعی زندگی کے تسلسل کا پس منظر ہوتے ہیں۔ ایک حساس افسانہ نگار کی حساسیت ہی اُسے معاشرتی حالات پر غور و فکر کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر سید محمد عقیل کا کہنا ہے کہ

"جو فن کار جتنا حساس ہوتا ہے اور اُسے جتنا اپنے گردو پیش کے حالات کو اپنے فن میں سمیٹ لینے کا آرٹ آتا ہے۔ وہ اتنا ہی بہتر طور پر اپنے سماج کو Reflect کرتا ہے۔"۱۳۴

صادق حسین بھی اپنے گردو پیش کے حالات کو نہ صرف سمجھنے میں کامیاب ہوئے ہیں بلکہ اپنی تحریروں میں اُن حالات کا عکس بھی دینے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ انھوں نے جہاں باریک سے باریک معاشرتی پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے وہاں نچلے اور متوسط طبقے کے ہر پیشے سے تعلق رکھنے والے افراد کو اپنے افسانوی کرداروں کی صورت میں کامیابی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے کرداروں میں موچی، نائی، خوانچہ لگانے والے، پہلوان، درویش، بھکاری اور گور کن وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔

افسانہ "دھوکے باز" میں دو کرداروں کے ذریعے بہت سارے سماجی پہلوؤں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ قینچی اور پتھر دو گور کن ہیں۔ دونوں کرداروں کی نفسیات ایک جیسی ہے۔ "قینچی" کو لوگ اس وجہ سے قینچی پکارتے ہیں کیونکہ اسکی زبان قینچی کی طرح چلتی ہے اور "پتھر" افسانے کا دوسرا کردار جسے لوگ اس وجہ سے "پتھر" بلاتے ہیں کہ وہ جب بھی بات کرتا ہے تو یوں معلوم ہوتا جیسے وہ سننے والے کے منہ پر پتھر مار رہا ہو۔ جبکہ پتھر کا اصل نام برکت ہے۔ قینچی اور پتھر پیشے کے اعتبار سے دونوں ہی گور کن ہیں۔ اور قبریں کھود کر مردے دفنانا انہیں ورثے میں ملا۔ دونوں ہی افلاس زدہ طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جہاں ذاتی مفادات اور روپے پیسے کے آگے انسان، انسانیت کے مرتبے سے گر جاتا ہے اور بے حسی کی انتہا پر پہنچ جاتا ہے۔

قینچی اور پتھر افسانے میں بیک وقت دوست اور دشمن کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ کبھی تو وہ آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں اور کبھی ایک دوسرے پر جان نثار کرتے نظر آتے ہیں۔

"گاؤں والوں کو آج تک پتا نہ چل سکا۔ قینچی اور پتھر ایک دوسرے کے دوست ہیں یا دشمن۔ وہ لوگ تو چناب کی سطح دیکھ سکتے تھے۔ سطح کے نیچے کیا ہو رہا ہے یہ انہیں کیسے معلوم ہوتا۔"۱۳۵

دونوں دس روپے کے نوٹ کے لیے لڑتے نظر آتے ہیں اور کبھی ایک دوسرے کے بیمار ہونے پر پریشان ہو جاتے ہیں۔ "ایک دفعہ قینچی بیمار ہو گیا۔ پتھر نے دن رات تیمارداری کی۔"۱۳۶

اس طرح قینچی کے تندرست ہو جانے پر پتھر نہ صرف خوش ہوتا ہے بلکہ اس خوشی میں وہ محلے میں نیاز بھی بانٹتا ہے۔ "قینچی تندرست ہوا تو پتھر نے شکرپاروں کی نیاز دلوائی۔"۱۳۷ پھر اسی طرح بسیار خوری کرنے والے پتھر کی جب طبیعت خراب ہوتی ہے تو قینچی اس کی نہ صرف دیکھ بھال کرتا ہے بلکہ اپنی تمام جمع پونجی اس کے علاج معالجے پر خرچ کرنے کے بعد اس کے صحت یاب ہونے کی خوشی میں زردے کی دیگ بھی پکا کر غریبوں میں تقسیم کرتا ہے۔" قینچی نے اپنی ساری جمع پونجی پتھر کے علاج معالجے پر صرف کر دی۔ صدقہ دیا۔" ۱۳۸ اس طرح سے دونوں بھائی چارے کی عمدہ مثال رقم کرتے ہیں۔ قینچی اور پتھر اس سماج کی نمائندگی کرتے ہیں جہاں لوگ دکھ درد اور ایک دوسرے کی خوشی غمی میں شریک ہو کر عمدہ معاشرے کی مثال قائم کرتے ہیں جہاں دکھ درد سانجھے ہوتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ہر معاشرے میں جہاں کچھ خصوصیات ہوتی ہیں وہاں پر کچھ نہ کچھ خرابیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ معاشرہ چاہے نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہو یا امیر طبقے سے مفاد پرستی اور خود غرضی ہر معاشرے میں پائی جاتی ہے۔ پتھر اور قینچی بھی جہاں آپس میں دوستی اور بھائی چارے کی مثال ہوتے ہیں وہیں پر وہ دونوں خود غرض اور مطلب پرست بھی ہوتے ہیں۔ اور انسانیت کے درجے سے گر کر صرف روپے کے لیے سوچتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ سیلاب جیسی قدرتی آفت کے قہر اور عذاب سے ڈرنے کی بجائے اس فکر میں گھلتے ہیں کہ وہ سیلاب میں بہہ جانے والے افراد اور ہجرت کر کے گاؤں چھوڑ جانے والے افراد کے بعد اُن کے دس روپے کے نوٹ اُن کے ہاتھوں سے نکل جائیں گے۔ اس حوالے سے ان کے یہ کردار پریم چند کے افسانے "کفن" کے "مادھو اور گھیسو" سے مماثلت رکھتے ہیں۔

صادق حسین نے قینچی اور پتھر کو مرکزی کرداروں کی جگہ دے کر ہمارے مہذب سماج کی نہایت بھیانک مگر سچی تصویر کشی کی ہے۔ تلخ نفسیاتی حقائق پر مشتمل افسانہ میں مرکزی کرداروں کی گفتگو خاصی معنویت رکھتی ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے ان کرداروں کے مابین ہونے والی باہمی گفتگو نے افسانہ کو جیتی جاگتی دنیا سے ہم آہنگ کر دیا۔ مثلاً جب قینچی راہ گیروں کی طرف دیکھ کر پتھر کو یہ کہتا ہے کہ "یہ سب لوگ میرے دس دس کے نوٹ ہیں۔"۱۳۹ تو یہ سن کر پتھر کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔ اور اس کے آنکھوں میں خون اترنے کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ

قینچی نے انسانیت کے مقام سے گری ہوئی بات کی ہے بلکہ وہ اس لیے آگ بگولہ ہوتا ہے کہ قینچی نے اس کے دس دس کے نوٹوں پر بری نگاہ کیوں ڈالی۔"دیکھ قینچی! میرے دس دس کے نوٹوں پر نگاہ نہ رکھ۔ تیری زندگی کے دن گنتی کے ہیں۔"[۱۴۰] وہ چلتے پھرتے انسانوں کو دس کا نوٹ اس لیے کہتے ہیں کہ اس وقت ایک مردے کی تدفین پر دس روپے کے لگ بھگ خرچ آتا تھا۔ یہی وجہ ہے جب گاؤں میں سیلاب آجاتا ہے تو ان دونوں کو یہ فکر ہوتی ہے کہ گاؤں کے لوگ کچھ تو ڈوب گئے اور جو باقی رہ گئے وہ یہ گاؤں چھوڑ کر دوسرے شہروں کا رخ کر رہے ہیں۔ لہذا اب انہیں دس کے نوٹ کون دے گا ان کا تو روزگار ٹھپ ہو جائے گا۔" اگر گاؤں تباہ ہو گیا تو مجھے دکھ ہو گا لیکن مجھے اس بات کا بھی غم ہے دس دس کے سینکڑوں نوٹ گاؤں چھوڑ کر چلے جائیں گے۔"[۱۴۱] خود غرض ہونے کے علاوہ دونوں کردار بہت سادہ لوح بھی ہیں۔ اسی لیے تو وہ شہر میں اس شخص کی تقریر کے مفہوم کو سمجھنے سے سے قاصر رہتے ہیں جو یہ کہہ رہا ہوتا ہے ۔"ڈرو اس سیلاب سے جو آنے والا ہے اور جب وہ سیلاب آتا ہے تو کمزور طاقتور کو سولی پر چڑھا کر قہقے لگاتا ہے۔"[۱۴۲] اس شخص کی تقریر کا لبِ لباب تو جمہوریت تھا جبکہ یہ دونوں اس کا سادہ مفہوم سمجھتے ہیں۔ قینچی دبلا پتلا ہوتا ہے لہذا وہ موٹے اور ہٹے کٹے "پتھر" کو دیکھ کر قہقہ لگاتا ہے اور اسے خوفزدہ کر دیتا ہے۔ بعد میں سچ مچ دریائے چناب میں سیلاب کے آنے کے بعد جب قینچی پتھر کو خالی مکان کی چھت پر حفاظتی تدبیر اختیار کرنے کے طور پر لاتا ہے تو پتھر یہ سمجھتا ہے کی قینچی نے اس کے خلاف سازش کی ہے اور دھوکے سے اسے یہاں پر لایا ہے تاکہ پتھر جلدی مر جائے۔ صادق حسین نے ان حقیقی طور پر معصوم کرداروں کے ذریعے ایک ہی نکتہ اٹھایا ہے کہ وہ معاشرہ جہاں پر لوگوں کی سوچ کا مرکز و محور صرف دو وقت کی روٹی کا حصول ہو وہ لوگ جمہوریت کے مفہوم سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ بحیثیتِ مجموعی دونوں کردار غربت کے ہاتھوں مجبور مگر سادہ لوح ہیں۔

افسانہ "پہلا قدم" کی کردار نگاری خوب ہے۔ یہ افسانہ دو کرداروں پر مشتمل ہے۔

شکیلہ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی سلیقہ شعار اور وفادار بیوی اور ماں کے فرائض بااحسن وخوبی انجام دیتی ہے۔ شکیلہ کے کردار کے ذریعے صادق حسین جو بات سمجھانا چاہتے ہیں وہ ہے عائلی زندگی اور اس سے متعلق اہم امور و مسائل۔ عام گھریلو اور خوشگوار سادہ خاندانی زندگی کا حسن برقرار رکھنے میں عورت کا خاصا کردار ہوتا ہے۔ یہاں یہ جملہ صادق آتا ہے کہ ایک کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اور ایک عورت کی تعلیم معاشرے کی تعلیم ہوتی ہے۔ کیونکہ عورت اپنی سمجھداری اور فرض شناسی سے جو کام انجام دے سکتی ہے وہ شاید ہی معاشرے میں کوئی مرد تنہا کر سکتا ہو۔ عورت مرد کی زندگی میں خوشیوں اور اطمینان کے ساتھ ساتھ اسکی زندگی میں سکون لانے کا سبب بنتی ہے۔ اگر عورت گھریلو امور کی انجام دہی میں کوئی کسر نہ چھوڑے تو وہ گھر جنت کا نمونہ بن جاتا ہے۔ جیسے افسانے

میں ''شکیلہ ''گھریلو کام کاج کے ساتھ ساتھ اپنے خاوند کی ہر مشکل میں مدد کرنے کو تیار رہتی ہے۔اس کا خاوند جب معذور ہو کر بستر پر پڑ جاتا ہے تب بھی وہ اسے تسلیاں دیتی ہے۔وہ تسلی آمیز الفاظ مظہر کے لیے تحریک کا کام کرتے ہیں ۔شکیلہ اس حقیقت سے آشنا ہے کہ معاشرے میں اس کی عزت اور وقار اُس کے شریک حیات کے دم سے قائم ہے۔

عورت کو جو تحفظ اسکا شوہر فراہم کر سکتا ہے وہ کوئی اور شخص نہیں۔ ہمارے معاشرے میں عورت کی حیثیت اپنے مرد کے بغیر صفر ہو جاتی ہے۔لہذا شکیلہ اپنے میاں کی سلامتی اور صحت یابی کے لیے ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔اور کامیاب رہتی ہے۔ ہسپتال کے دنوں میں جب مظہر سارا سارا دن بستر پر لیٹا لیٹا مایوس اور تنگ ہو جاتا ہے تو یہ اُسے تسلی دیتی ہے کہ اپنے تمام درد مجھے دے دو مجھ میں اتنی ہمت اور طاقت ہے کہ تمھارے درد خود سمیٹ سکوں اور تمھیں سکون اور راحت میسر کر سکوں۔

"وہ مظہر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہتی'' یہ درد میرا ہے اس کا راستہ نہ روکو۔اسے میرے پاس آنے دو۔''مظہر جسم کا درد بھول کر خیالوں کی حسین وادی میں گم ہو جاتا ہے۔"[۱۴۳]

شکیلہ کی یہی تسلی و تشفی اُس کے خاوند کو حوصلہ دیتی اور وہ اپنی تمام تکالیف کو بھول کر مستقبل کے بارے میں سہانے سپنے بنتا۔اگر شکیلہ اُسے یہ حوصلہ اور طاقت نہ بخشتی تو وہ اتنے جلدی صحت یاب نہ ہو سکتا۔اس طرح افسانے میں شکیلہ بلند حوصلے والی اور فرض شناس مشرقی عورت کے کردار میں دکھائی گئی ہے۔

صادق حسین نے شکیلہ جیسے کردار کے ذریعے عورت کی نفسیات کی ترجمانی بہت سلیقے سے کی ہے۔ماں کے مامتا کے جذبے سے لے کر سہاگ کو قائم و دائم رکھنے تک کے سفر میں شکیلہ جن جن مراحل سے گزرتی ہے ان تمام باتوں سے صادق حسن کی فکری دانشوری اور انسانی نفسیات سے آگاہی کا ثبوت ملتا ہے۔شکیلہ خالصتاً مشرقی عورت کے روپ میں دکھائی گئی ہے۔ جس سے عورت کے سماجی و خاندانی فرائض اور ذمہ داریوں کا پتا چلتا ہے۔ایک تعلیم یافتہ عورت اپنے فرائض کو باحسن وخوبی انجام دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ شکیلہ ان تمام اوصاف سے بھرپور اور متحرک کردار ہے جو ہر قدم ہر مصالحت کی عادی ہے اور زندگی کے دھارے کے ساتھ بہنے کو اپنے لیے راہ نجات سمجھتی ہے۔

افسانے کا دوسرا کردار مظہر کا ہے گو کہ افسانے میں اسے ضمنی کردار کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مظہر کے کردار کے بغیر افسانہ تشکیلی مراحل سے نہ گزر سکتا۔ مظہر متوسط گھرانے سے تعلق رکھنے والا تعلیم یافتہ کردار ہے جو پیشے کے لحاظ سے پروفیسر ہے۔ تمام طلبہ ءطالبات اس سے محبت کرتے ہیں کیونکہ اس کا شمار فرض شناس اور بہترین اساتذہ میں ہوتا ہے۔جب ایکسیڈنٹ کی وجہ وہ ہسپتال میں داخل ہوتا ہے تو طلبہ و طالبات کی ایک لمبی قطار خون کا عطیہ دینے کے لیے وہاں موجود ہوتی ہے۔اپنے استاد کے حوالے سے جاں نثاری کی یہ بہترین مثال ہے اور اس بات کا ثبوت بھی کہ طالب علم مظہر کو کتنا پسند کرتے ہیں اور اس سے کتنی محبت کرتے ہیں۔

افسانے میں ذمہ دار ہونے ساتھ ساتھ مظہر محبت کرنے والا اور وفا شعار شوہر بھی ہے۔ شادی کے پانچ سال بعد بھی جب شکیلہ اور مظہر اولاد کی نعمت سے محروم ہوتے ہیں تو مظہر پھر بھی شکیلہ کی دلجوئی کرتا ہے اور اُسے کسی بھی قسم کی احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہونے دیتا۔ اور اس کی محبت میں اس وقت بھی رتی بھر فرق نہیں آتا۔ جب عزیز و اقارب اور محلے والے شکیلہ کی اولاد کی نعمت سے محرومی کے حوالے سے چہ مگوئیاں کرتے ہیں۔ "عزیز و اقارب میں چہ مگوئیاں ہونے لگیں لیکن مظہر کی محبت میں رتی بھر فرق نہ آیا۔" مظہر کی محبت اور وفاداری کے حوالے سے اس کے طلباء بھی مثالیں دیتے ہیں۔ "پروفیسر مظہر کے قدم زمین پر پڑتے ہیں تو خاک کے ذرے ذرے صدا دیتے ہیں ہم محبت ہیں ہمیں اپنی جھولی میں ڈال لو۔"۱۴۴ مظہر ایک روایتی کردار ہے۔ اور اس کے ذریعے صادق حسین نے خاندانی و گھریلو زندگی کی ترجمانی بہت اچھوتے انداز میں بیان کی ہے اور اس معاشرتی حقیقت کو آشکار کیا ہے کہ خاندانی زندگی، اجتماعی معاشرتی زندگی میں اپنا نمایاں مقام رکھتی ہے۔ اور سماج کی باہمی کڑیوں میں ارتباط و تسلسل پیدا کرنے کا سبب خوشگوار خاندانی نظام ہے۔ اس کے کامیاب ازدواجی زندگی کا راز بھی میاں بیوی کی ذہنی ہم آہنگی پر منحصر ہے۔

افسانے میں مظہر اور شکیلہ کے کردار کے ذریعے صادق حسین نے یہ تاثر دیا ہے کہ ان کے افسانوی کردار واقعی حقیقی زندگی کے قریب تر ہیں۔

افسانہ "ادھار" نئی تہذیب کے اثرات اور معاشرتی تبدیلیوں کو موضوعِ بحث لاتا ہے۔ اس افسانے کی خصوصیت اس لیے زیادہ ہے کہ اس میں مرکزی کردار واحد متکلم کی صورت میں دکھایا گیا ہے۔ قابل غور بات یہی ہے کہ افسانہ کی فضا قائم کرنے کے لیے صادق حسین نے ذیلی کرداروں کا سہارا لیا۔ بظاہر تو اس افسانے میں کوئی مرکزی کردار نظر نہیں آتا۔ تاہم پھر بھی افسانے میں نمبردار کا کردار نمایاں ہے۔ کیونکہ گاؤں کی آئین سازی مرتب کرنے اور دیگر قانونی و غیر قانونی معاملات سے نمٹنا عموی طور پر گاؤں کے نمبردار کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ نمبردار کا کردار فرض نبھانے والے اور سربراہ کی شکل میں دکھایا گیا ہے۔ جو پورے گاؤں کی اصلاح اور خوشحالی کے لیے نہ صرف فکر مند رہتا ہے بلکہ گاؤں والوں کی بہتری کے لیے اہم اقدامات کے ساتھ مناسب فیصلے بھی کرتا ہے۔ گاؤں میں جب نئی تبدیلی کی بنیاد پڑتی ہے اور کالونی بننا شروع ہوتی ہے۔ تو حکومتی منصوبے کے تحت سائیں بابا کے مزار کو مسمار کرنے کے لیے شہری کارروائیاں شروع کرتے ہیں۔ تو گاؤں والے مقدس مزار شہریوں پر حملہ آور ہوتے ہیں تو اس مشکل گھڑی میں بھی نمبردار سمجھداری کا ثبوت دیتے ہوئے انہیں تسلی دیتا ہے کہ خاطر جمع رکھو مزار کو نقصان پہنچانے والوں پر سائیں بابا کا جلال جب اثر انداز ہو گا تو یہ خود بخود بوریا بستر سمیٹ کر چلتے بنیں گے۔ کیونکہ سائیں بابا جلالی آدمی تھے۔ اور تاریخی حوالے سے یہ بھی مشہور تھا کہ ماضی میں کسی گاؤں کے رہنے والوں نے جب ایسے مقدس مزار کی پامالی کی کوشش کی

تھی تواُن پر خدا کا قہر نازل ہوا تھا اور آسمان پر لہو کی سرخی پھیل گئی تھی۔ اس طرح کی تقریر سے وہ گاؤ ں والوں کو خونی پیش قدمی سے روکنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

"نمبر دار بولا۔ نیلی چھتری ولا سب کچھ دیکھتا ہے۔ سائیں بابا جلالی بزرگ تھے جو مشین مزار کے قریب جائے گی ریزہ ریزہ ہو جائے گی۔ ڈرائیور اندھا ہو جائے گا۔ آج آسمان پر لہو کی سرخی پھیلے گی۔ بجلی کوندے گی، خوفناک طوفان آئے گا۔" ۱۴۵

الغرض جب بھی گھمبیر سے گھمبیر مسئلہ گاؤں والوں کو پیش آتا نمبر دار اپنی سیاسی بصیرت سے کام لے کر ہر معاملے کو بااحسن و خوبی حل کرتا۔ نمبر دار سمجھدار اور عقل مند ہونے کے ساتھ ساتھ غیرت مند بھی ہے۔ کیونکہ جب اسکی بیوی اور بیٹی شہری تہذیب کے زیرِاثر شہری عورتوں کی تقلید کرتے ہوئے تنگ لباس پہنتی ہیں تو نمبر دار غیض و غضب کا اظہار کرتا ہے۔ اور اپنی بیوی کو ان تمام باتوں سے منع کرتا ہے یہاں تک کہ ایک روز وہ برانگیختہ ہو کر چھری سے اپنی بیوی پر وار کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اسکی بیٹی تاجی بیچ بچاؤ کر کے باپ کو روکتی ہے لیکن نمبر دار کی آنکھیں غیرت اور شرم کے مارے جھک جاتی ہیں کیونکہ اس کی بیٹی بھی شہری عورتوں کی طرح لباس پہنے باپ کے سامنے تھی۔" بابل! تاجی دوڑ کر سامنے آگئی۔ نمبر دار نے آنکھیں نیچی کر لیں۔ تاجی نے کسا ہوا لباس پہنا ہوا تھا۔" بحیثیت مجموعی نمبر دار کا کردار مثبت کردار ہے۔ اور نمبر دار جیسے کردار کو سامنے رکھتے ہوئے صادق حسین نے اُن حساس سماجی عوامل کی جانب ہماری توجہ مبذول کروائی ہے جو ہر طرح کے معاشرے اور باہمی میل جول کے لیے ضروری ہیں۔ خاص کر اسلامی معاشرے اور ماحول سے تعلق رکھنے والے مشرقی اقدار کے نمائندگان کے لیے یہ بات سمجھنا بہت ضروری ہے کہ نئی تہذیب کو خوش آمدید کہنا بری بات نہیں اس کی مثبت باتوں میں پیروی کی گنجائش تو نکلتی ہے لیکن مکمل طور خود کو نئی تہذیب کے سپرد کر کے اپنی پہچان کو گنوا دینا دانشمندی نہیں۔ اپنے کلچر، اپنی تہذیب اور اپنی معاشرتی و مذہبی اقدار کو فروغ دینے میں ہی انسان کی ترقی و بقاء کا راز مضمر ہے۔

"اور سورج نکل آیا" افسانہ غربت و افلاس سے متاثرہ معاشرے کی ترجمانی کرنے والا افسانہ ہے جس کی کہانی صرف ایک کردار "اکبر" کے گرد گھومتی ہے۔ اکبر مثبت اور منفی، ظالم اور مظلوم، بے رحم اور رحم دل جیسی امتزاجی خصوصیات رکھنے والا کردار ہے۔ افسانے کے ابتدائی حصے وہ ظالم اور سفاک شخص کی صورت میں نظر آتا ہے۔ جبکہ افسانے کے اختتامی حصے میں وہی رحمدل شخص کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

بنیادی طور پر کوئی بھی انسان برا نہیں ہوتا۔ وقت اور حالات انسان کو اچھا یا برا بنانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ غربت انسان کے لیے وہ سب سے بڑا مسئلہ ہے جس کے سامنے دنیا کے باقی تمام مسائل چھوٹے اور حقیر معلوم ہوتے ہیں۔ غربت کے ہاتھوں مجبور افراد ہر طرح کا کام کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ یہ پیٹ کی آگ ہے۔ جس کو بجھانے

کے لیے نحیف سے نحیف شخص میں انجانی قوت عود کر آجاتی ہے۔اکبر بھی بھوک کی وجہ سے ہی مظلوم بنتا ہے اور یہی بھوک اسے ظالم اور سفاک انسان کا روپ دھارنے پر مجبور کر دیتی ہے۔اکبر کا بچپن غربت میں گزرتا ہے۔اس کو وہ منظر بہت اچھی طرح سے یاد تھا جب اس کی ماں نے بھوک کی وجہ سے جان دی تھی۔اس وقت کوئی بھی اسکی ماں کی پکار کو سن نہیں پایا تھا۔"اور اس کی ماں نے بھات! بھات! بھات!! پکار پکار کر جان دی تھی وہ پکار اب بھی اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔"[146] صادق حسین نے اکبر کی نفسیات کی ترجمانی کرتے ہوئے مجبور اور مفلس لوگوں کے مسائل کو سامنے لایا ہے۔اکبر برا انسان نہیں تھا لیکن وقت اور حالات اسے ظالم بننے پر مجبور کر دیتے ہیں۔یہی وجہ ہے جب اس کے پاس ناجائز ذرائع سے دولت اکٹھی ہوتی ہے تو وہ نہ صرف اس پر غرور کرتا ہے بلکہ گاوں کے لوگوں کو فاقوں مرتا دیکھ کر اسے یک گونہ طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔کیونکہ جب اس کی ماں بھوک کی وجہ سے مری تھی تو گاوں کے کسی فرد نے اس کی مدد نہ کی تھی اور اب وہ اپنے ماضی کی تلخ یادوں کا انتقام لوگوں کو مشکل میں دیکھ کر خوشی کے احساس کو خود پر طاری کر کے لیتا ہے۔"جب وہ سیانا ہوا تھا تو اس نے اپنی آنکھوں سے اپنی ماں کو قحط کی بھٹی میں جلتے دیکھا تھا۔"[147] صاحبِ اختیار اور دولت مند ہو جانے کے بعد اکبر ہر وہ کام کرتا ہے جس نے ماضی میں اسے تکلیف پہنچائی ۔مثلاً اپنے باپ کی طرح وہ بھی تین شادیاں کرتا ہے اور اپنی بیویوں کی مار کٹائی بھی اس لیے کرتا ہے کیونکہ اس کا باپ بھی اس کی ماں کو مارا کرتا تھا۔اس طرح اپنی اس وقت کی بے بسی کا انتقام وہ اپنی بیوی کی پٹائی کر کے لیتا ہے۔اسکی ماں نے ازدواجی زندگی میں کوئی سکھ نہیں دیکھا تھا اس کی ماں اسے کہا کرتی تھی۔"تیرا باپ ایک جلاد تھا وہ مجھے بہت مارا پیٹا کرتا تھا۔"[148] یہ تمام باتیں تھیں جس نے اکبر کی نفسیات کو بہت متاثر کیا تھا لہذا اختیارات ملتے ہی وہ اپنے اور ماں پر کئے گئے ہر ہر ظلم کا انتقام لیتا ہے۔لیکن بنیادی طور پر وہ حساس اور کمزور دل کا مالک ہوتا ہے۔زمانے کی اونچ نیچ اسے سفاکی کا یہ لبادہ اوڑھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔افسانے کا اختتامی حصہ پڑھ کر قاری خود یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اکبر کا کردار درد مند، حساس دل رکھنے والا سچا کردار ہے۔جس کا بھیانک ماضی اور شاندار حال کا ملا جلا امتزاج اسے نفسیاتی طور پر بے چین رکھتا ہے۔اپنے باورچی خانے میں چوری کی غرض سے داخل ہونے والے غریب اور ستم گزیدہ شخص کی بے بسی اور قابل رحم حالت دیکھ کر اکبر کا دل پسیج جاتا ہے اور اس کی آنکھوں سے امڈتے آنسو دیکھ کر اس کی بیویاں حیران رہ جاتی ہے۔"جھنجھلاہٹ، بے چارگی، اور پھر انجانے جذبات کا ایک ہجوم اس کی آنکھوں میں ڈبڈبانے لگا۔"افسانے میں اپنی طرف سے دوسروں پر ڈھائے جانے والے ستم کے بارے میں سوچنا، جیسے بیوی کو ناحق تھپڑ مارنا، بھوکے فقیر کو کھانا دینے کی بجائے برا بھلا کہنا اور پھر اس کی لاش ویرانے میں پڑے دیکھ کر مضطرب ہو جانا۔یہ تمام باتیں اکبر کی نرم دلی کی ضمانت دیتی ہیں۔

"پیپل، پاؤں اور دائرے" کا مرکزی کردار "اکبر" ہے جو نچلے دیہاتی متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ افسانے میں اکبر صادق حسین کے بیشتر کرداروں کی طرح، غربت کے ہاتھوں مجبور اور بے بس کردار ہے۔ اکبر معصوم اور بھولا بھالا شخص ہے جس پر زندگی کے حقائق یکے بعد دیگرے جب کھلتے چلتے جاتے ہیں تو وہ حیران رہ جاتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں غریبی ہی انسان کے لیے سب سے بڑے عیب کا درجہ رکھتی ہے۔

اکبر والدین کے انتقال کے بعد بھیک میں مانگے ہوئے کھانے پر قناعت کرتا ہے۔ "ہر روز اکبر صحنک لے کر در در صدا دیتا۔" یوں کہیں سے اسے شوربہ اور کہیں سے روٹی یا پھر ساگ اسے مل جاتا۔ اس کے بدلے میں مولوی صاحب اسے عربی، فارسی اور اردو پڑھاتے اور رہنے کے لئے چھت بھی مہیا کرتے ہیں۔

صادق حسین نے اکبر کی جذباتیت اور دلی کیفیات کی ترجمانی کر کے انسانی زندگی میں "محبت" کی اہمیت سے روشناس کرایا ہے۔ کوئی بھی انسان جذبات سے عاری نہیں ہوتا اور جوانی جذبات کی شدت کے ساتھ ہر شخص پر آتی ہے۔ اور ہر شخص محبت کے لمس اور محسوسات سے محظوظ ہوتا ہے۔

> "مگر وہ جانتا تھا اس کا دل لہولہان ہو گیا ہے۔ زخم کھانے سے اُسے ایک عجیب سی لذت محسوس ہوئی۔ اس نے سوچا شاید اسی زخم کی کھوج میں انسان عمر بتا دیتا ہے اور شاید ہر شخص کی ایک چھمیاں ہوتی ہے۔ جس کے بغیر اس کی کائنات مکمل نہیں ہو سکتی۔"(۴۹)

جوانی میں ہر شخص محبوب کے حوالے سے سپنے بنتا ہے۔ اور جب انھی سپنوں کے شیش محل ٹوٹتے ہیں تو انسان کے پاس اپنے وجود کی کرچیوں کے سوا کچھ نہیں بچتا۔

انسان کی تربیت و پرورش کا اثر اس کی شخصیت پر بھی پڑتا ہے اور نیک خون اُسے ہر طرح کی برائی سے باز رکھتا ہے۔ اکبر کا خاندانی پس منظر شریف تھا اسی لیے وہ یوسف کے اصرار کرنے پر اُسے شراب پینے سے منع کرتا ہے۔ اسی طرح پیپل کے درخت کے بارے میں بار بار سوچنا اور لوگوں کو پیپل کے درخت کے متعلق یہ بتانا کہ جس زمین پر پیپل کا درخت ہو وہ خدا کی زمین ہے باقی سب تو انسان بانٹ لیتے ہیں در حقیقت، اکبر کی اضطراری کیفیت اور مثبت سوچ کی نمائندگی کرتا ہے۔

اکبر کا کردار مثبت کردار ہے جسے پورے غور غوض اور تجربے کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد بڑی مہارت سے تخلیق کیا گیا۔ افسانہ "دس نمبریا" شیدو کا کردار معاشرے کے ان لوگوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ جو اوروں کے لیے محبت ہمدردی اور رحمدلی جیسے جذبات رکھتے ہیں۔ صادق حسین کی شخصیت میں بطور افسانہ نگار جو وصف نمایاں نظر آتا ہے وہ یہ کہ صادق حسین برے سے برے شخص اور بدنام زمانہ کرداروں میں بھی اچھائی کا پہلو نکال لیتے ہیں۔ استاد شیدو کے ذریعے صادق حسین نے واضح کیا ہے کہ انسان کو اس کے ظاہری افعال کی وجہ سے اچھا یا برا نہیں کہنا چاہیے جس طرح

ایک سکے کے دورخ ہوتے ہیں اسی طرح انسان کی شخصیت میں بھی برائی کے ساتھ اچھائی کا پہلو بھی جڑا ہوتا ہے۔ اور جس طرح تمام درخت پھل دیں یا نہ دیں سایہ ضرور دیتے ہیں بالکل اسی طرح انسان بھی اچھائیوں اور برائیوں کا مجموعہ کہلاتے ہیں۔ اس لیے جہاں اچھے لوگوں کے اندر برائی کا پہلو تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے وہیں برے لوگوں کے اندر بھی اچھائی کا پہلو تلاش کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ظاہری طور پر بُرے انسان کے اندر بھی ایک اچھا انسان چھپا ہو سکتا ہے۔

استاد شیدو کا شمار بھی انھی لوگوں میں ہوتا ہے جو بظاہر ہمیں معاشرتی سطح پر ٹھکرائے ہوئے اور بدنام زمانہ لگتے ہیں۔ لیکن درحقیقت وہی معاشرے کے مصلح ہوتے ہیں۔ یہی لوگ حقیقت میں معاشرے کے درد کو سمجھتے ہیں۔ اور ہمدرد اور غمگسار ہوتے ہیں اور دوسروں کی تکالیف کو دور کرنے کے لیے اپنی زندگیوں کو مشکلات میں ڈال دیتے ہیں۔ دردمندی اور غمگساری کا یہی جذبہ انھیں لوگوں میں مقبول عام بنا دیتا ہے۔ استاد شیدو بھی اپنے علاقے کے لوگوں کا مسیحا بن کر اُن کے تمام مسائل کو حل کرتا ہے۔ اس حوالے سے استاد شیدو کا کردار مثبت ہے۔ اس کی نرم دلی کی مثال یوں سامنے آتی ہے جب اُس کے محلے کی ایک لڑکی بچہ جنتے ہوئے جان کی بازی ہار جاتی ہے کیونکہ محلے میں کوئی ڈاکٹرنی اُس وقت میسر نہیں ہوتی اور استاد شیدو اپنے ساتھیوں کے ذریعے شہر سے ڈاکٹرنی لانے کا انتظام کرتا ہے لیکن اُسے دیر ہو جاتی ہے۔

استاد شیدو کو بڑی شکست سے دوچار ہونا پڑتا ہے کیونکہ وہ بروقت اپنے محلے کی بیٹی کی جان نہیں بچا سکا اس پر اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ "گلی کے نکڑ پر بجلی کے کھمبے سے ٹیک لگائے استاو شیدو چپ چاپ کھڑا تھا۔ برقی قمقمے کی روشنی میں آنسوؤں کے قطرے اس کی آنکھوں میں تھرتھرا رہے تھے۔" ۱۵۰

استاد شیدو کا کردار صادق حسین کے ایک اور افسانوی کردار "دادو" سے مماثلت رکھتا ہے۔ صادق حسین کے ایسے کردار جو شیلے اور توانا کرداروں کی صورت میں نظر آتے ہیں جن کے ظاہری اعمال تو معاشرے اور قانون کی نظر میں قابل قبول نہیں ہوتے لیکن ان کے اندر چھپے شخصی اوصاف اُن کی تمام برائیوں کے غبار کو دھو کر معاشرے میں پسندیدگی کا درجہ اختیار کر جاتے ہیں۔ تمام تر برائیوں کے باوجود ان کی شخصیت کا کوئی ایک مثبت پہلو انہیں قابل احترام بنا دیتا ہے۔ اس حوالے سے روبینہ کنول اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہیں۔

> "صادق حسین کے ایسے افسانے پڑھ کر منٹو کے بعض ایسے کردار یاد آ جاتے ہیں جو برائیوں کا مجموعہ ہوتے ہیں لیکن ان میں اچھائی کی ایک آدھ کرن ایسی ہوتی ہے۔ جس کی چمک اُن کی شخصیتوں کو قابل احترام بنا دیتی ہے۔" ۱۵۱

استاد شیدو کے کردار کے ذریعے صادق حسین نے اجتماعی زندگی کے حوالے سے انسانوں کے مسائل ان کے جذبات احساسات ،افکار ،اور نفسیاتی رد عمل کی نشاندہی اور عکاسی بہت عمدگی سے کی ہے جواُن کے فنِ افسانہ نگاری کی خدمت گزاری کا پورا پورا حق ادا کرتی ہے۔

یہ کہنا بے جانہ ہو گا کہ صادق حسین کے افسانوی کردار معاشرے کے جیتے جاگتے افراد ہیں۔آپ کے افسانوی کردار موضوع، مواد اور مناظر سے مطابقت رکھتے ہیں۔ آپ نے اپنے کرداروں کے ذریعے عام افرادِ معاشرہ کی زندگیوں میں پیش آنے والے مسائل کا ذکر کیا۔اور ان کے احساسات، پسند و ناپسند، خواہشات، جذبات، خوشیوں اور مسرتوں کو ان کے معاشرتی تناظر کے حوالے سے پرکھا اور بیان کیا ہے۔اس لحاظ سے دیکھا جائے توآپ کے کردار حقیقی ہیں اور اپنے ساتھ ایک مکمل سماجی پس منظر لیے ہوئے ہیں۔ جنھیں صادق حسین نے فنی باریکیوں کے ساتھ پیش کیا۔

ان کے افسانوی کرداروں کا مشاہدہ اور مطالعہ کرنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ آپ انسانی فطرت سے بخوبی آگاہ ہیں۔آپ نے انسانی نفسیات کا تجزیہ بھرپور انداز میں کیا ہے۔آپ انسانی نفسیات کے گہرے نباض ہیں۔آپ کے کردار کسی ایک طبقے تک محدود نہیں،آپ نے ہر طرح کے اشخاص کی زندگیوں کا نہ صرف مشاہدہ کیا،انھیں خود پر طاری کیا اور پھر احاطۂ تحریر میں لایا۔آپ کو اپنے کرداروں کے جذبات واحساسات کی عکاسی کرنے میں خوب ملکہ حاصل ہے ۔کوئی بھی کردار ہو آپ قاری کو اس کے جذبات واحساسات کے بارے میں ضرور آگاہ کرتے ہیں۔آپ کے کرداروں کی خصوصیت یہی ہے کہ آپ کے افسانوں میں اکیلا کردار کہیں بھی نظر نہیں آتا۔دو یا دو سے زائد کردار ہر افسانے میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ان کے بعض افسانوں جیسے "تیسری حویلی"، "برگد کا پیڑ"، "انسان اور صلیب" وغیرہ میں ضمنی کرداروں کو مسلسل پیش کر کے سماجی روابط کو گہرا اور مربوط بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔آپ نے کرداروں کی تشکیل میں انصاف سے کام لیا ہے۔المختصر اپنے افسانوی کرداروں کی ماہرانہ تخلیق سے آپ نے منصف اور ذمہ دار ادیب ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ عبدالسلام صدیقی۔کرشن چندر کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ(نئی دہلی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۴ء)،ص ۴۴۔

۲۔ راناعبدالرحمٰن۔(مرتب)افسانے صادق حسین(لاہور: بک ہوم پبلشرز،۲۰۱۲)،ص ۲۱۔

۳۔ ایضاً،ص۱۵۔

۴۔ ایضاً،ص۱۸۔

۵۔ انواراحمد۔اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ(فیصل آباد:مثال پبلشرز،۲۰۱۰ء)ص ۳۱۳۔

۶۔ افسانے صادق حسین،ص۲۲۔

۷۔ ایضاً،ص۲۵۔

۸۔ ایضاً،ص۲۹۔

۹۔ ایضاً،ص۳۱۔

۱۰۔ ایضاً،ص۴۲۔

۱۱۔ ایضاً،ص۴۲۔

۱۲۔ ایضاً،ص۴۹۔

۱۳۔ ایضاً،ص۴۹۔

۱۴۔ ایضاً،ص۵۲۔

۱۵۔ ایضاً،ص۵۴۔

۱۶۔ ایضاً،ص۵۹۔

۱۷۔ ایضاً،ص۵۸۔

۱۸۔ ایضاً،ص۶۲۔

۱۹۔ ایضاً،ص۶۳۔

۲۰۔ ایضاً،ص۷۱۔

۲۱۔ ایضاً،ص ۷۲

۲۲۔ ایضاً، ص ۷۴۔

۲۳۔ ایضاً، ص ۷۴۔

۲۴۔ ایضاً، ص ۸۰۔

۲۵۔ ایضاً، ص ۸۱۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۸۸۔

۲۷۔ ایضاً، ص ۹۱۔

۲۸۔ ایضاً، ص ۹۱۔

۲۹۔ ایضاً، ص ۹۶۔

۳۰۔ ایضاً، ص ۹۷۔

۳۱۔ ایضاً، ص ۹۷۔

۳۲۔ ایضاً، ص ۱۰۶۔

۳۳۔ ایضاً، ص ۴۶۵۔

۳۴۔ ایضاً، ص ۱۱۹۔

۳۵۔ ایضاً، ص ۱۱۵۔

۳۶۔ ایضاً، ص ۱۱۶۔

۳۷۔ ایضاً، ص ۱۱۷۔

۳۸۔ ایضاً، ص ۱۲۳۔

۳۹۔ ایضاً، ص ۱۲۲۔

۴۰۔ ایضاً، ص ۱۲۶۔

۴۱۔ ایضاً، ص ۱۳۰۔

۴۲۔ ایضاً، ص ۱۳۰۔

۴۳۔ ایضاً، ص ۱۳۰۔

۴۴۔ ایضاً، ص ۱۳۳۔

۴۵۔ ایضاً، ص ۱۳۹۔

۴۶۔ ایضاً، ص۱۴۴۔

۴۷۔ ایضاً، ص۱۴۷۔

۴۸۔ ایضاً، ص۱۵۰۔

۴۹۔ ایضاً، ص۱۵۰۔

۵۰۔ روبینہ کنول، صادق حسین کی افسانہ نگاری (ملتان: بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ۱۸۹۸۷ء)، ص۱۷۰۔

۵۱۔ افسانے صادق حسین، ص۱۵۷۔

۵۲۔ ایضاً، ص۱۵۹۔

۵۳۔ ایضاً، ص۱۶۶۔

۵۴۔ ایضاً، ص۱۶۶۔

۵۵۔ ایضاً، ص۱۷۰۔

۵۶۔ ایضاً، ص۱۶۷۔

۵۷۔ ایضاً، ص۱۷۲۔

۵۸۔ ایضاً، ص۱۷۳۔

۵۹۔ ایضاً، ص۱۷۳۔

۶۰۔ ایضاً، ص۱۷۴۔

۶۱۔ ایضاً، ص۱۷۵۔

۶۲۔ ایضاً، ص۱۷۹۔

۶۳۔ ایضاً، ص۱۹۳۔

۶۴۔ ایضاً، ص۱۹۶۔

۶۵۔ ایضاً، ص۱۹۹۔

۶۶۔ ایضاً، ص۲۰۰۔

۶۷۔ ایضاً، ص۲۰۰۔

۶۸۔ ایضاً، ص۲۰۳۔

۶۹۔ صادق حسین کی افسانہ نگاری،ص۱۵۱۔

۷۰۔ افسانے صادق حسین،ص۲۰۸۔

۷۱۔ ایضاً،ص۲۰۵۔

۷۲۔ ایضاً،ص۲۰۷۔

۷۳۔ ایضاً،ص۲۱۲۔

۷۴۔ ایضاً،ص۲۲۱۔

۷۵۔ ایضاً،ص۲۳۳۔

۷۶۔ ایضاً،ص۲۴۱۔

۷۷۔ ایضاً،ص۲۴۶۔

۷۸۔ ایضاً،ص۲۲۴۔

۷۹۔ ایضاً،ص۲۲۴۔

۸۰۔ ایضاً،ص۲۴۱۔

۸۱۔ ایضاً،س۲۴۶۔

۸۲۔ ایضاً،س۲۴۳۔

۸۳۔ ایضاً،ص۲۵۷۔

۸۴۔ ایضاً،ص۲۵۴۔

۸۵۔ ایضاً،ص۲۵۱۔

۸۶۔ ایضاً،ص۲۵۲۔

۸۷۔ ایضاً،ص۲۵۸۔

۸۸۔ ایضاً،ص۲۹۱۔

۸۹۔ ایضاً،ص۲۸۰۔

۹۰۔ ایضاً،ص۲۸۳۔

۹۱۔ ایضاً،ص۳۲۱۔

۹۲۔ ایضاً،ص۳۱۲۔

۹۳۔ ایضاً، ص۳۱۵

۹۴۔ ایضاً، ص۳۱۵

۹۵۔ ایضاً، ص۳۴۴۔

۹۶۔ ایضاً، ص۳۵۵۔

۹۷۔ ایضاً، ص۳۶۴۔

۹۸۔ ایضاً، ص۳۷۰۔

۹۹۔ ایضاً، ص۳۷۲۔

۱۰۰۔ ایضاً، ص۳۸۴۔

۱۰۱۔ ایضاً، ص۳۵۸۔

۱۰۲۔ ایضاً، ص۴۱۴۔

۱۰۳۔ ایضاً، ص۴۰۶۔

۱۰۴۔ ایضاً، ص۴۰۶۔

۱۰۵۔ ایضاً، ص ۴۱۲

۱۰۶۔ ایضاً، ص۴۱۳۔

۱۰۷۔ ایضاً، س۴۱۵۔

۱۰۸۔ ایضاً، ص۴۱۲۔

۱۰۹۔ ایضاً، ص۴۱۳۔

۱۱۰۔ ایضاً، ص۴۱۶۔

۱۱۱۔ ایضاً، ص۴۱۷۔

۱۱۲۔ ایضاً، ص۴۲۴۔

۱۱۳۔ ایضاً، ص۴۳۱۔

۱۱۴۔ ایضاً، ص۴۳۴۔

۱۱۵۔ ایضاً، ص۴۳۸۔

۱۱۶۔ ایضاً، ص۴۶۴۔

۱۱۷۔ ایضاً، ص ۴۶۴۔

۱۱۸۔ ایضاً، ص ۴۶۵۔

۱۱۹۔ ایضا، ص ۴۶۶۔

۱۲۰۔ ایضاً، ص ۴۶۶۔

۱۲۱۔ ایضاً، ص ۴۶۵۔

۱۲۲۔ ایضاً، ص ۴۶۵۔

۱۲۳۔ ایضاً، ص ۴۶۸۔

۱۲۴۔ ایضاً، ص ۴۶۶۔

۱۲۵۔ ایضاً، ص ۴۶۴۔

۱۲۶۔ ایضاً، ص ۴۶۸۔

۱۲۷۔ ایضاً، ص ۴۷۱۔

۱۲۸۔ ایضاً، ص ۴۷۲۔

۱۲۹۔ ایضاً، ص ۴۷۳۔

۱۳۰۔ ایضاً، ص ۴۷۴۔

۱۳۱۔ ایضاً، ص ۴۹۰۔

۱۳۲۔ ایضاً، ص ۴۸۰۔

۱۳۳۔ محمد عقیل، سید، سماجی تنقید اور تنقیدی عمل (تہذیبِ نو پبلی کیشنز، ۱۹۸۰ء)، ص ۶۶۔

۱۳۴۔ افسانے صادق حسین، ص ۴۹۶۔

۱۳۵۔ ایضاً، ص ۵۰۵۔

۱۳۶۔ ایضاً، ص ۴۹۶۔

۱۳۷۔ ایضاً، ص ۴۹۷۔

۱۳۸۔ ایضاً، ص ۴۹۷۔

۱۳۹۔ ایضاً، ص ۴۹۶۔

۱۴۰۔ ایضاً، ص ۴۹۶۔

۱۴۱۔ ایضاً،ص۴۹۷۔

۱۴۲۔ ایضاً،ص۴۹۹۔

۱۴۳۔ ایضاً،ص۵۱۲۔

۱۴۴۔ ایضاً،ص۵۰۱۔

۱۴۵۔ ایضاً،ص۵۲۶۔

۱۴۶۔ ایضاً،ص۵۲۶۔

۱۴۷۔ ایضاً،ص۶۵۲۔

۱۴۸۔ ایضا،ص۵۲۵۔

۱۴۹۔ ایضاً،ص۵۲۶۔

۱۵۰۔ ایضاً،ص۵۴۴۔

۱۵۱۔ صادق حسین کی افسانہ نگاری،ص۱۱۳۔

باب چہارم:

صادق حسین کے افسانوں میں سماجی شعور

(تجزیاتی مطالعہ) بحوالہ اسلوب

کسی بھی ادبی تحریر کو پر تاثیر بنانے کے لیے ان تمام وسائل کا استعمال کرنا جو اس تحریر کے معانی و مطالب میں نہ صرف خوبصورتی پیدا کرے بلکہ اسے فصیح و بلیغ بنانے میں بھی نمایاں کردار ادا کرے اسلوب کہلاتا ہے۔ اسلوب کسی بھی لکھنے والے کا وہ خاص اندازِ تحریر ہے جو اُسے دوسرے لکھاریوں سے مختلف کرتا ہے اور اس کی انفرادیت کو برقرار رکھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ ہر فنکار اپنے فن کا اظہار مخصوص انداز میں کرتا ہے۔ اس میں فنکار کی شخصی انفرادیت نمایاں ہوتی ہے۔ اسلوب کا تعلق موضوع اور زبان سے ہوتا ہے۔ یہ فنی صلاحیت خداداد ہوتی ہے اور مسلسل ریاضت کے ذریعے بھی پیدا کی جا سکتی ہے۔ افسانے میں بھی دوسری اصنافِ ادب کی طرح لکھنے کے خاص انداز کو اسلوب کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر فوزیہ اسلم اسلوب کے حوالے سے لکھتی ہیں:

> "افسانہ لکھے ہوئے لفظ ہی کا نام نہیں اس لفظ سے منتقل ہونے والی واقعیت، تکنیک کا تنوع و پلاٹ کی ثروت، کمپوزیشن کا حُسن، ترتیب کا شکوہ، لفظیات کا چناؤ، لکھنے والے کی مشق، زندگی سے حاصل تجربات کی کشید، تمثال خیال و دلفریب پیکر، فکر و نظر اور شخصیت کا انعکاس یہ سب مل کر افسانے کی تشکیل بھی کرتے ہیں اگر لکھنے والا ہنر مند ہے تو ذات کی بالیدگی و ہنر کاری کا حصہ بن کر ایک منفرد اسلوب کو جنم بھی دیتی ہے جو لکھنے والے کو صاحب اسلوب کا درجہ عطا کرتا ہے۔"[1]

اسلوب ایک لکھنے والے کو دوسرے لکھاریوں سے ممتاز کر کے نمایاں بناتا ہے۔ پال ویری(Paul Vairy) اسلوب کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "اسلوب اظہار ذات میں ترتیب کو بامعنی بناتا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ اظہار ذات کیا ہے۔ اس کے فطری تقاضوں کا انکشاف کرتا ہے۔ یہ فکر کی اصل صورت سے قطعی لاتعلق ہوتا ہے۔ کہ فکر کا اپنا کوئی اسلوب نہیں ہوتا۔ یہ اظہار کا فن ہی ہے جو ایک فنکار کو دوسروں سے ممیز کرتا ہے۔"[2]

یعنی ہر فکر کو ایک خاص انداز میں احاطۂ تحریر میں لانے کا نام اسلوب ہے۔اور وہ مخصوص انداز ہی ایک لکھاری کو دوسرے لکھاریوں سے ممتاز کرواتا ہے۔

گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ مصنف کا وہ خاص اندازِ تحریر جس کے ذریعے اُس نے اپنے عہد کی تاریخ احوال، اور اہم واقعات کو قلمبند کیا ہوا اسلوب کہلاتا ہے۔ گوپی چند نارنگ اسلوب کے مباحث کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"اسلوبیات کا بنیادی تصور اسلوب ہے۔ اسلوب(Style) کوئی نیا لفظ نہیں ہے۔ مغربی تنقید میں یہ لفظ صدیوں سے رائج ہے۔ اردو میں اسلوب کا تصور نسبتاً نیا ہے۔ تاہم زبان و بیان، انداز و اندازِ بیان و طرز بیان، طرزِ تحریر، لہجہ، رنگ و رنگ سخن وغیرہ اصطلاح میں اسلوب یا اس سے ملتے جلتے معنی میں استعمال کی جاتی رہیں ہیں۔ یعنی کسی بھی شاعر یا مصنف کے اندازِ بیان کے خصائص کیا ہیں؟ یا کسی صنف یا ہیت میں کسی طرح زبان استعمال ہوتی ہے کیا کسی عہد میں زبان کیسی تھی اور اس کے خصائص کیا تھے۔ وغیرہ یہ سب اسلوب کے مباحث ہیں۔"[۳۱]

بلاشبہ تحریروں کی خوبصورتی اُس کے اندازِ بیان سے واضح ہوتی ہے اور اندازِ بیان میں رنگ بھرنے کی لیے الفاظ و محاورات و جملوں کا استعمال، منظر نگاری اور تشبیہات و استعارات جیسے عناصر تحریروں کو خوبصورت بناتے ہیں۔ صادق حسین کے افسانوں میں بھی جو سب سے زیادہ توجہ طلب چیز ہے وہ ہے اُن کا اندازِ بیان۔ آپ کا اندازِ تحریر معاصر افسانہ نگاروں سے اس لیے بھی منفرد ہے کہ آپ جغرافیائی تناظر اور ماحول و معاشرے کو مد نظر رکھتے ہوئے افسانوں کے پلاٹ مرتب کرتے ہیں۔ وہ جن خطوں اور علاقوں کا ذکر افسانوں میں کرتے ہیں وہاں کے رہن سہن و رسم و رواج اور تہذیب و ثقافت سے بھی روشناس کرواتے ہیں۔ جغرافیائی تناظر اور اُن کی مناسبت سے متعلق جس انداز سے وہ معاشرے کی عکسبندی کرتے ہیں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اور یہی وصف ان کی تحریروں کو حقیقی روپ دینے میں مدد کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی تحریروں میں کسی بھی قسم کے جھوٹ اور فرضیت کا شائبہ نہیں ہوتا۔

صادق کے افسانوں میں مقامی مشاہدے اور تجربے کی عکاسی پائی جاتی ہے جو ان کے عصری شعور کے ساتھ ساتھ سماجی شعور کی بھی ترجمانی کرتی ہے۔ ان کے افسانوی اسلوب کی نمایاں خصوصیت "بیانیہ انداز" ہے۔ انہیں زبان و بیان پر مکمل عبور حاصل ہے۔ وہ الفاظ کی اہمیت سے نہ صرف پوری طرح آگاہ ہیں بلکہ الفاظ کا درست اور برملا اظہار کرنے پر بھی خاص گرفت رکھتے ہیں۔ صادق حسین کا اندازِ بیان شگفتہ اور پرتاثیر ہے۔

اُن کی تحریروں میں جملوں کے مواد کے ساتھ ساتھ ایک خاص ربط اور تعلق نظر آتا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے وہ زبان کا استعمال بڑے قرینے، اہتمام اور احترام کے ساتھ کرتے ہیں۔ آپ کی تحریروں میں نمایاں ہونے والے عناصر میں منظر نگاری، جزئیات نگاری، خاکہ نگاری، روزمرہ، محاورات تشبیہات، لفظی تضاد، علامات و کنایہ جات،

تکرار، وتجسس پنجابی وہندی زبان کے الفاظ، بنگالی زبان کے الفاظ، صوتی عناصر شامل ہیں۔ یہ تمام تحریری عناصر صادق حسین کی قلم پر مکمل گرفت کو ظاہر کرتے ہیں۔ صادق حسین کے اندازِ تحریر کے حوالے سے رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

"صادق حسین زبان شائستہ اور ہموار لکھتے ہیں نہ قلم کو بے قابو ہونے دیتے ہیں نہ جذبات کو پڑھنے والا جلد محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ اچھی باتیں اچھے شخص یا آرٹسٹ سے سُن رہا ہے۔"[۴]

اس سے یہ ظاہر ہوتا کہ صادق حسین کی تحریروں میں ایک توازن ہے جو انہیں دوسرے افسانہ نگاروں سے ممتاز کرتا ہے۔

منظر نگاری:

صادق حسین زبان وبیان پر گرفت کے حوالے سے اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے۔اُن کے اسلوب بیان کا انفرادی وصف فضاسازی ہے۔ فضاسازی اور منظر نگاری میں جن اہم نکات اور الفاظ کا سہارا لے کر وہ افسانے کے پلاٹ کا تانا بانا بنتے ہیں۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا پسندیدہ ترین موضوع دیہات ہے۔وہ جس خطے کی بات کرتے ہیں۔ سب سے پہلے وہ اس کے ماحول سے آشنا کرواتے ہیں اور اسکا مکمل نقش اور تاثر قاری کے ذہن میں اتارنے کے بعد اس کہانی کی شروعات کر کے مکمل تصویر پیش کرتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس متعلقہ ماحول اور معاشرے کا حصہ رہے ہیں۔ وہ خالی اور خیالی لفظوں کا سہارا لے کر خلاؤں یا ہواؤں میں بات نہیں کرتے بلکہ پوری باریکی کے ساتھ لفظوں کا چناؤ کرتے ہیں اور حرف حرف اور نکتے نکتے کو اس ربط اور تسلسل کے ساتھ جوڑتے ہیں کہ پوری تصویر اُبھر کر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔پڑھے لکھے اور مہذب اور امیر طبقے کی نمائندگی کرتے ہوئے وہ منظر کشی بھی اسی ماحول کے مطابق کرتے ہیں۔"میرے پلنگ پر سفید چادر بچھی ہوتی ہے۔ جس پر میتھ کی کتاب اوندھی پڑی ہوتی ہے۔ شیلفوں میں انگریزی کتابیں سجی ہوئی ہیں۔"[۵] امراء کے گھروں کی آرائش وزیبائش ان کے شایانِ شان ہوتی ہے۔ جس کی مزید وضاحت وہ افسانے میں یوں کرتے ہیں۔"دروازوں پر بنفشی پردے لٹک رہے ہیں۔تپائی پر اُن کا فوٹو رکھا ہے اور اس فوٹو کے پاس گلدان میں کیوڑے کے پھول مسکرا رہے ہیں۔"[۶]

غریب طبقہ اور خاص کر جھگیوں میں رہنے والے لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے جھگی کے اندرونی منظر کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

"جھونپڑی میں دو ایرانی چٹائیاں بچھی تھیں۔ جن پر دو تکیے رکھے ہوئے تھے۔ تکیوں کا بیچ کا حصہ چکناہٹ اور میل کی وجہ سے سیاہی مائل ہو چکا تھا۔ تکیوں کے کونوں سے پرانے تولے کے گالے باہر نکل رہے تھے۔ایک پتھر پر ٹین کا

ڈبہ رکھا تھا۔ چولہے کے پاس ایک ہانڈی، ایک گھڑا، دو رکابیاں، اور ایک پیالہ پڑا تھا۔ ایک کونے میں لکڑی کا صندوق رکھا تھا۔ جس کے پہلو میں ڈاؤ نظر آ رہا تھا۔ اسی ڈاؤ سے سبزی اور مچھلی کاٹی جاتی تھی۔"۷

صادق حسین جس کلچر کی بات کرتے ہیں اس سے متعلق تمام تر معلومات منظر نگاری کے ذریعے کرتے ہیں۔ اور بوقت ضرورت کچھ نئے الفاظ یا اشیاء کے ناموں جو بالخصوص نئے ہوں۔ اُن کی وضاحت بھی ساتھ ہی کر دیتے ہیں تا کہ قاری کو کسی بھی قسم کی الجھن یا پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ جیسے مندرجہ بالا اقتباس میں وہ "ڈاؤ" کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور ساتھ ہی وضاحت کر دیتے ہیں کہ ڈاؤ ایک قسم کا چھری نما آلہ ہے جو مچھلی کو کاٹنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ دیہاتی سماج ہو یا شہری آپ منظر نگاری بہت قرینے سے کرتے ہیں۔ افسانہ "مولا پہلوان" میں پیر جی کا عرس دیکھنے کے لیے ٹولی کی صورت میں جانے والے دیہاتیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اس دن پیر جی کا عرس تھا، مرد و عورتیں اور بچے جوق در جوق مزار کی طرف جا رہے تھے۔ بانکے مردوں نے کلف لگے ہوئے صافے اس ڈھنگ سے باندھ رکھے تھے کہ ایک کے بجائے دو دو شملے دائیں بائیں سے نکلے ہوئے تھے۔ عورتوں کے ہونٹوں پر دنداسے کی بھوری چمک تھی۔ اور آنکھوں نے ڈوری دار سُرمے کی کالی کالی بدلیاں، مردوں نے ڈوری دار حاشیوں والی شلواریں پہن رکھی تھیں۔ کوئی ہاتھ میں حقہ لئے ہوئے تھا اور کسی کے کاندھے پر بچہ بیٹھا ہوا جلیبیاں کھا رہا تھا۔"۸

صادق حسین کی منظر نگاری کا نقطہ عروج وہاں نظر آتا ہے جہاں وہ "ٹافی انکل" افسانہ میں ٹافی انکل کی موت کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سارا منظر ٹی وی اسکرین پر چلتے ہوئے مناظر کی طرح قاری کی نگاہوں کے سامنے گھوم رہا ہو۔ اس حوالے سے اقتباس ملاحظہ ہو۔

"مرد عورتیں، بچے سب کے سب ادھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ جدھر ایک چھڑی زمین پر یوں اطمینان سے پڑی تھی۔ جیسے ایک انسان کی دوستی نے اسے سکھا دیا ہو کہ خدا کی بھیجی ہوئی موت اتنی ہی خوبصورت ہے جتنی کہ زندگی۔ اس کے پاس ہی ایک سنہرے فریم والی عینک، قانون شہادت کے تقاضے پورے کرنے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ اس عینک کے دور کی نظر کے محرم شیشے بند آنکھوں کو الوداع کہہ چکے تھے۔"۹

صادق حسین کے افسانوں میں منظر نگاری اُن کے فطرت سے لگاؤ کو ظاہر کرتی ہے۔ شام کے وقت کی منظر کشی اُن کے افسانہ "زعفران کے پھول" میں دیکھی جا سکتی ہے۔

"مغرب میں ارغوانی شعاعیں، ارشد کے خیالوں کی طرح بکھر گئیں۔ کونجیں قطار باندھ کر اڑتی شمال کی طرف نکل گئیں۔ جنگلی کبوتر آشیانوں کی طرف پرواز کرنے لگے۔ جھیل کے پانی میں تیرتی بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو ہڑپ کر گئی۔ ارشد کے اعصاب کی طرح تھکا ماندہ سورج چپ چاپ جھیل میں اُتر گیا۔"۱۰

صادق حسین جس مہارت کے ساتھ واقعات اور مظاہر فطرت کو لفظوں کے ذریعے زیبِ قرطاس کرتے ہیں اسکا کوئی جواب نہیں۔اُن کے تمام افسانوں میں خواہ وہ "بوفے "ہو یا" کچنار"،" برگد کا پیڑ" ہو یا "کلیوں کی پکار"، "درانتی کا گیت"ہو یا "پکار"عیسائی برادری سے تعلق رکھنے والے افراد کی زندگیوں پر مبنی افسانہ "انسان اور صلیب"ہو یا دیہی تہذیب کے انہدام کے موضوع پر ان کا افسانہ ہو "ادھار"سب افسانوں میں منظر کشی انتہائی خوبصورتی کے ساتھ کی گئی ہے۔

سراپانگاری:

آپ کرداروں کی سماجی و معاشرتی حالت کو ظاہر کرنے کے لیے اُن کی شخصیت کا خاکہ لفظوں کے ذریعے کھینچے میں بھی کمال چابکدستی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔خاکہ کھینچنا ہو یا پیکر تراشی ہو یا سراپا نگاری صادق حسین کرداروں کی حالت اور سراپے کو بھی بڑی باریک بینی کے ساتھ تمام تر تفاصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں جو اُن کی قوتِ مشاہدہ اور عصری سماجی شعور کی عمدہ ترین مثال پیش کرتا ہے۔

افسانہ "دو چھٹانک چاول"میں بوڑھی مانگو کی غربت و افلاس کو ظاہر کرنے کے لیے اس کا خاکہ اس انداز سے کھینچتے ہیں:

> "اس کے دائیں ہاتھ میں سونٹا ہے اس کا بایاں ہاتھ سپید ابروؤں کو چھوتا ہوا آنکھوں پر سایہ کیے ہوئے ہے۔اس کے ہاتھ کی پشت پر نیلی نیلی رگیں اُبھری ہوئی ہیں۔اس کے چہرے کی جھریاں ایسی معلوم ہو رہی ہیں جیسے تالاب کا پانی خشک ہو جائے پر ہر تہہ کی چکنی مٹی چلچلاتی دھوپ کی تاب نہ لا کر پھٹ جائے۔"[۱۱]

سراپا نگاری میں صادق حسین کو کمال دسترس حاصل ہے۔وہ جس کردار کا سراپا کھینچتے ہیں۔اس کی مکمل تصویر ،اور حلیہ بیان کر دیتے ہیں کہ کردار قاری کی نگاہوں کے سامنے چلتا پھرتا متحرک کردار کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔

افسانہ "درانتی کا گیت"میں زمیندار اعظم خان کا حلیہ کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔

> "جب شفق کی سُرخی پھیلنے لگی تو اس عظیم الشان عمارت کے صدر دروازے سے اعظم خان بڑی بڑی مونچھوں کو تاؤ دیتا باہر نکلا۔سفید لیننن کا لمبا کُرتا، لٹھے کی تہمد، پاؤں میں زری کا کھُسہ، سر پر زری کا کلاہ اور اس پر ململ کا کلف دار صافہ جس کے طُرے نے چھ فٹ اونچے قد کو اور لانبا کر دیا تھا۔"[۱۲]

سراپا نگاری کے نمونے صادق حسین کے متعدد افسانوں میں مشاہدہ کیے جا سکتے ہیں۔جیسے افسانہ قانون اور کانٹے میں وہ پولیس کانسٹیبل کے حلیے کو کچھ اس انداز سے بیان کرتے ہیں۔

"پہلے دن جب اسلام آباد ٹریفک پولیس کی خصوصی یونیفارم پہن، تھانے سے باہر نکلا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے ہر شخص اس کی طرف دیکھ رہا۔ نیلی پتلون، سفید پیٹی، آسمانی رنگ کی قمیض، بائیں بازو پر کالی اور سفید دھاریوں والی پٹی، سفید دستانے، سیاہ جرابیں اور بوٹ سر پر نیلے رنگ کی بیرٹ کیپ، اس نے سوچا اس وقت اگر اس کی ماں وہاں موجود ہوتی تو اسے دیکھ کر کتنی خوش ہوتی۔"[۱۳]

اسی طرح افسانہ "نانی انکل" کا سراپا اور "دس نمبریا" میں جیلر اور ڈاکوؤں کے حلیے کی مثال دیکھی جا سکتی ہے۔

صادق حسین کے اسلوب بیان اور طرزِ نگارش اُن کی قوتِ مشاہدہ کی صداقت کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ وہ اعتدال پسند افسانہ نگار کی حیثیت سے منظر عام پر آئے۔ ڈاکٹر انور سدید ان کی فنی صداقت کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"خوبی کی بات یہ ہے کہ صادق حسین نے انسان کی احتیاج کا مقصدی پروپیگنڈا نہیں کیا۔ بلکہ ایک بے غرض افسانہ نگار کی طرح اس ماحول کی عکاسی اور داخلی تصویر کشی میں جزئیات کی باریکی اور مشاہدے کی صداقت کا خلوص مندانہ ثبوت دیا ہے۔ اور اس نے ان چھپے ہوئے جذبوں کو بھی گرفت میں لینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ جنہیں ایک عام افسانہ نگار بیان کرنے کی قوت نہیں رکھتا۔"[۱۴]

ہم کہہ سکتے ہیں کہ صادق حسین نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ ان کے اپنے فن سے سچی لگن اور اخلاص کی عمدہ ترین عکاسی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ذاتی تجربات و مشاہدات ہیں جنہیں لفظی باریکیوں کے ساتھ بیان کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

کرداروں کے نام:

صادق حسین کے افسانوں کا نمایاں وصف حقیقت پسندی، زندگی کا تنوع اور معاشرتی رنگارنگی کے ساتھ مشاہدہ کی صداقت اور گہرائی بھی ہے۔ اُن کے افسانوی کردار، چاہے وہ مرکزی کردار ہوں یا ضمنی کردار اُن کے نام مخصوص ماحول اور جغرافیے کا عکس پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ جیسے دیہاتی ماحول اور ثقافت کو ظاہر کرنے کے لیے وہ کرداروں کے نام بھی ان کے ماحول کے مطابق رکھتے ہیں۔ ذیل میں اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

"کرم جان"، "جلال شاہ"، "چھیماں"، "شیرا"، "فجا"، "حمیدا کڑیل"، "شرفو"، "بھاگ بھری"، "ماسی جنتے"، "میرا"، "کرموں"، "تاباں"، "فضلاں"، "جانوں"، "داراں"، "الفو"، "ریشماں"، اور "شبو"، وغیرہ ایسے نام ہیں جو عموماً دیہاتوں میں لوگ رکھتے ہیں۔

اسی طرح پڑھے لکھے اور اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کے نام بھی اُسی ماحول اور سماج کے مطابق رکھتے ہیں۔ مثلاً

"مسز ناصر"، "مسز جمیل"، "شبنم"، "ظفر"، "امانت"، "حفیظ" وغیرہ تہذیب یافتہ معاشرے اور خطوں کی نشاندہی کرنے والے نام ہیں۔

ہمارے معاشرے میں ایک یہ چیز بھی نمایاں ہوتی نظر آتی ہے۔ خاص کر غیر تعلیم یافتہ اور ان پڑھ طبقہ میں لوگوں کے ناموں کے ساتھ اُن کے پیشوں کو منسلک کر کے پکارا جاتا ہے۔ جیسے "جیرا پہلوان"، "بشیرا پہلوان"، "مھاجا قصائی"، "نظیراں دھوبن"، "فقیرا فیونی"، "رحیا مالشی"، "استاد کرچھی"، "سیدو کمہار"، "دتا لوہار"، "منگا ڈرائیور"، "استاد نتھو نہاری والا"، اور "شیر املنگی" وغیرہ مختلف افسانوی کرداروں کے نام ہیں۔ جو صادق حسین کے افسانوں میں نظر آتے ہیں۔ ان کرداروں کے ناموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ صادق حسین کا مشاہدہ بڑا عمیق ہے۔

صادق حسین نے نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کی زندگیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے اُن کے مسائل اور تہذیب و ثقافت سے روشناس کروایا ہے۔ جھگیوں میں رہنے والے افراد اور بھکاری کلچر کی نمائندگی کرنے والوں کے دھندوں کا ذکر ان کے ناموں کے ساتھ جس انداز میں بیان کرتے ہیں اس کی بہترین مثال ان کے افسانہ "اس پل پر" دیکھی جا سکتی ہے۔

"شیدو جیب کترا"، "نورا جواری"، "شاہ چن چراغ کی درگاہ کی فقیرنی"، "دلبر خان"، "نادرو فقیرنی"، "سائیں گلابا" اور "موجی بابا" وغیرہ بھکاری کلچر کی نمائندگی کرنے والے نام ہیں۔

اسی طرح "مسیحی برادری" کا ذکر کرتے کرتے ہوئے افسانہ "انسان اور صلیب" اور "تیسری حویلی" میں کرداروں کے نام مسیحی کلچر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جیسے "الفریڈ"، "مسٹر ہملٹن"، مسز فریڈرک"، "کلارک"، "ملبارن"، "ربیکا"، "دلشاد مسیح" اور "رحمتاں" وغیرہ۔

بالکل اسی انداز میں وہ دیگر مذاہب جیسے سکھ اور ہندو وغیرہ سے تعلق رکھنے والے افراد کو جب افسانوں میں جگہ دیتے ہیں تو اُن کے نام بھی اسی ماحول اور مذہب کے مطابق رکھتے ہیں۔ "جرنیل سنگھ"، "مہندر سنگھ"، "جونت کور"، "راجونتی" سکھ مذہب کی عکاسی کرنے والے نام ہیں۔

افسانہ "روپ ونتی" مکمل ہندی سماج کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ اس کے کرداروں کے ناموں میں "روپ ونتی"، "شنکر دادا"، "موسی دیپک"، "پریتم"، "پارو"، "چکرورتی" وغیرہ شامل ہیں۔

جزئیات نگاری:

منظر نگاری کے علاوہ جزئیات نگاری صادق حسین کی پہچان ہے۔ وہ افسانوں میں باریک بینی کے ساتھ چھوٹی چھوٹی جزئیات پر بھی توجہ مرکوز رکھتے ہیں۔ خواہ وہ جزئیات ماحول اور مناظرِ فطرت سے متعلق ہوں یا تہذیب اور کلچر کو ظاہر کرنے کے لیے صادق حسین پوری مہارت کے ساتھ ایک ایک نقطے کو واضح کرتے ہیں کہ وہ واقعہ ہو یا منظر اس کی مکمل شکل قاری کی نگاہوں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔ اس لیے یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ صادق حسین کے افسانوں میں جزئیات نگاری اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ موجود ہے۔

دیہاتوں کے معمولاتِ زندگی کو بیان کرتے ہوئے وہ افسانہ "دشمن" میں لکھتے ہیں۔

"چرواہے مویشیوں کو ہانکتے، چراگاہوں میں پہنچ گئے۔ لڑکیاں پانی سے بھرے گھڑے سروں پر اُٹھائے کنویں کا آخری پھیرا لگا آئیں۔ گوالے شہر میں حلوائی کی دکانوں پر دودھ پہنچا کر خالی گاگریں لیے واپس آ گئے۔ سگھڑ عورتیں اُپلے تھاپ کر دوسرے گھریلو دھندوں میں مشغول ہو گئیں۔"۱۵

جزئیات کے انتخاب کے سلسلہ میں انہوں نے بظاہر غیر اہم اور غیر معمولی پہلوؤں پر ترجیح دی ہے اور اپنی تصویر کو خواہ وہ واقعہ کی ہو یا کردار کی انھیں معمولی رنگوں سے شوخ اور تیکھا بنایا ہے۔ ذیل میں چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

"دوسرا شو ختم ہو چکا تھا۔ سینما گھروں کے چہرے رنگ برنگ کے برقی قمقموں سے جگمگا رہے تھے۔ دیواروں پر چسپاں اداکاروں کی تصویریں ڈرامائی انداز سے راہ چلتوں کو آواز دے رہی تھیں۔ دلہن کی طرح سجی پان سگریٹ کی دکانوں میں بلا کی چہل پہل تھی۔ گردے تل کر بیچنے والے مخصوص پیشہ ورانہ ڈھنگ سے توے پر کفگیرے بجا بجا گاہکوں کو متوجہ کر رہے تھے۔ فٹ پاتھ پر کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ سڑک پر کاریں، سائیکلیں، رکشے، تانگے، اسکوٹر، افراتفری کے عالم میں دوڑ رہے تھے۔"۱٦

غریب اور مفلوک الحال طبقہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں اور اُن کے مخصوص ماحول کی عکاسی کرتے ہوئے انھوں نے جزئیات اور باریکیوں کو جس طرح بیان کیا ہے اس حوالے سے اُن کے عمیق سماجی مطالعہ کا پتا اُن کے افسانہ "اترن" میں لنڈے کے کوٹ کی تراش خراش سے لگایا جا سکتا ہے "کوٹ کی تراش نہایت خوبصورت تھی، گھیرا مناسب کمر کی چنٹیں موزوں، گریبان کی لوٹ پر ستھرا بخیا، سینے پر بسنتی کڑھت کی پھبن۔"۱۷

اسی طرح افسانہ "سورج مکھی" میں کلب میں موجود لوگوں اور اُن کے لباس اور خواتین کے میک اپ کے حوالے سے تفصیلات بہت شاندار انداز میں فراہم کی ہیں۔ ذیل میں اس حوالے سے اقتباس درج کیا جاتا ہے:

"لپ اسٹک سے آراستہ ہونٹوں پر کھیلتی ہوئی مسکراہٹیں پنسل سے کھنچے ہوئے ابرؤں کی کمانیں سینٹ کی بھینی بھینی خوشبوء آنکھوں میں دوڑتے گلابی ڈورے ،ڈریس سوٹوں میں کسے ہوئے مردوں کی جچی تلی شائستگی، رنگ برنگ کے لباس زیب تن کئے جوان اور ادھیڑ عمر عورتیں۔"۱۸؎

تشبیہات:

صادق حسین اپنے اسلوب بیان کو جلا بخشنے کے لیے حسبِ ضرورت تشبیہات کا استعمال بھی کیا ہے۔انھوں نے تشبیہات کے استعمال سے عمومیت سے خصوصیت پیدا کی ہے۔اُن کی ہر تشبیہ اپنے پیچھے ایک مکمل اور واضح تصویر لیے ہوئے ہے۔ جسے صادق حسین کمال فن سے بر محل استعمال کر کے قاری پر تاثر برقرار رکھتے ہیں۔اور پڑھنے والا پورا تاثر قبول کر کے وہی ذہنی اور جذباتی نتائج اخذ کرتا ہے جو لکھنے والے کے ذہن میں ہوتا ہے۔ تشبیہات کے استعمال میں بھی وہ ماحول اور کلچر کو ملحوظ خاطر رکھتے ہیں۔ جیسے افسانہ پتھیرا میں اینٹوں کے بھٹے پر کام کرنے والوں کا ذکر کرتے ہیں تو تشبیہ بھی اُسی مناسبت سے استعمال کرتے ہیں۔"پھر یکا یک اُسے مسرت کا احساس ہوا یہ سوچ کر کہ پتھیرے کا دل اینٹ کی طرح سخت نہیں۔"۱۹؎اسی طرح دکھ اور کرب کی کیفیت کو ظاہر کرنے کے لیے وہ لکھتے ہیں۔"جمیلہ کی چیخیں پھر کمرے میں گونجیں، بلند، طویل اور درد و کرب میں ڈوبی ہوئی چیخیں۔ جیسے سلوں کے نیچے لیٹے ہوئے انسان نے آخری بار پکارا ہو"۔۲۰؎افسانہ "دو چھٹانک چاول" میں افلاس زدہ مانگو کے حلیے کو واضح کرتے ہوئے اُس کے چہرے کی جھریوں کو خشک تالاب سے مشابہت دیتے ہیں۔"اُس کے چہرے کی جھریاں ایسی معلوم ہو رہی ہیں جیسے تالاب کا پانی خشک ہو جانے پر تہہ کی چکنی مٹی چلچلاتی دھوپ کی تاب نہ لا کر پھٹ جائے۔"۲۱؎جذباتی عناصر کو ظاہر کرنے کے لیے کردار کے نام اور شخصیت کی مناسبت سے تشبیہات کا استعمال بھی اُسی انداز سے کرتے ہیں۔"حمیدا کڑیل منہ زور گھوڑے کی طرح دوڑ پڑا۔"۲۲؎اسی طرح غربت اور تنگدستی کے باعث پریشان حال مزدور کا خاکہ کھینچنے کے لیے وہ اس طرح کے الفاظ و تشبیہات کا سہارا لیتے ہیں۔"جس کے چہرے پر بھوک نے مورچے بنا رکھتے تھے۔ آنکھوں کی خندقیں صدیوں کی داستانیں سمیٹے لاوا اُگل رہی تھیں۔"۲۳؎

طاقت اور دیدہ دلیری کے حوالے سے وہ حمیدا کڑیل کے لیے کچھ ایسے الفاظ اور تشبیہات کا سہارا لیتے ہیں۔"حمیدے کڑیل نے آؤ دیکھا نا تاؤ، شرفو کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر دھڑام سے یوں پٹک دیا جیسے کوئی گودا نکال کر ہڈی زمین پر دے مارے۔"۲۴؎

کئی جگہوں پر وہ تشبیہات میں تنقیدی جھلک بھی دکھا جاتے ہیں جیسے افسانہ "انسان" میں "منگو" کے حلیے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔"اس کے پاؤں دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے کالی مٹی کے دو بے ہنگم لوندے بنا کر ان پر ابھرواں لکیریں کھینچ دی ہوں۔"۲۵

ذیل میں کچھ اور تشبیہات درج کی جا رہی ہیں جو صادق حسین فنی بصیرت اور منفرد انداز بیان کی عمدہ مثال پیش کرتی ہیں۔"اُس نے ماسی بھاگ بھری کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کوئی زخمی ہرنی شکاری کی طرف دیکھے۔"۲۶

صادق حسین جس طرح کی تشبیہات کا استعمال کرتے ہیں ان میں قدرت، جدت کے ساتھ ساتھ انوکھا پن بھی موجود ہے جو مخصوص کلچر کی نمائندگی کرنے ساتھ ساتھ صادق حسین کے فن واسلوب کی خوبصورتی کو پیش کرتے ہیں۔"اسکی چوٹی ناگن کی طرح بل کھا کر جھاڑی میں جا اٹکی "۲۷ بعض اوقات صادق حسین انسان کی داخلی کیفیات کی اشیاء کے خارجی وجود سے موازنہ کر کے تشبیہات کو تحریروں میں جگہ دیتے ہیں۔

"پھر اس کا بے جان سر کالو چمار کی گود میں اس طرح آ گرا جیسے اسی سے ٹوٹا ہوا ڈول دھڑام سے کنویں کے ٹھنڈے اور میٹھے پانی میں گم ہو جائے۔"۲۸

"وہ ساڑھی خصوصی فرمائش پر کاریگروں نے اس چابکدستی سے تیار کی تھی کہ دیکھنے والی آنکھوں کو یوں معلوم ہوتا۔ جیسے بارش میں دُھلے سات رنگوں کی کمان کھینچی گئی ہو"۔فسانہ " زعفران کے پھول " میں شام کے وقت کا سماں باندھتے ہوئے وہ برقی قمقموں کو مقیشی دوپٹے کے ساتھ تشبیہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔"اندھیرے میں روشن قمقمے یوں نظر آنے لگے جیسے کوئی منگلا کی دوشیزہ کالے رنگ کا مقیشی دوپٹہ اوڑھ کر کسی اجنبی مسافر کی راہ تک رہی ہو۔"۲۹ صادق حسین کی تحریروں کی نمایاں خصوصیت ہی یہی ہے کہ وہ جس طرح کی صورتحال کا تذکرہ کر رہے ہوں یا جیسا سماں وہ افسانے میں باندھنا چاہتے ہوں ہر چیز کو اسی مناسبت سے ترتیب دیتے ہیں چاہے وہ الفاظ ہوں، یا محاورات، ضرب الامثال ہوں یا تشبیہات۔افسانہ زعفران کے پھول میں ارشد کی دلی کیفیات کے مطابق ہی انھوں نے تشبیہ کا استعمال کیا ہے۔جو شام کے وقت تنہائی کے لمحات کو اپنی مرحومہ بیوی کی یادوں کے سہارے گزار رہا ہے۔جب وہ زندہ تھی تو روزانہ اس کے لوٹ آنے کا انتظار کیا کرتی تھی۔یہ تشبیہ بھی ارشد کے محسوسات کی ترجمانی کرتی ہے۔اسی طرح افسانہ دھوکے باز سے تشبیہ کی اک مثال ملاحظہ ہو۔

"صبح سویرے گاؤں میں خطرے کی خبر پہنچی تو قینچی اور پتھر اکٹھے ہو گئے۔اسی طرح جس طرح چناب کی لہریں مل کر جدا ہوتی اور پھر آپ میں مل جاتی ہیں۔"۳۰ اس تشبیہ میں بھی محسوسات اور موقع محل کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔"پتھر اور قینچی" دو دوست ہیں جو آپس میں لڑتے جھگڑتے بھی ہیں لیکن پھر بھی سب کچھ بھلا کر ایک دوسرے کی

خوشی غمی میں شریک ہو جاتے ہیں۔ دریا چناب میں جب سیلاب آتا ہے تو دونوں ناراضگی کے باوجود اکٹھے ہو جاتے ہیں اور سیلاب میں ڈوب جانے والوں کی تدفین کا انتظام مل کر کرتے ہیں۔ ان کے اکٹھے ہونے کو صادق حسین نے دریا چناب کی لہروں سے تشبیہ دی ہے۔آپ تشبیہات کا استعمال بھی بر محل کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔

محاورات:

صادق حسین کے افسانوں کی فضا پر تاثیر ہے۔اُن کے جملوں میں ربط اور تسلسل ہوتا ہے اور ایسی کڑی ضرور ان کے افسانوں میں موجود ہوتی ہے۔ جو افسانے کو آگے بڑھاتی ہے۔ اس ربط و تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے وہ محاورات کا استعمال بھی بخوبی انداز میں کرتے ہیں۔ مثلاً

آپ نے محاورہ بندی کے استعمال میں مخصوص اور محتاط انداز اختیار کیا ہے۔ اور محاورات کا استعمال اس چابکدستی سے کیا ہے کہ اُن کے افسانے کسی بھی قسم کے فنی نقص سے بالاتر نظر آتے ہیں۔

افسانوں میں تجسس کی فضاء استوار کرنے کے لیے وہ کچھ اس قسم کے محاورہ جات کا استعمال کرتے ہیں۔"ایک کہرام مچ گیا، آپادھاپی پڑ گئی"۔اسی طرح ہنگامی صورتِ حال کو واضح کرنے کے لیے وہ اس طرح کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔"تمام گاؤں میں ایک تہلکہ مچ گیا۔"اسے تجسس اور حیرت کی فضا قائم کرنے کے لیے ان کا اندازِ بیان محاورات کے ساتھ کچھ ایسے نظر آتا ہے۔"اشرف دم بخود رہ گیا۔۴۲"افسانہ درانتی کا گیت میں غم وغصہ کی کیفیت کو بیان کرنے کے لیے محاورے کا استعمال بھی اسی انداز سے کرتے ہیں۔"اس کے سر کے بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھوں سے خون اُبل رہا تھا۔"۴۳

بعض اوقات ایک ہی فقرے کے اندر محاورات کے متواتر استعمال کے ذریعے جملوں اور فقرات میں خوبصورتی پیدا کرتے ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ موقع کی مناسبت سے اور بر محل محاورات کا استعمال کرنا جانتے ہیں۔افسانہ "انسان" سے چند مثالیں نمونے کے طور پر پیش کی جا رہی ہیں۔"آن کی آن میں منگو مینڈھے کو پچھاڑ دیتا پھر دھما چوکڑی مچ جاتی۔"۴۴ایک ہی جملے کے اندر متواتر محاورے کی ایک اور مثال "ادھر سے منگو علی کا نعرہ لگا کر خم ٹھونکنا کمال پھرتی سے مینڈھے کی ٹکر سے بچ کر کنی کھاتا اور پھر اس سے گتھم گتھا ہو جاتا"۔۴۵

مندرجہ بالا سطور میں آن کی آن اور پچھاڑ دینا محاورہ بروقت استعمال ہوا اور اسی طرح دوسری سطر میں بیک وقت تین محاورے یکے بعد دیگر استعمال کئے گئے جن میں "خم ٹھونکنا"، "کنی کھانا" اور "گتھم گتھا ہونا" اس طرح استعمال ہوئے کہ جملوں کا باقاعدہ تسلسل نہ صرف برقرار رہا بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اگر ان میں سے ایک محاورہ بھی اپنی جگہ سے ہل جاتا یا اس کی جگہ کوئی سادہ لفظ لکھ دیا جاتا تو اس کے اثر اور تسلسل میں وہ خوبصورتی برقرار نہ رہتی جو

ان محاورات کے استعمال سے برقرار رہی۔اور یہی بات صادق حسین کے فن کی دلیل بھی دیتی ہے کہ والفاظوں کے استعمال میں کتنی احتیاط سے کام لیتے ہیں۔اُن کے ہاں کہانی پن کا عنصر ہی نہیں دیکھنے کو ملتا بلکہ وہ کہانی کے ساتھ ساتھ کردار اور اسلوب کو بھی ملحوظ خاطر رکھتے ہیں۔

افسانوں میں انسانی رویوں اور جذبات کی عکاسی کرنے کے لیے بھی صادق حسین نے مختلف موقعوں پر محاورات کا استعمال کیا ہے۔ جیسے "خون کے گھونٹ پی کر رہ جانا" کسی بھی بات کا اثر نہ ہونے کے معنی واضح کرنے کے لیے "ٹس سے مس نہ ہونا"۔اور ان کہی بات کی وضاحت کے لیے "ہونٹوں پر جم جانا" جیسے بر محل اور خوبصورت محاورات کا استعمال صادق حسین کے حسنِ بیان کی تصدیق کرتے ہیں۔اسی طرح انسانی جذبات کے اظہار کے حوالے سے وہ "چھکے چھوٹ جانا"، "گھگی بندھ جانا"،اور "ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑنا" وہ تمام محاورات ہیں جو مختلف قسم کیا انسانی کیفیات اور جذبات کے اظہار کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔جذبات کی عکاسی کے حوالے سے محاورات کی کچھ اور مثالیں ذیل میں دیکھی جاسکتی ہیں۔"اُدھر دیکھتا تو آنکھوں کو چکا چوندسی آجاتی ادھر دیکھتا تو دل بیٹھ جاتا۔" افسانہ "خون اور پانی" میں امانت میاں کی خوشی کو واضح کرنے کے لیے وہ لکھتے ہیں۔"امانت میاں کا دل بلیوں اچھلنے لگا" ۳۶۔ خون کی پگڈنڈی سے ایک مثال ملاحظہ ہو۔ "اسی طرح جس طرح وہ اپنی ننھی گلشن کو دیکھ کر باغ باغ ہو جایا کرتا تھا۔" ۳۷ گلشن کی پریشان ماں کی دلی کیفیت کو واضح کرنے کے لیے وہ دل میں چور بیٹھنا جیسے محاورے کا استعمال کرتے ہیں۔" چنانچہ اُس دن سے زیناں کے دل میں چور بیٹھ گیا۔" ۳۸

صادق حسین محاورات کا استعمال بھی ماحول اور کردار کی مناسبت سے کرتے ہیں۔جو اُن کے سماجی شعور کے ساتھ ساتھ اُن کی فنکارانہ اور تکنیکی مہارتوں کی دلیل پیش کرتا ہے۔

خونی پس منظر کے ساتھ ساتھ انتقامی جذبات کی نمائندگی کے لیے افسانہ "خون کی پگڈنڈی" میں اس طرح کے محاورات کا استعمال کیا گیا ہے ۔ "پیچ و تاب کھانا"، "آنکھوں میں خون اترنا"، "روبرو ہونا"، "سینہ تان کر"، "آنکھوں سے خون ابلنا"، "چوٹ کھانا"، "ڈھارس بندھانا"، وغیرہ انتقامی صورتحال کی عکاسی کرنے والے محاورات ہیں۔

صادق حسین کے بیشتر افسانوں میں ایسے محاورات کا استعمال بھی دیکھنے کو ملتا ہے جو سماجی رویوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ جیسے ہمارے معاشرے میں بیوہ عورت کا کوئی مقام نہیں۔اس بات کو واضح کرنے کے لیے افسانہ "روپ ونتی" میں لکھتے ہیں۔"بیوہ کی وقعت نہیں ہوتی اپنے پرائے آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔" ۳۹

معاشرتی رویوں کے نتیجے میں انسان کی دل گرفتگی کے حوالے سے "روپ ونتی"میں روپ ونتی کی ماں کے جذبات کو یوں بیان کرتے ہیں۔"موسی کا کلیجا چھلنی ہو گیا،ذہر کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔"۹۰

آپ کے بعض افسانوں میں محاورات کا استعمال بہت زیادہ دیکھنے کو ملتا ہے اور یہی محاورات جملوں کے تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے کہانی کی بنت میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔اور کوئی بھی محاورہ فالتو اور بے جا نظر نہیں آتا۔مثلاً افسانہ "روپ ونتی"میں جن محاورات کا استعمال کیا گیا اسکی تفصیل ملاحظہ ہو۔

"دھک سے رہ جانا"، "پائی پائی جوڑنا"، "داغ لگ جانا"، "دھک دھک کرنا"، "لگائی بجھائی کرنا"، "کلیجا ٹھنڈا کرنا"، "ہکابکارہ جانا"، "خون خشک ہو جانا"، "انگلیاں دُکھنا"، "زہرے کے گھونٹ پینا"، "کلیجہ چھلنی ہونا"، "آن کی آن میں"، "ناک بھوں چڑھانا"، "تتر بتر ہونا"، "کلیجا پھٹ جانا"، "آستین چڑھانا"، "آنسوے بہانا"، "دھاڑیں مار کر رونا"، جیسے محاورات کا استعمال اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ آپ افسانے کی تخلیق میں کتنی محنت اور توجہ سے کام لیتے ہیں۔

افسانوں کی تخلیق کے حوالے سے وہ خود اس بات کا اظہار کرتے ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ افسانے کو لکھنے کے لیے اسے نہ صرف بار بار پڑھا گیا بلکہ بوقتِ ضرورت اس میں ترمیم کر کے مکمل شکل میں چھپنے کے لیے دیا گیا۔

> "میں ایک افسانہ پانچ مرتبہ لکھتا ہوں۔جو موضوع ذہن میں ہوتا ہے اس کے مطابق پہلے کردار اکٹھے کرتا ہوں۔ دوسرے نمبر پر انہیں مزید سوچتا ہوں اور ترتیب دیتا ہوں۔تیسرے نمبر پر الفاظ کی نشست و برخاست کی طرف توجہ دیتا ہوں۔چوتھے نمبر پر اسے لکھتا ہوں اور کے بعد پانچویں مرتبہ پھر لکھتا ہوں۔پھر یہ میری پراپرٹی ہوتا ہے۔ ترمیم یا اضافے کی گنجائش نہیں رہتی۔ آگے میرا فن ختم ہو جاتا ہے۔ سوچ اس سے آگے نہیں جاسکتی۔"۹۱

اس سے اندازہ ہوتا ہے کی وہ افسانہ لکھنے کیے لیے کتنا اہتمام کرتے ہیں۔محاورات اور تشبیہات کے علاوہ ضرب الامثال تلمیحات کا استعمال بھی صادق حسین کی مندرجہ بالا بات کی تصدیق کر دیتا ہے۔

ضرب الامثال:

صادق حسین نے افسانوں میں جابجا ضرب الامثال کا استعمال بھی کیا ہے اس حوالے سے اُن کا افسانہ ''آخری گاؤں'' خاص طور پر توجہ کے لائق ہے۔ جس میں وہ ضرب الامثال کا استعمال ضرورت کے مطابق کیا گیا ہے۔

جیسے "دال میں کچھ کالا ہونا" شکوک و شبہات کو ظاہر کرتا ہے۔ افسانے میں اس ضرب المثل کا اس وقت استعمال کیا گیا جب گیتوں کا شکاری آخری گاؤں میں آنے کے لیے اپنی رضامندی ظاہر کرتا ہے۔ تو گاؤں والوں کے لیے یہ بات ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اُن میں تجسس بھی سر اٹھاتا ہے کہ ایک اجنبی آخر گاؤں کیوں آنا چاہتا ہے۔ اور بھلا آج تک کسی نے گیت بھی شکار کیے۔ تب شیدو کی ماں حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہتی ہے کہ آج تک ہم نے ایسی کوئی بات نہیں سنی۔ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ یعنی معاملہ خراب ہے۔

اسی طرح "باتوں کی میٹھی میٹھی ریوڑیاں شہر میں بانٹ" میں یہ بات باور کرائی گئی ہے کہ میٹھے میٹھے لہجے سے کسی کو متاثر نہیں کیا جاسکتا، یعنی خوشامد سے مسئلے حل نہیں ہوتے جو بھی بات کرنی ہے واضح بات کی جائے۔ افسانے میں فضول تمہیدی گفتگو سے گریز کرنے کیلئے یہ کہاوت استعمال ہوئی۔ جب پنچائیت میں بیٹھے نوجوان گیتوں کے شکاری کے حوالے سے اپنی مثبت رائے کا اظہار کرنا چاہتے ہیں کیونکہ وہ پڑھے لکھے باشعور نوجوان ہیں اور یوں گاؤں میں ریسرچ ورک کے لیے آنے والے نوجوان اجنبی کی آمد پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور گاؤں کے نمبر دار سے اس حوالے سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں لیکن لحاظ مانع آتا ہے اور تمہید باندھنے کے لیے وہ الفاظوں کا سہارا شائستہ انداز میں لیتے ہیں تب گاؤں کا نمبر دار کہتا ہے۔ "باتوں کی یہ میٹھی میٹھی ریوڑیاں شہر میں بانٹنا یہاں بات کرنی ہے تو مردوں کی طرح کرو۔"

افسانے میں "بال کی کھال نکالنا" کی ضرب المثل بھی استعمال گئی "بال کی کھال نکالنا" یعنی نکتہ چینی کرنا کی ضرب المثل بھی اس وقت استعمال کی گئی جب گاؤں کے باشعور نوجوان ثقافت کی اہمیت پر روشنی ڈال کر گاؤں کے بزرگوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ گیتوں کا شکاری اگر گاؤں آتا ہے تو اس میں ہمارا فائدہ ہے کیونکہ وہ ہماری ثقافت کو تحریری صورت میں محفوظ کرنا چاہتا ہے تب نمبر دار انہیں کہتا ہے۔ "کیا بال کی کھال نکال رہے ہو" جاؤ بیٹا وقت ضائع نہ کرو۔

بالکل اسی طرح "سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے"، کی مثل بھی استعمال کر کے صادق حسین نے بھی اسے دوہرے فائدے حاصل کرنے کے معنوں میں استعمال کیا۔ اور گاؤں کا نمبر دار اپنی بیٹی کی بات پر غور کرتا ہے جب وہ اسے اور گاؤں والوں کو گیتوں کے شکاری کی آمد پر خاموش رہنے کا مشورہ دیتی ہے اس سے ایک فائدہ تو یہ ہو گا کہ

جب اجنبی نوجوان گاؤں آئے گا تو گاؤں والوں کی خاموشی اُسے واپس لوٹ جانے ک کے لیے مجبور کر دے گی اور دوسرا گاؤں والوں پر بات بھی نہیں آئے گی۔ یہ ضرب المثل بھی معاشرتی رویوں کی نشاندہی کرتی ہے۔

افسانہ "درانتی کا گیت" میں "ایک پنتھ دو کاج" کی ضرب المثل بھی کسی حد تک سماجی رویوں کی عکاس ہے۔ افسانے میں ٹھیکیدار کی فصل کی کٹائی اور ضیافت کے ذریعے علاقے بھر میں شہرت کی غرض سے یہ ضرب المثل استعمال کی گئی ہے۔ یعنی معاشرے میں بااثر افراد اپنے اثر ورسوخ کے بل بوتے پر چھوٹے لوگوں کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور ایسی چال چلتے جس سے دوسرے خوشی خوشی قبول کرتے ہیں اور فائدہ بہر حال بااثر افراد کا ہی ہوتا ہے۔ جیسے ''درانتی کا گیت'' میں ٹھیکیدار فصل کی کٹائی کو میلے کا رنگ دے کر دوہرا فائدہ حاصل کرتا ہے۔ ایک طرف پاس پڑوس کے علاقوں میں اس کی شہرت ہو جاتی ہے اور دوسرا فصلوں کی کٹائی بھی کم وقت میں پایہ تکمیل تک پہنچ جاتی ہے۔

صادق حسین نے سماجی عکاسی کے حوالے سے مقامی دیہاتی کہاوتوں کا استعمال بھی کیا ہے جو اُن کے عمیق سماجی شعور کی گواہی دیتی ہیں۔ جیسے افسانہ ''ایک رات'' میں لڑکیوں کی نشوونما کو بکائن کے پیڑ سے مشابہت دے کر واضح کیا گیا۔

"ستاباں کا بکائن کے پیڑ سے کہاوتی رشتہ تھا۔ وہ گاؤں کی بڑی بوڑھیوں سے سنتی چلی آرہی تھی کہ بیٹیاں بکائن کے پیڑ کی طرح تیزی سے بڑھ کر جوان ہو جاتی ہیں۔"[۴۲]

اس سے ثابت ہوا کہ ضرب الامثال بھی صادق حسین کے تخلیقی ادب کا حصہ ہیں۔ اسی طرح اُن کے اکثر و بیشتر افسانوں میں جو جو ضرب المثل استعمال ہوئیں وہ درج ذیل ہیں۔

"چاند چڑھے کل عالم دیکھے"، "گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشا"، "دام کی مایا کہیں دھوپ کہیں چھایا"، "جس کی لاٹھی اس کی بھینس"، "مٹی سے نکلی کوٹھوں چڑھی"، "پانچوں انگلیاں گھی میں رہنا" اور "دودھ کا دودھ پانی کا پانی کرنا" جیسی ضرب الامثال کا استعمال افسانوں میں جابجا جغرافیائی تناظر کے حوالے سے ملتا ہے جو صادق حسین کی فنی مہارتوں کی صداقت پیش کرتا ہے۔ آپ کے افسانوں کا مطالعہ کرنے سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ کہ بحیثیت افسانہ نگار وہ کتنی معمولی معمولی باتوں کا مشاہدہ رکھتے ہیں۔

صوتی عناصر:

آپ کے افسانوں میں صوتی عناصر کا مشاہدہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ آپکی قوتِ مشاہدہ کتنی شفاف اور باریک ہے۔ آپ جس ماحول کی عکاسی اپنے افسانوں میں کرتے ہیں اُس سے متعلق تمام باتیں مکمل تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ صوتی عناصر انسان کو داخل اور خارج کے علوم اور زاویوں سے آگاہی بخشتے ہیں۔ آپ نے افسانوں میں اکثر جگہ پر باریکیوں اور جزئیات کو بیان کرتے ہوئے مختلف آوازوں کو بھی زیرِ مشاہدہ رکھ کر تحریروں میں جگہ دی جیسے ڈھولک کی تھاپ سے پیدا ہونے والی آواز کے لیے۔ وہ "دھنگڑا دھنگا"، "دھنگڑا دھنگا" کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح منظر کشی کے دوران مناظر فطرت کے ساتھ وہ جانوروں کی آوازوں کو بھی نوٹ کرتے جاتے ہیں۔ کتوں کی غراہٹ کے لیے وہ "غُرفش غرفش" جیسے الفاظ کا استعمال کر کے اپنی مشاہداتی قوت کے مضبوط ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔

مرغوں کی آواز کو "ککڑوں کوں" اور چڑیوں کی چہچانے کیلئے "چُوں چُوں" اور چکور" کی آواز کو انہوں نے چک چک چلک چلک" ذریعے بیان کیا۔

ڈھولک کی "ٹھپ ٹھپ" اور "انگوٹھی کی ٹک ٹک" کا ذکر بھی ان کے بیشتر افسانوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اس کے علاوہ مرغی کی "کک کک" اور کوؤں کی "کائیں کائیں" کے ساتھ وہ آبشاروں سے گرتے پانی کی آواز پیدا کرنے کے لیے وہ "شپ شپ" جیسے الفاظوں کا استعمال کر کے اپنی فنی دسترس کی عمدہ مثالیں رقم کرتے ہیں۔

گاڑیوں کی "پوں پوں"، "درانتی کی ساڑ ساڑ" اور "حُقے کی گڑ گڑاہٹ"، وہ صوتی عناصر ہیں جو نہ صرف صادق حسین کی جمالیاتی حس کی ترجمانی کرتے ہیں بلکہ ان کی فنی مہارتوں کے بھی عکاس ہیں۔ مندرجہ بالا صوتی عناصر کے تذکرے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے جزئیات نگاری کو بخوبی قید کر کے افسانوں میں ایسی چاشنی پیدا کر دی ہے جو اُن کی تحریروں کے تاثر کو نمایاں کر کے اُن کی فنکارانہ صلاحیتوں کو واضح کرتی ہے۔ کیونکہ افسانوں کے تاثر کو قائم رکھنے کے لیے جزئیات اور تمام تر فنی باریکیوں کو براہ راست زندگی کے مشاہدے اور تجربے کا حاصل ہونا چاہیے۔

متضاد کیفیات/لفظی تضاد:

صادق حسین بعض اوقات افسانوں میں دو متضاد کیفیات کو ایک ساتھ بیان کرتے نظر آتے ہیں۔یہی لفظی تضادات،اسلوب بیان کے حوالے سے انہیں انفرادیت بخشنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

اس حوالے سے اُن کا افسانہ "پیپل، پاؤں اور دائرے" زیادہ قابل غور ہے کیونکہ اس افسانہ میں لفظی تضاد کے حوالے سے بے شمار مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں جیسے

"ایک دنیا پیچھے رہ گئ تھی۔ایک دنیا سامنے تھی"،"چھیماں دور چلی گئی تھی چھیماں قریب آگئی تھی"،"ایک چھیماں چلی جاتی ہے تو دوسری چھیماں اس کی جگہ لے لیتی ہے۔"،"میں شراب کو ناپسند کرتا ہوں مگر شراب پی کر شراب کو پسند کرتا ہوں۔"،"وہ یوسف کے ہمراہ جھوٹے اور سچے قدموں سے چلنے لگا۔"

مندرجہ بالا مثالوں پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لفظی تضاد انسانی جذبات اور رویوں کو ظاہر کرتا ہے۔ دنیا پیچھے رہنا ماضی کی نشاندہی اور دنیا آگے یا سامنے ہونا مستقبل کی طرف اشارہ ہے۔یہاں قابل غور بات یہی ہے کہ انسان ماضی کو بھلا کر زندہ دلی کے ساتھ مستقبل کو خوش آمدید کہے۔اور افسانے میں بھی مرکزی کردار "اکبر" اپنے مایوس کن ماضی کو بھلا کر خوش آئندہ مستقبل کے لیے مثبت سوچ اور اچھی امید لگا کر زندگی کے پہیے کو آگے کی طرف دھکیلتا ہے۔

اسی طرح چھیماں کا دور جانا اور قریب آنا بھی انسانی جذبات کی نمائندگی کرتا ہے اور اس بات کا ثبوت پیش کرتا ہے کہ جو مل گیا اُسے یاد رکھ جو نہ ملا اُسے بھول جا،اکبر ایک چھیماں کو بھلا کر شہری چھیماں سے دل لگا لیتا ہے۔

شراب کو پسند اور ناپسند کرنا بھی معنویت سے بھرپور ہے اور اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ بے شک شراب ام الخبائث ہے اور لوگ اسے ناپسند کرتے ہیں مگر یہ بھی حقیقت ہے جو ایک بار اسے منہ لگا لے اُسے چھوڑ نہیں سکتا۔افسانے ڈرائیور یوسف کے ذریعے انہوں نے یہ بات کہلوائی کہ میں اسے پی کر پسند کرتا ہوں۔

جھوٹے اور سچے قدموں کے ساتھ چلنا اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے جب انسان کش مکش اور گومگو کی کیفیت سے دوچار ہو تو وہ فیصلہ نہیں کر پاتا ہو۔اس لیے افسانے میں مصنف نے جھوٹے سچے قدموں کا ذکر کر کے اکبر کی ذہنی کیفیت کو ظاہر کیا ہے جو بازار حُسن جانے کے لیے تیار نہیں لیکن جوانی کی اُمنگ اور چھیماں کی خواہش اُسے آگے بڑھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔لفظی تضادات کے حوالے سے افسانہ "دس نمبریا" کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

> "جب وہ جیل تھا تو شاگردوں سے کہتا اچھا بھئی تو میں ذرا اندر کی ہوا کھا آؤں۔اور جب وہ جیل سے باہر آنے لگتا تو ساتھی قیدیوں سے کہتا اچھا دوستوں میں ذرا باہر کی ہوا کھا آؤں۔"[۳۴]

علامت نگاری:

آپ کے افسانوں میں کہیں کہیں علاقی انداز بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ مثلاً افسانہ "دو چھٹانک چاول" میں انہوں نے علامتی انداز اختیار کرتے ہوئے "راجو" کے لیے "پنچھی" کا لفظ اور نئے دیوتا کے لیے "شکاری" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ "پنچھی" آسانی سے شکاریوں کے جال میں پھنس جاتا ہے اور اس افسانے میں ڈھکے چھپے الفاظ میں صادق حسین جس معاشرتی المیے پر آواز بلند کرتے نظر آتے ہیں وہ ہے۔ "اکیلی عورت کی عزت" معاشرہ کوئی بھی ہو وہاں انسان کی مجبوریوں سے کھیل کر اپنے مفادات کو سوچنا انسان کا شیوہ ہے اور خاص کر پدر سری سماج کے اندر ایسی صورتحال زیادہ پیش آتی ہیں انسان طاقت اور روپے کے بل بوتے پر دوسروں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ "راجو" بھی قحط زدہ معاشرے سے تعلق رکھنے والی غریب لڑکی ہے جس کا واحد سہارا اس کی ماں ہے۔ "علاقے کا دیوتا"، "دو چھٹانک چاول" کے عوض اسکی عزت لوٹ لیتا ہے۔ کیونکہ وہ مجبور ہوتی ہے۔ پیٹ کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے بے بس پنچھی کی طرح وہ نئے دیوتا کے جال میں پھنس جاتی ہے۔

افسانہ "اینٹ کی بیگم" میں لفظ "اینٹ کی بیگم" علامتی رنگ لیے ہوئے ہے۔ اور یہ لفظ عورت کے لیے استعمال کیا گیا ہے پڑھے لکھے اور مہذب طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد باہمی گفت و شنید کرتے ہوئے عورت کا ذکر براہِ راست استعمال کرنے کی بجائے تاش کے پتوں کے حوالے سے "اینٹ کی بیگم" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

اسی طرح افسانہ کچنار میں "کچنار" کا لفظ علاقی انداز لیے ہوئے ہے۔ جو جوانی کی تپش، جوبن اور بہار کی نمائندگی کرتا ہے۔ اسی طرح اس افسانے میں بلقیس کے لیے "چٹان" کا لفظ علامتی انداز کو ظاہر کرتا ہے جو عورت کے مضبوط کردار کی نشاندہی کرتا ہے۔

افسانہ "برگد کا پیڑ" میں "برگد کا پیڑ" ایک جیتے جاگتے انسان کی طرح سوچتا اور نصیحت کرتا دکھایا گیا ہے۔ بالکل ایسے ہی افسانے "پتھر اور سائے" میں جو اپنے مفادات کی خاطر مجبوروں کی زندگیوں سے کھیل جاتے ہیں۔ اپنے ارد گرد بکھرے افلاس زدہ انسانوں کی بھلا کر اپنی خرمستیوں میں گم ہوتے ہیں۔ ایسے افراد احساس سے عاری ہوتے ہیں۔ جنہیں اپنی ذات کے علاوہ کچھ سجھائی نہیں دیتا۔

"سائے" کا لفظ مفلوک الحال اور استحصال زدہ افراد کے لیے استعمال ہوا جو تنگدستی اور غربت کے باعث لاغر اور کمزور ہو جاتے ہیں۔ ان کے پاس نہ تن ڈھانپنے کے لیے کپڑا ہوتا ہے نہ پیٹ کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے خوراک اور غذا "پتھر اور سائے" دو متضاد کیفیات کی ترجمانی کرنے کے ساتھ ساتھ دو متضاد طبقات کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔

افسانے "چمکیلے اندھیرے" کا نام علامتی رنگ اختیار کیے ہوئے ہے۔ اندھیرا اندھیرا ہوتا ہے خواہ وہ کتنا ہی چمکدار کیوں نہ جب اس کی روشنیاں ختم ہوتی ہیں تو اندر صرف کالا ہی رہتا ہے۔

افسانے میں انسان کی دو متضاد کیفیات کو ظاہر کرنے کے لیے اس کا نام چمکدار اندھیرا لیا گیا۔ کیونکہ انسان کا ظاہر بے شک اجلا ہو اگر اس کا باطن میلا ہے تو یہ جلملاہٹ وقتی ہوتی ہے اور بہت جلد ختم ہو جاتی ہے۔ افسانے کے کردار نیلم کے لیے یہ لفظ موزوں رہتا ہے جو دوغلا کردار ادا کرتی ہے۔ جھوٹی محبت کا لبادہ اوڑھ کر وہ اپنے خاوند کی دولت کو حاصل کرنے کی متمنی ہے اور پر تعیش زندگی گزارنے پر غور و فکر کرتی رہتی ہے۔

اسی افسانے میں "کالے ڈھیر" کا لفظ علامت کے طور پر استعمال ہوا اور غریب اور فاقہ زدہ افراد کے لیے یہ لفظ بطورِ خاص استعمال ہوا ہے۔ کیونکہ غریب اور قحط زدہ معاشرے سے تعلق رکھنے والے یہ افراد طاقت سے محروم ہوتے ہیں۔ اگر وہ وقت کے کھانے کے لیے ان کے پاس سامان نہ ہو تو ان کی صحت نہ صرف خراب ہو جاتی ہے بلکہ وہ چابکدستی سے کوئی بھی کام انجام دینے سے قاصر رہتے ہیں۔ ایسے ستم گزیدہ اور مجبور افراد معاشرے پر صرف بوجھ ہوتے ہیں کیونکہ غربت اور بے بسی اُن کی تمام صلاحیتوں کو سلب کر لیتی ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صادق حسین نے علاقی انداز اپناتے ہوئے بہت سارے معاشرتی پہلوؤں اور مسائل کی نشاندہی کی ہے۔ ادب سماجی حقائق کی نشاندہی کرتا ہے۔ ادب تخلیق کرنے والے اپنے عہد کے سماج کی عکاسی دانستہ یا نادانستہ طور پر کرتے ہیں۔ تخلیقی ادب کا ایک ذہنی عمل ہے جس پر لکھنے والے کے خیالات اور افکار کا اچھا خاصا اثر ہوتا ہے۔ ایک ادیب یا لکھاری اپنی ان افکار کو قلمبند کرنے کیلئے اپنے سماج سے حاصل شدہ تاثرات کا بھی سہارا لیتا ہے۔ اور ہر عہد میں سماجی تبدیلیوں کا عمل ناگزیر ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ معاشرے میں ہر دور میں تبدیلیاں رونما ہوتی آئی ہیں۔ خواہ یہ تبدیلیاں جغرافیائی ہوں، سیاسی ہوں، ادبی ہوں، یا سماجی ہر عہد کے ادب میں ان تبدیلیوں کو دیکھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ راجندر ناتھ شیدا اس حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

> "تخلیقی ادیب سماجی حقائق سے تاثرات حاصل کر کے اور ان تاثرات میں اپنے مخصوص ذہنی عمل سے اپنی شخصیت کا رنگ بھر کر انہیں زبان کے سانچوں میں ڈھالتا ہے۔ اس کا نقطہ آغاز زندگی اور سماج ہے اور ورمنتہا تخلیق ادب۔"[۳۴]

صادق حسین کا ہمہ گیر مشاہدہ جب بھی جس انداز سے انسان کے ماحول پر نظر ڈالتا ہے اس کے باریک سے باریک پہلوؤں کو نظر میں رکھ کر اسے اپنے اپنے افسانے کا پس منظر بنانے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ دیہاتوں کا ذکر کرتے ہوئے وہاں کے ماحول، رہن سہن، طرزِ بود و باش، غذا، کھیلوں، اور پیشوں کے علاوہ دیگر اشیاء اور عناصر کا ذکر

بھی صادق حسین نے فنی مہارت کے ساتھ کیا ہے۔ مثلاً دیہاتی کلچر کی نمائندگی کے لیے وہ وہاں کے ماحول میں استعمال ہونے والے خالص الفاظ وراشیاء کے ناموں کا ذکر کرتے ہیں جیسے "موکھا" اور "طباق" خالص دیہاتی الفاظ ہیں۔

اسی طرح دیہاتیوں کے مخصوص لباس، تہمد، بنیان، کلاہ، شلوار اور پگڑی وغیرہ کا ذکر ان کے بیشتر افسانوں میں ملتا ہے۔اس کے علاوہ۔ "ڈنگر"، "گاگر""، چھوکرا"، "دھیل گائے" وغیرہ پنجابی زبان کے الفاظ ہیں۔ "بابل اور بے جی" پوٹھواری زبان کے الفاظ ہیں جو ماں اور باپ کے رشتوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔

پوٹھواری لب و لہجہ اُن کے افسانوں میں دیکھا اور محسوس کیا جاسکتا ہے۔ جیسے " اٹھوارہ یا اٹھوار کے اٹھوارے "کا لفظ انہوں نے کثرت کے ساتھ افسانوں میں استعمال کیا۔اس کی ایک وجہ یہ بھی کہ صادق حسین کا تعلق بھی پوٹھوار سے تھا اور اس کے علاوہ ملازمت کے دوران انہیں مختلف دیہاتوں کے کلچر کو آنکھوں سے دیکھنے کا موقع بھی ملا۔ اس لیے اُن کے افسانوں میں خطوں اور جغرافیائی تناظر کے حوالے سے بھی شواہد ملتے ہیں۔

مثلاً دیہاتی کلچر کو واضح کرتے ہوئے وہ اُن کے لباس اور زبان کے علاوہ اُن کی غذا اور خوراک کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ مکئی، باجرے کی روٹیاں، دال، ساگ، اچار پیاز کی گھنٹیاں، گڑ کی ڈلیاں اور سُتو وہ غذائی اجزاء ہیں جن کا استعمال دیہاتوں میں کثرت سے کیا جاتا ہے۔

صادق حسین کو دورانِ ملازمت "بنگال" میں بھی وقت گزارنے کا موقع ملا۔اُن کے بیشتر افسانے جیسے "دو چھٹانک چاول"، "پتھر اور سائے"، "روپ و نتی"، "چمکیلے اندھیرے"، "اور سورج نکل آیا" وغیرہ بنگالی سماج کے رنگ میں لکھے گئے افسانے ہیں۔بنگالی معاشرت کو انہوں نے قریب سے دیکھا۔یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں بنگالی کلچر کی نمائندگی کے لیے فنی باریکیوں سے کام لیتے ہیں۔

"کچے کیلے کی بھجیا"، "کھٹری مسور کی دال"، "جھینگا مچھلی سالن"، اور "بھات"، وغیرہ صوبہ بنگال کے مختلف علاقوں کی غذائیں ہیں جن کا ذکر صادق حسین نے اپنی تحریروں میں کیا۔اس کے علاوہ جغرافیائی تناظر کے حوالے سے دیکھا جائے تو انہوں نے بہت سارے بنگالی خطوں اور علاقوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ جیسے، "لکھی پور"، "سونا پور"، "موہانی"، "رام گنج" وغیرہ بنگال کے علاقے ہیں۔

دھان، پٹ سن، سپاری اور ناریل کی فصلیں بھی زیادہ تر صوبہ بنگال کے علاقوں میں کاشت کی جاتی ہیں۔ صادق حسین کو جزئیات نگاری اور منظر نگاری پر خاص دسترس حاصل ہے۔افسانے کی فضاء تخلیق کرتے ہوئے وہ اتنی مہارت سے کام لیتے ہیں کہ پورے ماحول کی تصویر قاری کی نگاہوں کے سامنے پھر جاتی ہے لہٰذا یہی باریکیاں مخصوص علاقوں کی رہائش، لباس، زبان، اور خوراک کا اظہار کر دیتی ہیں۔

"ساڑھی"، "بلاوز"، "جمپر چولیاں" وغیرہ بنگالی طرز کے لباس ہیں جو عورتیں زیب تن کرتی ہیں۔اسی طرح مختلف اشیاء کے نام جنہیں دیکھ کر قاری کو اجنبیت کا تاثر ملتا ہے اُن کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ افسانے کے اندر ہی اُن کی وضاحت کر دیتے ہیں کہ یہ چیز کس مقصد کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ جیسے بنگالی زبان کے کچھ مخصوص الفاظ اُن کے مختلف افسانوں میں دیکھے گئے۔

ناؤ (کشتی)، ڈاؤ (ایک مخصوص قسم کا چھرا ہے) جو بنگالی میں مچھلی اور سبزی کاٹنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔اسی طرح "ٹالا" (بانس کا بنا ہوا پیپٹ جس کا پھیلاؤ کھلی چھتری کے دائرے سے کم نہیں ہوتا۔) بنگال کے علاقوں میں استعمال ہوا ہے۔ "جھنگڑا" بانس کی بنی ہوئی بے ڈنڈی کی مثلث نما چھتری ہے۔افسانہ چمکیلے اندھیرے میں انہوں نے بنگالی گیت کے ایک دو مصرعے ترجمے کے ساتھ لکھے ہیں۔ جیسے "گاگوری آباد ہو یا نہیں بھرا۔ میچھے آمار آنچوں دھرا"

ترجمہ: میری گاگر تو ابھی بھری نہیں۔ بیگا کر میرا آنچل پکڑے ہوئے ہو۔

''جائے جے میلا۔ رنگین کھیلا''

(وقت بیتا جا رہا ہے اور تم رنگین کھیل کھیلے جا رہے ہو)۴۵

لب ولہجہ:

صادق حسین کلچر کی نمائندگی کے لیے جہاں مخصوص الفاظوں کا اظہار کرتے ہیں وہیں پر وہ مخصوص لب و لہجہ کا استعمال کر کے افسانوں کے ماحول کو نہ صرف خوشگوار بناتے ہیں بلکہ کردار کے نقش کو بھی گہرا بنا دیتے ہیں۔

جیسے پنجابی و پوٹھواری لب ولہجہ کے لیے وہ اس طرح کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ "جٹ مجھ نوں مروڑا دتا تے پنڈ دی پنچیت ٹٹ گئی"، "چل وے جیمیا"، "جی او کھنا" لب ولہجہ کے اظہار کے حوالے سے وہ جملوں کا برتاؤ اور انتخاب اس خوبصورتی سے کرتے ہیں کہ اُن کی تحریریں انداز بیاں کے حوالے سے بالکل حقیقی معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً متوسط اور ان پڑھ طبقے کو واضح کرنے کے لیے وہ زبان اور الفاظوں کا استعمال بھی اُسی مناسبت سے کرتے ہیں۔ "آؤ باؤ جی! اٹھ چھوکرے لپک کر جا اور باؤ جی کے لیے ہاف سیٹ کڑک چائے لے آؤ۔" نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کی روزمرہ بول چال کو اس مثال میں دیکھا جا سکتا ہے۔ "دتا کنجڑا بولا۔ میرے بادشاہ! کام وہ کر کہ شام کو اُٹھو تو کڑک نوٹ گن کر شلوار کے نیفے میں اُڑس لو۔ پھر خوب کھاؤ پیو اور جان بناؤ۔" ریڑھی چھابڑی والوں کی زبان، لہجہ اور ان کے مخصوص انداز سے بھی صادق حسین کو آگاہی حاصل ہے۔ "مصری ورگے امب لے لو۔ سیانیاں دے سودے جے۔"

مندرجہ بالا جملوں میں ٹھیٹ پنجابی زبان استعمال کی گئی ہے۔ دیہات میں رہنے والے وڈیرے کس طرح تحکمانہ انداز اپناتے ہوئے غریبوں پر اپنا رعب ودبدبہ قائم رکھتے ہیں اس کی مثال ملاحظہ ہو۔"ابے !اوئے کتے! چلم بھر لا۔"

کسی بھی سماج میں ذریعہ معاش وروزگار کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔انسان چاہے جس معاشرے سے تعلق رکھتا ہو۔ پیٹ کی آگ بجھانے اور دیگر ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لیے مختلف کام کرتا ہے۔ صادق حسین نے اپنے افسانوں میں مختلف طبقات کی نمائندگی کرتے ہوئے انہی کی مناسبت سے پیشوں کا بھی ذکر کیا ہے۔

مثلاً ان پڑھ اور مزدور طبقہ سے تعلق رکھنے والے افراد کا ذریعہ معاش پھلوں کی ریڑھیاں لگانا، یا پھر قصائی"،"کپڑے دھونا"،اور"مالش کرنا"وغیرہ ہے۔اپنے چھوٹے موٹے کاموں کو ذریعہ معاش بنا کر وہ گزراوقات کرتے ہیں۔اور اسی طرح نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے سہل پسند افراد گداگری کو پیشہ بنالیتے ہیں۔

اگر کوئی متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والا نوجوان دوچار جماعتیں پڑھ لکھ جائے تو وہ یا کلرک بن جاتا ہے پھر فوج میں سپاہی بھرتی ہو جاتا ہے۔ باقی نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ ریڑھیاں لگا،کھوکے چلا کر اور کباب، سگریٹ پان بیچ کر زندگی کی گاڑی کا پہیہ کھینچتے ہیں۔ ان تمام باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ صادق حسین نے معاشرے سے تعلق رکھنے والے افراد خاص طور پر نچلے اور متوسط طبقوں سے متعلقہ افراد کی زندگیوں کو موضوعات میں جگہ دے کر ان سے متعلق تمام تر معلومات تفصیل کے ساتھ بیان کی ہیں جو اُن کے گہرے سماجی شعور کی غماز ہیں۔

تکرار:

آپ کے فن کی وہ تمام خصوصیات جن کا تعلق ایک طرف کے ان مطالبات سے جنھیں ہم تکنیک کے مبادیات اور اس کے لوازم کہہ سکتے ہیں اور دوسری طرف زبان و بیان اور اظہار و ابلاغ کے ان وسائل سے جن کی بدولت افسانہ نگار کا خیال اس کے تاثرات و تصورات دوسروں کے ذہن و قلوب میں جگہ کرتے ہیں انہوں نے جس طرح اپنے بیان و اظہار کے معاملہ میں اپنے تصورات وافکار کی وضاحت کے لیے تشبیہات واستعارات اور محاورات و جزئیات نگاری کا استعمال کیا ہے اسی طرح ان کے افسانوں میں "تکرار" بھی اسلوب اظہار کی ایک خصوصیت کے طور پر اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ جملوں کا دہرانا قاری کی سوچوں کو بیدار کرنے کے علاوہ کسی اہم بات یا پہلو کی طرف توجہ بھی دلاتا ہے۔افسانہ "انسان اور صلیب "میں اس طرح کی مثال دیکھی جاسکتی ہے۔

> "ربیکا پھر عام دعاؤں، مناجات اور انجیل مقدس کی جیسی کتابو ں سے کھیلنے لگی۔ زردی مائل تنکوں والی ہیٹ کے سائے میں دو مرجھاتی ہوئی آنکھیں نمناک ہو جارہی تھیں۔ مسٹر اور مسز ہملٹن

عقیدت مندانہ نظروں سے پادری کے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پیلا پیلا لمبوترا چہرہ جس پر غم کے دیپک جل رہے تھے۔ آنکھوں کی دو نیلی نیلی جھیلیں جن پر پھر کالی کالی بدلیاں منڈلا رہی تھیں۔ کبھی آہستہ اور کبھی بلند ہوتی ہوئی آواز جس میں درد رچا ہوا تھا۔ مسز فریڈرک کی نگاہوں میں اس کی منہ بولی بہن کا بیمار چہرہ پھرنے لگا۔ کلارک ڈورو تھی کی مرمریں گردن پر سے نگاہیں ہٹا کر پھر اپنے کھردرے ہاتھوں کی طرف دیکھنے لگا۔"۲۳

صادق حسین نے گرجا گھر میں موجود افراد کی ذہنی و قلبی منظر نگاری کی تکرار سے انسانی ہیجان اور تلاطم کو واضح کر کے تمام افراد کے جذبات اور کیفیات کی طرف توجہ مبذول کر کے معاشرتی ہم آہنگی اور انسانی نفسیات سے آگاہی کی لیے فنی جواز پیدا کیا ہے۔

بالکل اسی طرح افسانہ "دھوکے باز" میں دو مرکزی کرداروں "پتھر اور قینچی" کے حوالے سے مندرجہ ذیل جملے کی تکرار سے قاری کی سوچ کے دریچوں کو وا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور پورے افسانے میں یہ بظاہر واضح نہیں ہو سکا کہ آیا پتھر اور قینچی ایک دوسرے کے دوست تھے یا دشمن؟ لیکن اس جملے کی تکرار سے افسانے میں معنویت پیدا کی گئی ہے۔ اور واقعی قاری سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ افسانوں میں کسی بات کو جب اہمیت دینا چاہتے ہیں تو جملوں کی تکرار سے اس میں معنویت پیدا کر کے جواز پیش کر دیتے ہیں۔ "گاؤں والوں کو آج تک پتا نہ چل سکا قینچی اور پتھر ایک دوسرے کے دوست ہیں یا دشمن۔"

"پیپل پاؤں اور دائرے" میں اکبر کے کردار کے ذریعے جس جملے کی تکرار کی گئی وہ بھی معنی خیزی کے حوالے سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

"وہ اپنے گاؤں کے لوگوں سے اکثر کہا کرتا تھا کہ جس میدان میں پیپل کا پیڑ ہے وہ خدا کی زمین ہے اور باقی زمینیں اس کے بندوں نے آپس میں بانٹ لی ہیں۔"۲۷

اس اقتباس میں معاشرتی ناانصافیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ مطلب ''جس کی لاٹھی اُس کی بھینس'' کا مقولہ یہاں پر صادق آتا ہے اور طاقتوروں پر طنز کر کے صادق حسین یہ باور کرانے میں کامیاب ہوئے ہیں کہ معاشرتی ناانصافیاں اور ناہمواریاں ہر دور میں انسانی زندگی کا حصہ رہی ہیں۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جس کے پاس پاور طاقت ہو وہ اپنے کام نکلوانا جانتا ہے۔ پیپل کا پیڑ افسانے میں اکبر کی زندگی کو پلٹنے اور بہتر بنانے میں معاونت کرتا ہے۔ یعنی اُسی پیڑ کے نیچے بیٹھنے سے اس کی قسمت جاگتی تھی اور وہ گاؤں کو چھوڑ شہر آیا تھا لہذا پیپل کا پیڑ اس کے لیے اچھے شگون کی حیثیت رکھتا ہے۔

صادق حسین زبان و بیان پر کمال قدرت رکھتے ہیں۔ وہ اپنے قلم کے ذریعے لفظوں میں معنویت پیدا کرنے میں خاصا کمال رکھتے ہیں۔ جملوں کی ساخت ہو یا فقروں کو پیچ و خم ہر لحاظ سے وہ نئے معنی اور نئے رنگ بکھیرتا دکھائی دیتا ہے۔ اُن کا ہر جملہ مواد کے ساتھ ربط اور ہم آہنگی کو ظاہر کرتا ہے جو اس بات کی تصدیق ہے کہ صادق حسین نے کسی بھی لفظ کو بے کار اور بلا مقصد استعمال نہیں کیا۔ بعض اوقات وہ ایک جملے یا فقرے کے ذریعے جہان معنی آباد کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اپنے خوبصورت جملوں کے ذریعے قاری کو گرفت میں کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

صادق حسین لفظوں کے استعمال کے حوالے سے احتیاط برتنے کے قائل ہیں اُن کا ایک ایک جملہ اس بات کا ثبوت پیش کرتا ہے کہ انہوں نے ایک ایک افسانے کی تخلیق میں اچھی خاصی احتیاط برتنے کے ساتھ ساتھ کانٹ چھانٹ سے کام لیا ہے۔ اُن کے افسانوں میں قابل توجہ بات ہی اُن کے جملوں کی برجستگی اور روانی ہے۔ وہ بیانیہ انداز اختیار کرتے ہوئے الفاظوں اور جملوں کی اینٹ ایسے خوبصورت انداز میں رکھتے ہیں کہ پورے افسانے کی عمارت میں کہیں بھی جھول نظر نہیں آتا اور ہر افسانہ اپنے اندازِ بیاں کے حوالے سے بالکل انوکھا انداز لیے نظر آتا ہے۔

زبان کی صحت اور اندازِ اظہار کے حوالے سے صادق حسین کے افسانوں کا ذکر کرتے ہوئے عارف عبدالمتین اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> "وہ لفظوں کے زیاں سے اصولاً اجتناب کرتے ہیں انہیں اس معاملہ میں بخل منظور ہے۔ نہ اسراف۔ ان کی کہانیوں کے مطالعہ کے دوران میں اندازہ ہوتا ہے کہ وہ الفاظ کا دل سے احترام کرتے ہیں۔ اور اُن کا ایمان ہے کہ الفاظ کا غیر ضروری اور بے جا استعمال یا جائز مقام پر ان کا عدم استعمال اُن کے تقدس کو مجروح کرنے کے مترادف ہے۔" ۴۸؎

عارف عبدالمتین کی رائے سے جو نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے اور بحیثیت مجموعی صادق حسین کے افسانوں کے مطالعے کے بعد یہ بات درست تسلیم کی جاتی ہے کہ واقعی وہ لفظوں اور جملوں کے بے جا اور بے ربط استعمال کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ اسلوبِ بیان کے حوالے سے اُن کی تحریروں میں شاعرانہ لطافت اور دلکشی نظر آتی ہے۔ جو اُن کے طرز اظہار کو شگفتگی اور شائستگی عطا کرتی ہے۔ ان کے جملے شاعرانہ لطافت کے باعث قاری کا دل موہ لیتے ہیں۔ ذیل میں کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

"ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں پھولوں کی نرم و نازک پتیاں ننھے ننھے سانس لے رہی تھیں"

"ٹافی انکل نے لہجے کا پرچم سرنگوں کر کے کہا۔" افسانہ خوشبو کی بستی سے ایک مثال ملاحظہ ہو۔

"محرموں نے رنگوں کی حسین دنیا صندوقچی میں بند کر کے ماضی کے غار میں دھکیل دیا۔" افسانہ ٹافی انکل میں وہ لکھتے ہیں۔

"دوڑتے ہوئے خوبصورت لمحات ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چھم چھم کرتے اُدھر چلے جاتے جدھر یادوں کی مامتا نے اپنی بانہیں پھیلا رکھیں تھیں۔"

گزرتے وقت کے لیے وہ اس طرح کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

"وقت کا ساز دھیما دھیما بجنے لگا۔"

اس طرح خوشی کا اظہار کرنے کے لیے وہ خوشی سے نہال ہو گیا۔ کا لفظ بھی استعمال کر سکتے تھے مگر مظہر کی خوشی کے جذبات کو بیان کرنے کیلئے لکھتے ہیں۔

"مظہر کے دل کا کنول کھل گیا۔"

مندرجہ بالا تمام باتیں اُن کی فنی دسترس کی گواہی دیتی ہیں بحیثیت افسانہ نگار اُن میں وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں جو ایک افسانہ نگار میں ہونی چاہئیں۔ وقت کے آگے حمیدے کڑیل کی بے بسی کو ظاہر کرنے کے لیے لکھتے ہیں۔

"وقت کی تیز سوئی رگوں میں چبھ چبھ کر تھک گئی۔" کچھ اور مثالیں ملاحظہ ہوں۔

"پتھر کی سوچ میں شگاف پڑ گئے۔"

"بھوک نے آنکھیں نکال کر دیکھا۔" افسانہ "انسان" منگو کی داخلی کیفیات کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

"منگو کا جسم اندھیرے میں گُم تھا مگر اس کے خیالات ماضی کی دھوپ چھاؤں سے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔""یاداشت کی لہروں پر جیواں تیرنے لگی۔"

زندگی کی صداقتوں کا اظہار صادق حسین کی تحریروں میں ہمیشہ بلند تر ہوتا ہے۔ انہوں نے دیہاتی زندگی اور اسے متعلقات کو اپنی تخلیقات کا مرکز و محو بنایا۔ اُن کا اسلوب بھی اُن کے عہد کا ترجمان ہے۔ آپ نے مذہبی و معاشرتی زندگی کی نمائندگی اپنے افسانوں میں نہایت عمدگی کے ساتھ ہے۔ چھوٹی چھوٹی جزئیات کے علاوہ باقی تمام سماجی عناصر کی عکاسی اُن کے افسانوں کا خاصا ہے۔

لوک داستانوں اور لوک ورثہ کی اہمیت کسی بھی معاشرے کی پہچان ہے۔ آپ نے افسانوں میں لوک داستانوں کے کرداروں کو تلمیحی رنگ دے کر فنی دسترس کے ساتھ شاندار طریقے سے برتا ہے۔ مثلاً دریائے چناب اور اس کے گردنواح سے متعلق دیہاتوں کی زندگیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے وہاں کی حسین دوشیزاؤں کے لیے سوہنی کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ "سوہنی، ماہیوال "اور "ہیر رانجھا" کی تلمیحات کے علاوہ "وارث شاہ" کے کلام کے حوالے سے ان کے افسانوں میں ذکر ملتا ہے۔ تلمیحات اور استعارات کے حوالے سے جو بات قابل بیان ہے وہ ہے صادق

حسین کا سماجی شعور کے سماجی شعور میں وسعت اور گہرائی ہے۔ وہ اُن تمام فنی خوبیوں سے آشنا ہیں جو کسی بھی افسانہ نگار کے شخصی اور تحریری اوصاف کے لیے لازم ہیں۔ انہوں نے الفاظ کی شائستگی، روانی، تسلسل اور جستگی پر نہ صرف اپنی کاوشوں اور سوچوں کو مرکوز رکھا بلکہ عمدہ تلمیحات کا استعمال کر کے قاری پر یہ واضح تاثر برقرار رکھنے میں بھی کامیاب ہوئے کہ ''لوک ورثہ'' کسی بھی معاشرے کی انفرادیت برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ اُن کی مخصوص پہچان بھی ہے اور معاشرتی زندگی کے پہلوؤں میں جن سے معاشرتی زندگی کے تصور کی مکمل شکل انسان کے سامنے آتی ہے اُن میں لوگ ورثہ اپنی جداگانہ اہمیت رکھتا ہے۔ کوئی بھی مصنف خیالی دنیا میں رہ کر ہی صرف بلند بانگ دعوے نہیں کر سکتا بلکہ وہ اپنے فن میں پختگی کے حوالے سے جیتے جاگتے معاشرے کا نہ صرف تجربہ اور مشاہدہ کرتا ہے بلکہ عالمی و ملکی ادب کے مطالعہ کی بھی عادت اُس کے فن کو چار چاند لگانے کے لیے ضروری ہے۔ افسانہ "ہیلن آف ٹرائے" اس حوالے سے صادق حسین کے عالمی ادب میں دلچسپیوں کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہے۔ ''ہیلن آف ٹرائے'' بھی تلمیح ہے لیکن اس پر پورے افسانے کی تخلیق صادق حسین کے فنی شاہکار کی بہترین مثال ہے۔

افسانوں میں تلمیحات کی موجودگی صادق حسین کے ادبی رجحان کا پورا پورا عکس پیش کرتی ہیں۔ سماجی زندگی میں ادب کی اہمیت اجداگانہ ہے۔ یہاں یہ نکتہ قابل توجہ اور سمجھنے کے لائق ہے کہ کسی بھی تحریر میں تلمیحات کا استعمال اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ سماجی زندگی میں "ادب" کا ایک خاص مقام ہے۔ لہذا تہذیب و ثقافت اور معاشرتی زندگی کی ترجمانی کے لیے ادب کی اہمیت اپنی جگہ پر ہے۔

تحریروں میں فنی مہارت اور پختگی وقت کے ساتھ ساتھ اپنی جگہ خود بناتی جاتی ہے۔ "فن کار" فن کا اظہار مخصوص انداز میں کرتا ہے اس میں فنکار کی شخصیت کی انفرادیت نمایاں ہوتی ہے۔ اسلوب کا تعلق چونکہ موضوع اور زبان سے ہوتا ہے۔ یہ فنی صلاحیت خداداد بھی ہوتی ہے اور مسلسل ریاضت کے ذریعے بھی پیدا کی جاسکتی ہے۔ اسلوب اظہار کے لیے مختلف قسم کی تکنیک اور انداز بھی دانستہ اور نادانستہ طور پر کسی تخلیق کار کی شخصیت اور اندازِ بیان کے خاص وصف کی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ صادق حسین کا اندازِ بیان سادہ ہے۔ اس کے لیے انہوں نے معاصر افسانہ کاروں کی طرح کوئی مخصوص تکنیک کا استعمال نہیں کی۔ لیکن اسکے باوجود اُن کے بیشتر افسانوں میں تکنیکی رنگ نمایاں ہے۔

علامت نگاری کے علاوہ اُن کے دو ایک افسانے فلیش بیک تکنیک میں لکھے گئے۔ افسانہ "زعفران کے پھول" خالصتاً فلیش تکنیک میں لکھا گیا ہے۔ جس کا مرکزی کردار "ارشد" اپنی مرحوم بیوی کی یادوں میں گم رہتا ہے۔ ماضی میں اس کے ساتھ گزارے حسین لمحات کا ذکر کر کے موجودہ دور میں ارشد کی زندگی اور پریشانیوں اور اداسیوں کا

ذکر انہوں بہت خوبصورتی سے کیا ہے۔ اس کے علاوہ اُن کا افسانہ "نروان" بھی ایسی تکنیک میں لکھا گیا ہے۔ "نروان" کا مرکزی کردار "ستار بند ھو" بھی ماضی میں گُم ہو کر حال کی صورتحال کا جائزہ لیتا ہے۔ اور دل ہی دل میں حالات کی ستم ظریفی پر کڑھتا نظر آتا ہے۔

ایجاز و اختصار:

صادق حسین کا ایک اور فنی کمال ایجاز و اختصار ہے۔ وہ کم سے کم لفظوں میں بڑی سے بڑی بات اور واقعات کو سمیٹنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں تاثر اور شگفتگی نمایاں طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ لیکن بڑے واقعات چند لفظوں میں سمونے کا فن اُن کی فنکارانہ صلاحیتوں کی تصدیق کرتا ہے۔ اختصار پسندی کی مختلف مثالیں ان کے مختلف افسانوں میں دیکھی جاسکتی ہیں جیسے افسانہ ثانی انکل میں فہمیدہ بیگم کے انتقال کے واقعے کو انہوں نے لفظی اختصار کے ساتھ بڑی کامیابی کے ساتھ سمیٹا ہے کہ کہیں بھی غیر ضروری پھیلاؤ دیکھنے کو نہیں ملتا۔

"آخر کار اولاد کی محرومی کا دکھ فہمیدہ بیگم کو کھا گیا۔ ایک دن جب وہ شخص نئی کتابیں خرید کر گھر لایا تو فہمیدہ بیگم اُجلا لباس پہنے بستر پر سو رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر پوری نہ ہونے والی آرزو کی صدا منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔" ۴۹؎

اختصار پسندی کے حوالے سے ان کا افسانہ "پہلا قدم" کا وہ اقتباس زیادہ توجہ طلب ہے جہاں وہ شکیلہ کی گود ہری ہونے کے واقعے کو جملوں میں سمیٹ کر جامع اور مختصر انداز میں یوں بیان کرتے ہیں۔

"شکیلہ پورے دنوں سے ہوئی تو اس کے چہرے کی رونق لوٹ آئی۔ وجود پر جوبن آگیا۔ ایک دن نئی زندگی طلوع ہو کر رونے لگی۔ اور سارے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔" ۵۰؎

اس اقتباس میں بھی توضیح کی گنجائش نکلتی تھی لیکن صادق حسین نے فنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے جملوں کو سمیٹا اور توضیحی انداز سے گریزاں رہے۔

آپ کے اسلوب اظہار اور انفرادی پیرایہ تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ صادق حسین اپنے فنی منصب پر پورا اترنے میں کامیاب رہے ہیں۔ یہی تمام باتیں اُن کی بصارت اور سماجی بصیرت کی آئینہ دار ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ فوزیہ اسلم،ڈاکٹر،روایتی اور جدید افسانے کی تکنیک کا تقابلی جائزہ،مشمولہ تخلیقی ادب(اسلام آباد: نمل پرنٹنگ پریس،۲۰۰۷ء)ص ۳۰۔

۲۔ اعجاز راہی،ڈاکٹر،اردو افسانے میں اسلوب کا آہنگ(راولپنڈی: ریز پبلی کیشنز،۲۰۰۸)، ص ۱۵۔

۳۔ گوپی چند نارنگ، ادبی تنقید اور اسلوبیات(لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۱ء)،ص ۱۴۔

۴۔ روبینہ کنول،صادق حسین کی افسانہ نگاری(ملتان: بہائ الدین زکریا یونیورسٹی،۱۹۸۷ء)

،

ص ۱۱۰۔

۵۔ رانا عبدالرحمن،(مرتب)افسانے صادق حسین،(لاہور: بک ہوم پبلشرز،۲۰۱۲ء)ص ۳۳۔

۶۔ ایضاً،ص ۳۳۔

۷۔ ایضاً،۳۶

۸۔ ایضاً،ص ۴۶۔

۹۔ ایضاً،ص ۳۹۶۔

۱۰۔ ایضاً،ص ۴۱۸۔

۱۱۔ ایضاً،ص ۹۶۔

۱۲۔ ایضاً،ص ۲۵۰۔

۱۳۔ ایضاً،ص ۳۸۳۔

۱۴۔ انور سدید،ڈاکٹر،اردو افسانے میں دیہات کی پیشکش(الہ آباد: اردو رائٹرز گلڈ،۱۹۸۲ء)، ص ۱۳۶۔

۱۵۔ افسانے صادق حسین ص ۱۸۱۔

۱۶۔ ایضاً،ص ۱۹۴۔

۱۷۔ ایضاً،ص ۱۲۹۔

۱۸۔ صادق حسین کی افسانہ نگاری،ص۱۰۹

۱۹۔ افسانے صادق حسین،ص۲۳۔

۲۰۔ ایضاً،ص۶۱۔

۲۱۔ ایضاًص،۹۴۔

۲۲ ۔ایضاً،ص۹۴۔

۲۳۔ ایضاً،ص۱۹۹۔

۲۴۔ ایضاً،ص۲۰۱۔

۲۵۔ ایضاً،ص۲۰۴۔

۲۶۔ ایضاً،ص۲۲۱۔

۲۷۔ ایضاً،ص۲۴۷۔

۲۸۔ ایضا،ص۳۷۸۔

۲۹۔ ایضاً،ص۴۱۸۔

۳۰ ایضاً،ص۴۹۶۔

۳۱۔ ایضاً،ص۲۵۷۔

۳۲۔ ایضاً،ص ۲۵۷۔

۳۳۔ ایضاً،ص۲۵۷۔

۳۴۔ ایضاً،ص۲۰۵۔

۳۵۔ ایضاً،ص۲۰۵۔

۳۶۔ ایضاً،ص۷۸۔

۳۸۔ ایضاً،ص۱۰۸۔

۳۹۔ ایضاً،ص۲۹۲۔

۴۰۔ ایضاً،ص۲۹۲۔

۴۱۔ ایضاً،ص۲۴۰۔

۴۲۔ ایضاً،ص۳۳۰۔

۴۳۔ ایضاً،ص۳۰۔

۴۴۔ راجندر ناتھ شیدا،ادب، فکر اور سماج (دہلی: ایشیا پبلشرز،۱۹۵۲ء)،ص۲۱۔

۴۵۔ افسانے صادق حسین،ص۱۸۶۔

۴۶۔ ایضاً،ص۵۲۵۔

۴۷۔ صادق حسین کی افسانہ نگاری،ص۱۴۴۔

۴۸۔ افسانے صادق حسین،ص۳۴۶۔

۴۹۔ ایضاً،ص۵۰۲۔

۵۰۔ ایضاً،ص۵۰۱۔

ماحصل

ادب زندگی، تہذیب اور کلچر کا عکاس، ترجمان اور نقاد ہوتا ہے۔ ادب ایک سماجی عمل ہے۔ اور چونکہ سماجی زندگی ہر لحہ اور ہر وقت تغیر و تبدل کا شکار ہوتی رہی ہے اس لئے ادب تغیرات اور انقلابات کے سانچوں میں ڈھلتا رہتا ہے۔ ہر دور کے ادب میں اس وقت کی سماجی تصویروں کا آنا ضروری ہے۔ کوئی بھی ادب ہو اپنے ماحول، حالات و واقعات اور سماجی زندگی کے مسائل سے چشم پوشی نہیں کر سکتا۔ اُردو افسانہ بھی دیگر اصنافِ ادب کی طرح سماج اور اس کے اندر ہونے والی تبدیلیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اُردو افسانے کی ابتداء سے لے کر موجودہ دور کے افسانوں تک اس کے موضوعات میں تنوع اور رنگارنگی دیکھی جاسکتی ہے۔ لیکن اس کے موضوعات میں سے زیادہ اہم موضوع سماج ہے۔ سماج جو انسانی زندگی کے ساتھ مربوط ہے۔ اور اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ ہر دور کے ادباء اور مصنفین نے اسے اپنے موضوعات میں اسے جگہ دی۔ اردو افسانے کی تاریخ کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہوئی کہ دیگر اصنافِ ادب کی طرح اردو افسانے نے بھی سماج کو اپنے موضوعات میں جگہ دی۔ اس طرح اردو افسانے میں سماجی اثرات کی عکاسی ابتداء ہی سے موجود تھی۔

زیرِ بحث تحقیقی مقالے میں سماجی شعور کی روایت اور تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے بعنوان "صادق حسین کے افسانوں میں سماجی شعور: تجزیاتی مطالعہ" پر بحث کی گئی۔ اس موضوع کو مد نظر رکھتے ہوئے جو تحقیق طلب مسئلہ سامنے آیا وہ یہی ہے کہ جامعاتی سطح پر خاص کر ایم۔فل، پی، ایچ۔ڈی کی سطح پر صادق حسین کے افسانوں پر بہت کم کام ہوا ہے۔ ان کے بارے میں تحقیقاتی کتب بھی ناکافی ہیں جس کی وجہ سے ان کے افسانوں میں سماجی شعور کو سمجھنے میں دشواری پیش آئی۔ تاہم اُن کی نجی زندگی کے حالات اور اُن کے خاندان کے افراد سے متعلقہ معلومات حاصل کرنے کے علاوہ دیگر افسانہ نگاروں کی ادبی کاوشوں اور نقادوں کی آراء کی روشنی میں صادق حسین کے افسانوں میں سماجی شعور کو سمجھنے میں مدد ملی اور اس میں بہت حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ زیرِ نظر تحقیقی مقالے کی مدد سے صادق حسین کے افسانوں پر تحقیقی خلاء کو پورا کرنے کی ادنی سی کوشش کی گئی ہے۔ اس تحقیق میں صادق حسین کے سماجی شعور کو سمجھنے اور اس تک رسائی حاصل کرنے کے لیے جو سوالات ترتیب دیے گئے تھے وہ یہ تھے۔

ا۔ صادق حسین کے افسانوں میں سماجی شعور کی عکاسی کرنے والے عناصر کو کس انداز سے پیش کیا گیا ہے؟

۲۔ کس طرح کے کردار صادق حسین کے افسانوں میں صادق حسین کے سماجی شعور کی وضاحت کرتے ہیں؟

۳۔ صادق حسین انسانی نفسیات کو کس حد تک سمجھنے میں کامیاب ثابت ہوئے ہیں؟

۴۔ صادق حسین کے افسانوں میں موجود کردار، واقعات اور جزئیات کس حد تک ان کے سماجی شعور کو سمجھنے میں ثابت ہوئے ہیں؟

مندرجہ بالا تحقیقی سوالات کے پس منظر میں جو بنیادی مقاصد تھے وہ یہ کہ ان سوالات کے جوابات کے حصول کے ذریعے صادق حسین کی افسانہ نگاری کو درست تناظر میں دیکھنے کے ساتھ ان کے افسانوں میں صادق حسین کا سماجی شعور معلوم کیا جائے۔ ان کے افسانوں کا فنی و فکری جائزہ لیتے ہوئے ان محرکات کی نشاندہی کی جائے جو ان کے سماجی شعور کی وضاحت کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ صادق حسین کے افسانوں میں سماج کے ساتھ ساتھ انسانی نفسیات کا مطالعہ بھی کیا جائے۔

تحقیقی موضوع کے مسئلے، مفروضے، سوالات اور مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے باب اوّل بعنوان "سماج اور ادب" میں ادب اور سماج کے باہمی تعلق کو سمجھنے کے لیے آغاز میں سماج کی تعریفات کو مختلف انسائیکلوپیڈیا، اور ماہرین سماجیات کی آراء کو مد نظر رکھ کر پیش کیا گیا۔ اُردو افسانوں میں سماج کی عکسبندی کے حوالے سے ادب اور سماج کے باہمی رشتے کو نہ صرف سمجھنے کی کوشش کی گئی بلکہ مختلف سماجی عوامل کو بھی زیر بحث لایا گیا۔ اس کے علاوہ اُردو افسانے کی مختصر تاریخ اور مختلف سماجی افسانہ نگاروں کی تحریری کاوشوں کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے سماجی شعور کے مفاہیم تک رسائی حاصل کرنے کی شعوری کوشش کی گئی۔

سماج ایسے لوگوں کی جماعت کا نام ہے جو باطنی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ مضبوط تعلق قائم کئے ہوں اور ایک اکائی کی صورت میں طویل مدت تک گروہی شکل میں ایک دوسرے ساتھ رہتے رہے ہوں اور مشترکہ سطح پر ذاتی و گروہی مفادات کی خاطر کام کرتے رہے ہوں۔ سماجی ماہرین سماج کو ان انسانی رشتوں میں اُلجھے ہوئے متعدد رشتوں کے مشابہ قرار دیتے ہیں۔ جو دوسری چیزوں سے رشتے جوڑ کر پیدا ہوں اور یہ رشتے دائمی بھی ہو سکتے ہیں اور عارضی بھی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ سماج انسانوں کے ایسے بڑے گروہ کو کہتے ہیں جو باہمی تعلق و اشتراک کے اعتبار سے انفرادی خصوصیت کا حامل ہو۔ اُن کے زندگی گزارنے کے طریقے، اصول و ضوابط، قوانین، اقدار و روایات میں ہم آہنگی پائی جاتی ہو اور انہی اوصاف کی بنا پر وہ اپنی منفرد اور مخصوص شناخت کروانے میں مہارت رکھتے ہوں۔

انسان کو اشرف المخلوقات ہونے کی وجہ سے کائنات میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ تہذیب ہو یا معاشرہ ہر شعبہ حیات میں انسان کو ہی بالادستی حاصل ہے۔ تاحدِ نظر اور تاحدِ فکر انسانی کائنات کا وجود ہے۔ آدم، فرد، بندہ، بشر یہ سب الفاظ انسان ہی کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ ماہرین عمرانیات سماج اور فرد کو ایک ہی سکے کے دو رخ قرار دیتے ہیں۔ اس سے انسان اور سماج کے تعلق کی پہچان ہوتی ہے۔ انسان کو سماجی حیوان اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ معاشرے سے کٹ کر نہیں رہ سکتا۔ معاشرے سے الگ رہنے والا دیوتا ہو سکتا ہے۔ یا بھوت مگر انسان نہیں۔ تمدن ہم سے تہذیبی عمل میں فعال شرکت کا مطالعہ کرتا ہے۔ تمدن تمام ریاستوں کو یہ بھی فریضہ سونپتا ہے کہ وہ افراد کی جان و مال حفاظت کرے اور معاشرتی و سماجی زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے اپنی فعال شرکت کو یقینی بنائیں۔ اگر یہ شرکت غیر فعال ہو تو معاشرتی ترقی کا عمل رک جاتا ہے۔ اور اس طرح وہ ترقیاتی اہداف کے حصول میں ناکام ہو جاتا ہے۔ معاشرتی ترقی کے عمل میں رکاوٹ کے ساتھ بہت سے مسائل جنم لینے لگتے ہیں۔ اور اُن مسائل میں سر فہرست انقلابات اور سیاسی تغیر و تبدل شامل ہیں۔ سماجی سطح پر پورا معاشرہ بھی ایسی تبدیلیوں اور ان تبدیلیوں کے پیش نظر کھڑے ہونے والے مسائل کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اور اس معاشرے سے تعلق رکھنے والے افراد بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر ان مسائل سے متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ ان سماجی مسائل میں بدعنوانی، غربت، انتشار، فرقہ واریت اور نسلی امتیازات وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

یہ حقیقت بھی اظہر من الشمس ہے کہ کسی بھی معاشرے کو بنیاد فراہم کرنے میں چند سماجی عوامل کا بھی اپنا خاصا کردار ہے۔ سماجی ماہرین تہذیب و ثقافت، فنونِ لطیفہ اور ادب جیسے عوامل کو کسی بھی معاشرے کا جزو لازم ٹھہراتے ہیں۔ یہی عوامل معاشرے کو بنیاد فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ معاشرے کی نوک پلک سنوارتے ہیں اور اُسے صحیح معنوں میں تہذیب یافتہ بھی بناتے ہیں اسکے علاوہ معاشرے کو انفرادیت بھی بخشتے ہیں۔

تہذیب و ثقافت معاشرے کی پہچان ہے۔ اور یہی معاشرے کی تخلیق کا باعث بھی بنتی ہے۔ سماجی ماہرین کی رائے میں تہذیب ہی معاشرتی آسودگی اور توازن کو قائم و برقرار رکھتی ہے۔ اور افرادِ معاشرہ کی راہبری کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو سکون اور راحت مہیا کرنے کا سامان کرتی ہے۔ مختلف ماہرین کی آراء کی روشنی میں تہذیب تغیرات زمانہ کی آئینہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ معاشرتی ارتقاء کا بھی باعث بنتی ہے۔ تہذیب و ثقافت ہر اس چیز پر مشتمل ہوتی ہے جسے ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کیا جا سکے یوں یہ انسانی کارناموں کا مجموعہ بھی کہلاتی ہے۔

علم، عقائد، آرٹ، اخلاق، قانون، رسوم و رواج اور دوسری تمام صلاحیتیں جن کا اکتساب انسان معاشرے کے رکن کی حیثیت سے کرتا ہے ثقافت اور تہذیب کی ذیل میں آتی ہیں۔

تہذیب و ثقافت معاشرے کے اندر جنم لیتی ہیں اور معاشرے کی تشکیل اور شناخت بھی بنتی ہیں۔ تہذیب و ثقافت اور کلچر ہم معنی ہیں۔ تہذیب و ثقافت کے حوالے سے یہ سمجھنا اہم ہے کہ کوئی بھی قوم مجموعی طور پر تاریخ کے کسی خاص دور میں فن و موسیقی، ادب، مذہب فلسفہ اور سائنس سے متعلق جو کچھ حاصل کر لیتی ہے اسے تہذیب و ثقافت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ لہذا یہ کہنا بھی درست ہے کہ ثقافت خیالات و افکار، عقائد، فنون، آلات اور رویوں کا ایک ایسا گورکھ دھندا ہے جس میں سماج کا ہر فرد الجھ جاتا ہے اور یہ انسان کا اپنا بنایا ہوا ماحول ہے۔ ثقافتی ترسیل کا عمل رکتا نہیں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ ترسیل مختلف انداز میں آنے والی نسلوں تک جاری رہتی ہے۔ اور ثقافتی ترسیل کا سب بڑا ذریعہ ادب ہے۔ یہ کہنا درست ہے کہ کلچر یا تہذیب کا لازمی جزو آرٹ ہے اور آرٹ کی بہترین صورت کا نام ادب ہے۔ آرٹ چونکہ سماجی حقائق کا عکاس ہوتا ہے۔ زندگی کے حقائق کو اپنے تجزیات کے ساتھ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ سماج کو فروغ بھی دیتا ہے۔ لہذا ادب کے اولین مقاصد میں سے سماج کی نقاب کشائی ایک اہم مقصد ہے۔ اسی لیے تو ادب کو آرٹ کا دوسرا نام دیا جاتا ہے۔ ادب کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے کیونکہ یہ زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

چنانچہ اگر یہ کہا جائے کہ ادب زندگی کا پابند ہے۔ زندگی سے فرار حاصل کرنا اُس کے اختیار میں نہیں اور حال کا آئینہ دار ہونے کے ساتھ مستقبل کا اشاریہ بھی ہو اور تشریح حیات کے ساتھ ساتھ تنقید حیات کے فرائض بھی انجام دیتا ہو تو یقیناً درست ہے۔

ادب اور سماج کا باہمی تعلق بہت مضبوط اور وسیع ہے۔ کیونکہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزم ہیں۔ ادب سماج سے ہی جنم لیتا ہے اور سماج کی ترقی اور تشکیل میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ ادب سماج میں ہونے والی تبدیلیوں کا باعث بنتا ہے۔ اور سماج میں ہونے والی تبدیلیاں ادب کو متاثر کرتی ہیں اس طرح یہ دونوں ایک دوسرے سے صرفِ نظر نہیں کر سکتے۔ ادب کی خصوصیت ہی یہی ہے کہ وہ اپنے وجود کا اعلان تہذیبی، ثقافتی اور سماجی تناظر میں ہی کرتا ہے۔ اور سماج کا عکس کسی بھی عہد کے ادب میں ملتا ہے۔

اس لیے یہ حقیقت قابلِ تسلیم ہے کہ ادب اور سماج ایک گہرے اور مربوط رشتے میں بندھے ہوئے ہیں اور دونوں کو جدا کرنا ممکن نہیں۔ معاشرے کے بغیر ادب کی نشوونما نہیں ہو سکتی اور ادب کے بغیر معاشرتی ترقی کا عمل جمود کا شکار ہو جاتا ہے جس سے معاشرتی بقاء اور دوام کو خطرہ در پیش ہو سکتا ہے۔

سماج اور سماجی زندگی کے متعلقات کے بارے میں جاننا اور واقفیت حاصل کرنا سماجی شعور کہلاتا ہے۔ سماجی شعور سماجی میں ہونے والی تبدیلیوں اور مسائل سے آگاہی کا نام ہی نہیں بلکہ بدلتے حالات اور تقاضوں کے تحت اپنی سوچوں اور اعمال میں تبدیلی لانا بھی سماجی شعور کے زمرے میں آتا ہے۔ لیکن ادب میں سماجی شعور کے مفہوم کو شاعر

یا ادیب کی تخلیقات کے حوالے سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ شاعر یا ادیب کوئی بھی ہو وہ سماج کی پیداوار ہوتا ہے اور اس کی پہچان سماج ہی سے ہوتی ہے۔ چنانچہ مختلف حوالوں اور ماہرین کی آراء روشنی میں سماجی شعور کے مفہوم اور اہمیت کو سمجھنے میں مدد ملی۔ اور اُن آراء کے تناظر میں بلاشبہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی بھی تحریر یا تخلیق کو اس انداز سے جانچنا جس کے ذریعے مصنف یا تخلیق کار کے داخلی تصورات و خیالات اور سوچ و افکار کا جائزہ لیا جا سکے اور پھر اُس کے داخلی تصورات کا ربط خارجی عوام کے ساتھ جوڑنے اور سمجھنے کے عمل کو سماجی شعور کہا جاتا ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سماجی شعور صرف سماج سے آگہی یا واقفیت کو زیرِ بحث نہیں لاتا بلکہ سماجی تخلیق کاروں کو بنیاد بنا کر اُن کی سوچوں اور افکار تک کامیاب رسائی حاصل کرنے کا نام ہے۔

سماجی شعور کی ترجمانی ہر ادیب اور مصنف کی تحریر میں ہر دور میں نظر آتی ہے۔ ادب تخلیق کرنے والے مختلف انداز میں مختلف ادوار میں مختلف اصنافِ ادب میں اپنے افکار و خیالات کا اظہار کرتے آئے ہیں۔ ادب کی تخلیقی صورتوں میں شاعری اور نثری ادب جس میں ناول۔ ڈرامہ، افسانہ، سفر نامہ اور دیگر اصناف شامل ہیں۔ میں اپنے اپنے عہد کی عکاسی نظر آتی ہے۔ چنانچہ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ادب کسی بھی شکل میں تخلیق ہو وہ اپنے عہد اور اس میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا ترجمان ہوتا ہے۔ اردو ادب میں سماجی مسائل اور حقائق کی بہترین عکاسی افسانے میں دیکھی جا سکتی ہے۔ مشینی دور میں انسان کے پاس طویل مطالعے کے لیے وقت نہیں ملتا جس کی وجہ سے وہ افسانوی ادب کی طرف صرف اس وجہ سے رجوع کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اسے کم وقت میں پڑھا جا سکتا ہے۔

افسانوی ادب کی تاریخ اور ماہرین کی آراء کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اس حقیقت کو تسلیم کیا گیا ہے کہ واقعی جب سے افسانے نے آنکھ کھولی سماجی عوامل اور مسائل اس کا استقبال کرنے کے لیے تیار تھے۔ اُردو افسانوں کے ابتدائی دور کے مطالعے کے بعد معلوم ہوا کہ اس صنفِ ادب کی ابتداء کے وقت ہی سماجی عناصر اور مسائل جڑ پکڑ چکے تھے۔ انسانی زندگی بہت سے مسائل اور الجھنوں کا شکار تھی۔ انگریزی سامراج کے ظلم و جبر اور تسلط نے پورے برصغیر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ایسے میں اس دور کے ادباء اور افسانہ نگار بھی ان سماجی و سیاسی حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

لہذا انیسویں صدی میں سیاسی سطح پر برپا ہونے والے انقلاب نے افسانہ نگاروں کو بہت متاثر کیا۔ اس طرح وہ صنف جو بظاہر تو فرضی کہانی پر مشتمل نظر آتی لیکن درحقیقت وہ حقیقی زندگی کا ہی پرتو یا عکس کہی جا سکتی ہے کیونکہ ادیب یا افسانہ نگار چاہے کسی بھی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتا ہو کتنا ہی خیالی دنیا کی پیداوار کیوں نہ ہو وہ معاشرتی زندگی سے

بے اعتنائی نہیں برت سکتا اس کی تحریروں میں کہیں نہ کہیں اس کی اپنی زندگی اور ماحول کی ترجمانی ملتی ہے۔ اس کی معاشرتی زندگی کی جھلک واضح طور پر اس کی تحریروں میں دیکھی جاسکتی ہے۔

بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں جب ترقی پسند نظریات کے پنپنے کا آغاز ہوا تو اس نے اردو افسانے کے نئے موضوعات مقرر کر دیے۔ اور اس طرح حقائق پر مبنی تحریروں کا سہرا ترقی پسند تحریک اپنے سر لینے میں کامیاب ہو گئی۔ اس عہد کے افسانوی ادب کے مطالعے کے بعد یہ بات عیاں ہوئی کہ ترقی پسند تحریک ہی انسانی مسائل جن میں مزدوروں کا سماجی اور معاشی استحصال سر فہرست تھا۔ کے خلاف آواز اٹھانے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئی کیونکہ اس کے مقاصد میں یہی اہم نکتہ اول درجہ اختیار کر چکا تھا کہ غریبوں مزدوروں اور کسانوں کے مسائل کو کیسے معاشرتی و سماجی سطح پر منظر عام پر لایا جائے اور ان کے حل کے لیے عملی اقدامات کئے جاسکیں۔ اردو افسانے پر ترقی پسند تحریک کے خاطر خواہ اثرت مرتب ہوئے اور یہی تحریک ہی حقیقت نگاری کو رواج دینے کا باعث بھی بنی۔ اور یوں اردو افسانوں کے موضوعات میں تبدیلی اور تنوع کو گنجائش ملتی گئی۔ اور ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اردو افسانے میں سماجی اقدار و روایات کی بحالی، سماجی مسائل، دکھ درد، معاشرتی انتشار، بد نظمی، امن کی تلاش، غربت، استحصال اور سماجی ناانصافیوں جیسے موضوعات جگہ بنانے لگے۔ اسی بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اردو افسانے نے معاشرتی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں اور انقلابات کو نہ صرف اپنے اندر جگہ دی بلکہ اس دوران ہونے تمام سیاسی اور معاشرتی تحریکات کو بھی واضح شکل فراہم کی۔ تقسیم ہند سے پہلے اور تقسیم ہند کے بعد کے افسانوں میں بھی واضح فرق نظر آتا ہے۔ جہاں تقسیم ہند سے پہلے معاشی و معاشرتی ناانصافیوں، سیاسی جبریت اور معاشرتی ناانصافی جیسے رویوں نے اردو افسانہ پر اثر ڈالا وہاں تقسیم ہند کے بعد کے افسانوی موضوعات میں بے روزگاری، مہاجرین کی آبادکاری سیاسی چپقلش، سرحد پار آنے والے مہاجرین کے ساتھ غیر انسانی برتاؤ نے اپنے جگہ بنالی۔ اس حقیقت کو بھی جھٹلانا ممکن نہیں کہ آزادی کے بعد کے افسانوں میں افسانوی کرداروں کی نفسیاتی کشمکش اور جذباتیت پر بھی دھیان دیا جانے لگا۔

یوں تقسیم ہند کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ہلچل اور ہجرت کی صورت میں جس انسانی المیے نے جنم لیا اور اس المیے کے نتیجے میں انسانی شخصیت اور نفسیات پر پڑنے والے اثرات کا اظہار اس عہد کے افسانوی ادب میں ملتا ہے۔ اس کے بعد ساٹھ کی دہائی اور اس کے بعد کا عرصہ بھی خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ پاک بھارت جنگ، مارشل لاء کا نفاذ، سقوط ڈھاکہ اور دیگر سیاسی و سماجی تبدیلیوں نے بھی دیگر اصناف ادب کی طرح اردو افسانے کو بہت متاثر کیا۔ اس لیے یہ کہنا درست ہے کہ پاکستان میں رونما ہونے والے ہر واقعے نے ہمارے افسانے پر اثر ڈالا۔ اس طرح اردو افسانہ عہد بہ عہد تغیرات زمانہ کو محفوظ کرنے کا باعث بنا اور جدید افسانے سے بھی یہی توقعات وابستہ کی جارہی ہیں کہ سماجی اعتبار

سے وہ اپنی روایات کو آگے بڑھائے اور موجودہ مقام سے آگے بڑھ کر اپنے مقام کا تعین کرے۔اس حقیقت سے نظر چرانا ممکن نہیں کہ افسانوی ادب کی تاریخ اور سماجی مطالعے کے لیے افسانہ نگاروں کا علیحدہ علیحدہ مطالعہ کرنا بھی اتنا ہی اہم ہے ہر عہد کے افسانہ نگاروں نے اپنی تحریروں میں اپنے اپنے عہد کی ترجمانی کی۔

سماجی مسائل پر سب سے پہلے پریم چند نے قلم اٹھایا۔ اور عوام الناس کے ساتھ ساتھ خواص کی توجہ ان مسائل کی جانب مبذول کروانے میں کامیاب ہوئے جنہیں اب تک نظرانداز کیا جاتا رہا تھا۔انہوں نے دیہاتی زندگی کو موضوع میں جگہ دی۔ تخریبی قوتوں کے ساتھ ساتھ تعمیری پہلوؤں پر قلم اٹھانے والوں میں راجندر سنگھ بیدی کا نام سر فہرست ہے ۔دیہی معاشرت کی عکاسی کے حوالے سے احمد ندیم قاسمی کا ذکر بھی قابل توجہ ہے۔ معاشی و معاشرتی ناہمواریوں کے علاوہ انسانی رویوں میں تضاد سیاسی و سماجی انتشار،ابتری،اور دیہاتیوں کی روزمرہ زندگی کے مسائل کو انہوں نے اپنے افسانوں میں جگہ دے کر اپنے عمیق سماجی شعور کا احساس دلایا ہے۔

اجتماعی زندگی اور مشترکہ انسانی مسائل کی عکاسی شوکت صدیقی کے افسانوں میں بھی نظر آتی ہے۔ معاشرتی حقائق اور تلخیوں کو جس طرح انہوں نے اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ جدید دور کے مسائل کی ترجمانی کے حوالے سے رشید امجد اور منشایاد کا نام بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ سماجی کش مکش،خارجی و ملکی حالات کے علاوہ فرد کی داخلی زندگی اور اس کے مسائل کو خارجی عوامل اور مسائل کے ساتھ جوڑنے میں رشید امجد اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے۔

پریم چند کی طرح دورِ جدید کے دیہات کی عکاسی منشایاد کے افسانوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ دیہی لوگوں کی نفسیات اور چھوٹے چھوٹے مسائل کو بیان کرنے کی بنا پر منشایاد کو معاشرے کا بہترین نباض کہا جائے تو بے جانہ ہوگا۔

اُردو افسانہ متنوع موضوعات اور نگاررنگی کی بنا پر انفرادی حیثیت کا حامل ہے۔افسانے کی ابتداء سے لے کر تا حال افسانہ لکھنے والے اپنی تحریروں میں عصری اور سماجی شعور کی ترجمانی کرتے آئے ہیں۔

زیرِ نظر تحقیقی مقالے میں موضوع کے مسئلے،مفروضے سوالات اور مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے باب دوم بعنوان:"صادق حسین کے افسانوں میں سماجی شعور: بحوالہ موضوع"کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا۔اور اُن کے افسانوی موضوعات تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اُن کے تینوں افسانوی مجموعوں بالترتیب"پھولوں کے محل"،"شہر اندر شہر"،"گلاب کے آنسو"اور"متفرق افسانوں"کا باری باری مطالعہ کرنے کے بعد جو نتائج سامنے آئے اُن کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ ان کی زیادہ تر کہانیاں خواص کو موضوع بنانے کی بجائے عوامی رنگ کو اپنائے ہوئے ہیں۔

کیونکہ صادق حسین نے اپنے افسانوں میں غریب، افلاس زدہ، مفلوک الحال، اور نچلے طبقے کے لوگوں اور اُن کی روزمرہ زندگی سے متعلق جو مسائل انہیں در پیش تھے انہیں تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے افسانوں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ہاں چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں لیکن ان چھوٹی چھوٹی باتوں ہی میں وہ زندگی کے حقائق کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان حقائق کی تلاش میں وہ ہر چھوٹی سے چھوٹی اور معمولی سے معمولی چیز کو ٹٹولتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے ساری تفصیل اور جزئیات پر بھی گہری نگاہ رکھی ہے۔ اور یہی تفاصیل اور جزئیات ہی درحقیقت اُن تمام حقائق کو ابھارنے میں بڑا کام کرتی ہیں۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو ان کے موضوعات میں اچھا خاصا تنوع نظر آیا۔ چھوٹی اور عام سی بات سے انھوں نے بڑی بات اور تلخ حقائق کی نشاندہی کی ہے۔ چونکہ ان کے افسانوی موضوعات زیادہ تر دیہاتی سماج اور غریب عوام کے گرد گھومتے ہیں۔ اس لیے غربت اور افلاس کو انہوں نے دیہی اور شہری دونوں سطح پر محسوس کیا ہے۔ غربت کے موضوع پر ان کے بہترین افسانوں میں "یوہنچیاں"، "کلیوں کی پکار"، "دو چھٹانک چاول"، "اترن"، " اس پل پر"، "جھولی"، " انسان"، "پیپل پاؤں اور دائرے"، اور، "اور سورج نکل آیا" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

صادق حسین کے افسانے معتدل فضاء کی تخلیق یا پیداوار نہیں مگر ایسے نکتے پر جنم لیتے ہیں۔ جہاں فرد کی ساری قوتیں اعصاب میں سمٹ جاتی ہیں اور وہ پوری وارفتگی اور ولولے کے ساتھ ایسی قوتوں کو استعمال میں لانے کیلئے مصروفِ عمل ہو جاتا ہے۔ اور یہی قوتیں درحقیقت دیہات میں رہنے والے افراد کی چھوٹی چھوٹی معصومانہ خواہشات، آرزوؤں اور نازک ارمانوں کی تکمیل میں معاونت کرتی ہیں۔ کبھی تو یہ قوت آرزو کی تکمیل کے لیے ساری زندگی کو محنت پر لگا دیتی ہے کیونکہ مستری خداداد کی شریک سفر یوہنچیوں کی فرمائش کر ڈالتی ہے۔ اور کبھی کبھی تو یہ قوت گاؤں کی غیرت و حمیت کے تحفظ کیلئے جان کی قربانی دینے پر اکساتی ہے۔ اسی طرح بعض اوقات یہ قوتیں محنت کا رشتہ موت کے ساتھ جوڑ دینے پر صرف ہو جاتی ہیں کہ "بپتھیرا" بیٹے کی پیدائش کی خوشی منانے کے لیے روپے کے حصول کی خاطر اتنی محنت کرتا ہے کہ وہ اینٹیں بنانے کی شرط جیت کر زندگی کی بازی ہار جاتا ہے۔ اسی طرح یہ تعمیری قوتیں غربت اور معصوم خواہشات اور حسرتوں کو دبا کر خودداری کے جذبے کو پروان چڑھاتی ہیں یہاں تک کہ افسانہ اترن کی کشور لنڈے کے کوٹ کو زیب تن کرنے کی بجائے، اپنی سفید پوشی اور خودداری کو ترجیح دیتی ہے۔

صادق حسین معاشرے کے بہترین نباض ہیں۔ انھوں نے افسانوں میں چھوٹے چھوٹے گھریلو اور روزمرہ زندگی کے مسائل کو افسانوں میں پیش کر کے معاشرے کے ذمہ دار شہری ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ ان کے افسانے ان کے عمیق سماجی مشاہدے کی نشاندہی بھی کرواتے ہیں۔

ان چھوٹے چھوٹے سماجی مسائل میں سماجی بے حسی، عدم تحفظ، طبقاتی کش مکش، بھوک افلاس، فقر و فاقہ، معاشرتی ناانصافی، انتشار، بدنظمی کے علاوہ گھریلو اور خانگی زندگی کے مسائل، معاشرت رویے، اعتقادات، رجحانات وغیرہ ان کے افسانوں کا موضوع ہیں۔ صادق حسین نے غریب طبقے اور ستم گزیدہ افراد کے مسائل کا ذکر اس انداز سے کیا ہے کہ قاری کی توجہ اُن افراد کی جانب ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کی زندگیاں بہت کٹھن مراحل سے گزرتی ہیں۔ محنت اور جفاکشی ان غریب عوام کا مقدر بن جاتی ہے۔ نہ معاشرہ ان کی شکستہ حالی پر نوحہ کناں ہوتا ہے اور نہ ماتم کرتا ہے بلکہ اکثر ایسے مجبور اور بے بس لوگوں کی زندگیوں کا خراج وصول کرتا ہے۔ افسانہ پتھیرا، ''پتھر اور سائے'' اور ''درانتی کا گیت'' میں استحصالی معاشرے کی بھرپور جھلک صادق حسین نے پیش کی ہے۔ سماجی ناانصافیاں، نسلی تفاوت اور طبقاتی امتیازات استحصال زدہ اور پدر سری معاشرے کی نمائندگی کرتی ہیں۔ صادق حسین نے ان امتیازات کو مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں خطوں کے جغرافیائی تناظر کے حوالے سے جانچا اور پرکھا ہے۔

اس طرح صادق حسین بنی نوع انسان پر ہونے والے مظالم کے گواہ بن کر نہ صرف خود کڑھے اور اپنا آپ جلایا بلکہ اپنے ساتھ انہوں نے دوسروں کو بھی چیخنے اور سوچنے پر مجبور کیا۔ ان کے افسانوں میں معاشرتی، سیاسی، سماجی، ثقافتی انتظام و انصرام میں ایک تشنجی کیفیت، ایک الجھاؤ، افراتفری، نارسائی کے منظر نامے ملتے ہیں۔ جو سچائی کے اظہار کے سانچوں میں ڈھلتے جاتے ہیں۔ صادق حسین نے افسانوی موضوعات کو اپنے گرد و پیش سے چنا ہے۔ سماج کا مطالعہ چونکہ انسانی زندگی کے تضادات، حقائق بینی، حسنِ اختصار، نفرت و حقارت اور احساسات کی سرکشی کو پورے اشتداد کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ اس لیے صادق حسین بھی سماج کی نمائندگی اتنی شدت کے ساتھ بیان کر کے اپنے معاشرتی فرائض پر پورا اترنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ کیونکہ جو فن کار جتنا حساس ہوتا ہے۔ اُسے اتنا ہی اپنے گرد و پیش کے حالات کو فن میں سمیٹ لینے کا فن آتا ہے اور وہ اتنا ہی بہتر انداز میں اپنے سماج کو اپنی تحریروں کے ذریعے منعکس کرواتا ہے۔ صادق حسین سماجی برتاؤ کے تمام اجزاء سے واقف تھے۔ اسی لیے انہوں نے سماجی حقائق کو نہ صرف سمجھا بلکہ اسے اچھی طرح سے جانچا اور پرکھا اور پھر تحریری صورت میں ان کی ترجمانی کی اور اس میں انہیں کامیابی حاصل ہوئی۔ اپنی بہترین قوت مشاہدہ کی بدولت وہ باریک سے باریک لیکن تمام سماجی پہلوؤں کو بیان کرنے میں کامیاب رہے۔ دیہی معاشرت کے قریب تر ہونے کی وجہ سے اُن کی تحریروں میں دیہی کلچر کی نمائندگی شہری تہذیب سے زیادہ کی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ انہوں نے شہری معاشرت کو یکسر نظرانداز کر دیا ہو۔ اُن کے چند افسانے شہری تہذیب و معاشرت کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔ تاہم دیہی کلچر کی طرف ان کا رجحان زیادہ رہا۔ دیہی معاشرت پر قلم اٹھانے والوں میں سرفہرست تو پریم چند کا نام آتا ہے۔ اس کے علاوہ احمد ندیم قاسمی، اور منشا یاد

وغیرہ کے نام خاص طور پر اہمیت کے حامل ہیں۔ صادق حسین کے افسانوں کے مطالعے کے بعد یہ کہنا بجا ہے کہ وہ پریم چند اور احمد ندیم قاسمی کی روایت کو آگے بڑھانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ دیہی تہذیب کی عکاسی کرتے ہوئے وہ دیہی مسائل کا جہاں پر ذکر کرنا انھوں نے فرض عین سمجھا وہاں انھوں نے دیہی معاشرت کے خصائص کا بھی ذکر کرنا اتنا ہی اہم سمجھا ہے۔

دیہی سماج سے تعلق رکھنے والے افسانوں میں چاہے وہ یوہنچیاں ہو یا پتھیرا، مولا پہلوان ہو یا دادو، برگد کا پیڑ ہو یا پتھیرا، آخری گاؤں، درانتی کا گیت ہو یا ادھار، دیہات کی جیتی جاگتی زندگی کی ترجمانی کرتے ہوئے انھوں نے اُن کے مخصوص اوصاف کا ذکر بھی کیا ہے۔ جیسے دیہاتی لوگ بہت سادہ لوح، محبت کرنے والے، روایات کے پاسدار، سچے، کھرے، پکے محب وطن اور مٹی سے وفا کرنے والے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ باہمی اتحاد محبت و یگانگت اُن کا خاصا ہے۔ اس کے علاوہ دیہی معاشرے میں بکھرے ہوئے سماجی و معاشی مسائل، خاص کر غربت، وخواہشات کا دم توڑنا، انتقام کی سلگنے والی آگ، باہمی رنجشیں اور خاندانی دشمنیاں اور اُن کے اثرات وغیرہ کو باریک بینی کے ساتھ صادق حسین نے سپردِ قلم کیا ہے۔

انھوں نے لوگوں کے اُن مسائل کو سامنے لایا جن پر ایک عام فرد کی نگاہ نہیں پڑتی۔ آپ نے صورت احوال اور افرادِ معاشرہ کو ایک مخصوص نظر سے دیکھا ہے۔ تاثرِ مرکزیت اور احساسات کی شدت ان کے اہم افسانوی خصائص ہیں۔ ایک اچھا افسانہ نگار ارضی حقائق اور انسانی مسائل واحساسات کے ساتھ رمزیت اور اشارہ انگیزی کو بھی افسانے کا لازمی جزو سمجھتا ہے اور بلاشبہ صادق حسین اس فرض اور احساس کو پوری طرح نبھانے اور ادا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ دیہاتی سماج کے حوالے سے پورا کلچر سیٹ اپ ان کے عمیق مشاہدے کی نمائندگی کرتا ہے۔ اپنے افسانوں میں دیہاتی طرزِ بود و باش، رسوم و رواج، اقدار و روایات اور تہذیب کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے دیہاتی لوگوں کے اعتقادات و توہمات کو بھی تفصیلاً بیان کیا ہے۔ دیہاتی موضوعات پر بہت سے افسانہ نگاروں نے قلم اٹھایا۔ اور یہ سلسلہ پریم چند سے شروع ہو کر موجودہ دور کے افسانہ نگاروں بالخصوص منشا یاد اور دیگر افسانہ نگاروں تک جاری و ساری ہے۔ لیکن صادق حسین کے افسانے اپنی فنی پیش کش اور تخلیقی احساس کی بنا پر منفرد اور نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ دیہی معاشرت کی تمام تجزیئات کو انہوں نے مہارت کے ساتھ بیاں کیا ہے۔ اور دیہاتی سماج کو جزئیات اور اکائیوں کے ساتھ مجموعی طور پر عکسبند کیا ہے انھوں نے دیہاتی لوگوں کے رہن سہن رکھ رکھاؤ، میل جول، رسم و رواج کے ساتھ ساتھ دیہی لوگوں کی روزمرہ سرگرمیوں اور فارغ الوقتی کے مشاغل کو بھی فنی مہارتوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔ دیہی کلچر کی مکمل تصویر کے حوالے سے اُن کے افسانہ "آخری گاؤں"، "کرموں"، "خون کی پگڈنڈی" اور "مولا پہلوان

"میں دیکھی جاسکتی ہے۔دیہاتی ماحول سے متعلق ان تمام افسانوں میں صادق حسین نے اپنے نقطہ نظر اور انفرادی لب ولہجہ کے ساتھ ان موضوعات کا اظہار کیا بلکہ ان افسانوں کے ذریعے انھوں نے دیہاتی نظام اور کسانوں کی ذہنیت اور نفسیات کو بھی سامنے لایا ہے۔اور افسانوی موضوعات کو معاشرے کے رسم و رواج اور دیہات کے طور طریقوں کی مناسبت سے پیش کیا ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کہ انھوں دیہات کو موضوع بنایا مگر ہر افسانے میں انہوں نے دیہات کو نئے انداز سے پیش کیا ہے۔دیہاتی سماج سے تعلق رکھنے والے اُن کے افسانے موضوعات کے حوالے سے مختلف ہیں۔اگر افسانہ "پونچیاں" میں انھوں نے دیہاتیوں کی معصومانہ خواہشات کو حسرتوں میں تبدیل ہوتے دکھایا ہے تو وہیں پر افسانہ "ہتھیرا" میں غربت کے ہاتھوں مجبور لیکن باہمت شخص کی زندگی میں آنے والی دشواریوں کو پیش کیا۔اسی طرح افسانہ "دادو" مٹی سے وفا کی عمدہ مثال پیش کرتا ہے۔"خون کی پگڈنڈی" کا موضوع خاندانی دشمنی اور عناد اور انتقامی کاروائیوں کے حوالے سے دیہاتیوں کے طرزِ عمل کی نمائندگی کرتا ہے۔

"برگد کا پیڑ" موضوعاتی اعتبار سے حقیقت پسندی کا مجسم نمونہ پیش کرتے ہوئے دیہی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان پر تنقید کرتا ہے۔دیہاتیوں کے خلاف شہریوں کے منفی رویوں اور شہریوں کے خلاف دیہاتیوں کے رویوں کی عکاسی بھی اُن کے افسانوں کا حصہ ہے۔ جہاں بھی دیہاتیوں کی عزت کا سوال پیدا ہوتا ہے وہاں صادق حسین کے قلم میں خود ہی کھرد راپن نظر آجاتا ہے۔اور دیہاتیوں کے جذبات کی عکاسی خود بخود ان کے الفاظوں میں نمایاں ہوتی نظر آتی ہے۔افسانہ "حمیدا کڑیل" غربت اور افلاس زدہ دیہی معاشرت کا عکاس ہے۔ افسانہ "انسان" میں صادق حسین نے سماجی سطح پر انسانی زندگی کی ناگفتہ بہ صورتحال کو واضح کر کے انسان دوستی، غمگساری، محبت و شفقت اور مساوات و بھائی چارے کی خوش کن روایت کو آگے بڑھایا۔اسی طرح افسانہ "شعلوں کے سائے میں" کا موضوع محبت ہے اور دیہی اور شہری زندگی کے موازنے کی عملی تصویر پیش کرتا ہے۔اس طرح ان کے دیہی معاشرت سے تعلق رکھنے والے افسانوں میں بھی موضوعاتی تنوع اور رنگارنگی موجود ہے۔

صادق حسین کی مشاہدے کی صلاحیت قابل دید ہے معاشرتی تجزیے اور مشاہدے کے حوالے سے انہوں نے حواس خمسہ کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ان کے افسانوں کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ انھوں نے اشیاء کو صرف آنکھ سے نہیں دیکھا بلکہ تمام حواس خمسہ کا بخوبی استعمال کر کے انہیں ایسے خدوخال عطا کیے کہ وہ اشیاء زندہ ہو کر مکمل شکل و صورت اختیار کر گئیں۔اس طرح قاری اُن کے محسوسات کے خزینوں کو جذب کر لینے میں کامیاب ہو جاتا ہے جو ان کے افسانوں میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔

صادق حسین سماجی ناہمواریوں اور انسانی استحصال کے خلاف سراپا احتجاج بن گئے۔ انھوں نے معاشرتی بے اعتدالیوں کو مشرقی اور مغربی پاکستان کے دیہات اور شہر دونوں کے تناظر میں پیش کیا ہے۔ انسانی استحصال چاہے معاشی سطح پر ہو یا سماجی سطح پر یا پھر نفسیاتی سطح پر کسی بھی جاندار معاشرے میں یہ فعل قابل قبول نہیں۔ "روپ ونتی"، "انسان"، "پتھر اور سائے"، "پتھیرا"، اور " دو چھٹانک چاول" کے موضوعات استحصالی زدہ معاشرے کے عکاس ہیں۔ یہ افسانے انسان کی شکست وریخت کو واضح کرتے ہیں۔ کہیں بھوک کے ہاتھوں انسان کی تذلیل ہوتی ہے۔ تو کہیں سماج کی بیڑیاں انسان کو شکست دینے کا باعث بنتی ہیں اور کہیں سماجی روایات کے ہاتھوں انسان شکست کھاتا نظر آتا ہے۔ صادق حسین ایسے ہی مجبور اور بے بس افراد کی آواز کو بلند کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ افسانے کی دنیا چونکہ حساس افسانوں کی دنیا ہے۔ اسی لیے صادق حسین نے انسانی فلاح اور سماجی انصاف کی غرض سے ان تمام مسائل کو موضوع بنایا۔ اور سماجی ذمہ داریوں کو نبھانے میں کامیاب ہوئے۔ مذکورہ بالا افسانوں میں انہوں نے معاشرتی و سماجی بے حسی اور افراد معاشرہ کی اخلاقی و سماجی ذمہ داریوں سے لاتعلقی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ مہذب سماج کی ظاہر داریوں اور کھوکھلے پن پر گہرا طنز بھی کیا ہے۔ جہاں لوگ احساسات اور ہمدردی کے جذبات سے عاری ہیں۔ جہاں غربت کو جرم عظیم سمجھا جاتا ہے۔ جہاں انسانیت کی بجائے اس کے معاشرتی وقار کو اہمیت دی جاتی ہو در حقیقت صادق حسین نے خارج کو موضوع بنا کر داخلیت کی طرف پیش قدمی کی ہے۔ اور انسانی احساسات کو بیدار کرنے کی حتی المقدور کوشش کو جاری رکھا۔ ہم احساس یگانگت واتحاد کے بغیر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جسکی وجہ سے معاشرہ تنزلی کا شکار ہو رہا ہے۔ انسان کے اندر احساسات و جذبات ناپید ہو چکے ہیں۔ ہر فرد جذباتی و ذہنی افراتفری کا شکار ہے۔ اسی انتشار اور افراتفری کے سبب ہر فرد معاشرے سے کٹ کر رہ گیا ہے۔ اور یہ کہنا بھی درست ہے کہ فرد اور معاشرے میں صرف اجنبیت کا رشتہ رہ گیا ہے۔ حالات کے مارے افراد کی زندگیوں اور مسائل کو موضوعات میں جگہ دے کر صادق حسین نے فرد اور معاشرے میں اس اجنبیت کو ختم کرنے شعوری کوشش کی ہے۔ ان کا سماجی مطالعہ و مشاہدہ حیاتِ انسانی کے واشگاف حقائق و تضاد کو پوری شدت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ ان کے تحریروں میں سماجی مسائل کی چبھن ہے۔ اور ایک طرح سے انھوں نے افسانے کی روایتی اسلوب کو سماجی حقائق اور مسائل کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ حساس اور پیچیدہ موضوعات پر قلم اٹھانا صادق حسین کے پختہ سماجی شعور کی دلیل پیش کرتا ہے۔ اور اسطرح ان کا فنی ادراک انتہائی بلندی پر نظر آتا ہے۔

صادق حسین کہانی کہنے اور لکھنے کے فن سے بخوبی آشنا اور واقف ہیں۔ اُن کے افسانوں کے مطالعے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کے افسانوں میں ڈرامائی انداز بالکل بھی موجود نہیں ہے۔ بس وہ چھوٹے چھوٹے واقعات کے

ذریعے کہانی کو پر تاثیر بانے میں دسترس رکھتے ہیں۔اُن کے افسانوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اُن کے افسانوں کا ماحول مصنوعی یا بناوٹی نہیں۔ بلکہ حقائق پر مبنی ہے۔انسان کی فطری طور پر معصوم اور سچی تصویروں کو سلیقے کے ساتھ احاطہِ تحریر میں لانے کے فن سے وہ بخوبی واقف ہیں اور اسکی وجہ یہی ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں خود کو دوسروں کی جگہ رکھ کر دیکھتے ہیں۔اس سلسلے میں انھوں نے سینکڑوں روپ بدل کر خود کو ان گنت قالبوں میں ڈھالا اور انسانی فطرت کی عالمگیر صداقتوں کو تحریری صورت میں کاغذ پر بکھیرا ہے۔انھوں نے زندگی میں سب سے زیادہ انسان اور انسان کے باہمی رشتوں کو اہمیت دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صادق حسین کے افسانوں میں انسانیت کا احترام اور اس کے مقام کے حوالے سے ان کے بڑے خوبصورت جذبات ملتے ہیں۔

جیتی جاگتی دنیا اور اس سے متعلق واقعات و حادثات کی تصویر صادق حسین کے افسانوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔انھوں نے محض خلاؤں کی بات نہیں کی بلکہ حقیقت پسندی کا اظہار کر کے خود کو حقائق نگار افسانہ نویسوں کی فہرست میں کھڑا کیا ہے۔ فردِ حیات اور معاشرے کے ساتھ گہرے تعلق اور وابستگی کے سبب افرد معاشرہ کی زندگی کے تمام پہلوؤں کی ترجمانی کا فرض انھوں نے باحسن وخوبی نبھایا ہے۔ سماجی ناہمواریوں اور مسائل کا تذکرہ کرتے ہوئے صادق حسین کئی جگہوں پر نقاد بن جاتے ہیں تو کہیں اصلاحی پہلوؤں کے پیش نظر اُن کے افسانوں میں ناصحانہ رنگ غالب نظر آتا ہے۔ جب قوسِ قزح کی آنکھ کھلی، "سورج مکھی" ،"بونے"،"قیدی"اور" تیسری حویلی"میں سماجی عوامل کے حوالے سے کھلی تنقید کی گئی ہے جبکہ "برگد کا پیڑ"،"انسان اور صلیب" اور"ادھار" اور"زعفران کے پھول"میں ناصحانہ پہلوؤں کو ترجیح دی گئی ہے۔

صادق حسین کے افسانوں کا مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ انہوں نے سماجی زندگی کے ہر زاویے اور ہر گوشے کو اتنی باریکی سے پیش کیا ہے کہ اُن کے بنیادی نکتہ نظر کی پوری پوری عکاسی نظر آتی ہے۔انھوں نے سماج میں رہتے ہوئے انسانی زندگی کا عمیق مطالعہ کرنے کے بعد تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر اپنے نوکِ قلم سے سماجی حقائق اور معاشرتی عوامل کو سامنے لانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ سماجی ارتقاء اور خوشحالی کو برقرار رکھنے کے لیے جو بنیادی شرائط ہیں صادق حسین نے اپنے افسانوں میں اپنی شرائط کو پورا کرنے کے لیے تجاویز بھی دی ہیں اور مشورے بھی۔ یہ حقیقت بھی اظہر من الشمس ہے کہ کامیاب معاشرتی زندگی کے لیے معاشرتی بقاء ترقی اور امن و سکون اور اطمینان بھری زندگی لازی ہے۔ کسی بھی سماج کی بقاء اور ترقی کے پس منظر میں دفاعی اقدامات اور امن و آشتی کا خاصا کردار ہے۔ سماجی زندگی کو مربوط و مستحکم بنانے کے لیے اتحاد، یک جہتی اور اجتماعی قوتوں کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ سماجی ارتقاء کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے دفاع اور سماجی تحفظ بہت ضروری ہیں۔ صادق حسین نے افسانہ ''خون کا

معبد'' قانون اور کانٹے اور "انکار" کے ذریعے حب الوطنی کے جذبات کو فروغ دیا ہے۔ کوئی بھی معاشرہ حب الوطنی کے جذبات سے عاری نہیں ہوتا۔ چھوٹی چھوٹی بستیوں اور کالونیوں میں رہنے والے افراد بھی اپنے تحفظ کے لیے دفاعی اقدامات کرتے رہتے ہیں۔ معاشرتی امن اور سلامتی کے لیے خون کی ضرورت پڑتی ہے۔ چونکہ صادق حسین نے جیتے جاگتے معاشرے کی تصاویر پیش کی ہیں اس لیے اُن کی نگاہوں سے امن اور سلامتی کا موضوع او جھل نہیں رہا۔ عسکری خدمات کے حوالے سے ایک فوجی جوان کی بہادری، اپنے مشن سے وابستگی اور کٹھن حالات میں بھی اپنے موقف پر ڈٹے رہنے کو صادق حسین نے افسانہ "انکار" میں بالکل منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔

صادق حسین نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ محض اپنی ذاتی اور بے معنی لذت اندوزی کے لیے نہیں لکھا بلکہ ان کا مقصد اپنے جذبات واحساسات اور مشاہدات و تجربات کو دوسروں تک منتقل کرنا تھا۔ اسی لیے کسی بھی موضوع پر قلم اٹھاتے وقت وہ عصری مطالبات اور رجحانات کے ساتھ ساتھ سچائی اور حقیقت پسندی سے بالکل بے خبر نہیں رہے۔ زندگی کے نشیب و فراز اور مطالبات کے بارے میں وہ اپناالگ اور منفرد زاویہ نگاہ رکھتے ہیں۔ ان کے انداز فکر اور نقطہ نگاہ کا عکس اُن کے افسانوں میں ملتا ہے۔ اُن کے افسانوی موضوعات میں انفرادیت موجود ہے۔ اگر وہ انسانی نفسیات کی بات کرتے ہیں تو ہر افسانے میں ان کا انداز جدا ہوتا ہے۔ ایک افسانے میں اگر انھوں نے عورت کی نفسیات کی بات کی ہے تو دوسرے افسانے میں انھوں نے مرد کی نفسیات کا تجزیہ کیا ہے۔ معاشرے کے تمام افراد کی نفسیات کو اپنے ہر افسانے میں صادق حسین نے بہت ہی عمدہ انداز میں بیان کیا ہے۔ عورت کی نفسیات کو انھوں خصوصی طور پر اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ عورت کی نفسیات سے وہ بخوبی آشنا تھے۔ انھوں نے عورت کی فطرت کو حقیقت پسندی کے ساتھ اپنے افسانوں "جب قوس قزح کی آنکھ کھلی"، "روپ ونتی"، "سورج مکھی"، "کچنار"، "کرموں" اور "ہیلن آف ٹرائے" میں بیان کیا ہے۔ عورت کی نفسیات کو انھوں نے ان افسانوں میں ہر زاویہ نگاہ سے دیکھا۔ عورت اور مرد کی نفسیات کا موازنہ بھی انہوں اپنے افسانہ "اینٹ کی بیگم"، "بوفے" اور "زعفران کے پھول" میں کیا ہے۔

اُن کے نزدیک عورت چاہے فلسفی ہو یا سائنسدان، مصنفہ ہو یا سیاستدان محبت جیسے لطیف جذبے سے کٹ کر نہیں رہ سکتی۔ اسی طرح مرد کی محبت کے حوالے سے ان کا کہنا ہے کہ مرد کی محبت ہر دور میں یکساں رہتی ہے۔ وہ چاہے چار شادیاں بھی کر لے لیکن آئیڈیل کو پانے کی تمنا اُس کے دل میں ہمیشہ رہے گی۔ انھوں نے انسانی نفسیات اور وسائل کو نفسی دروبینی کے عمل سے واضح کیا ہے۔ عورت ہو یا مرد، بوڑھا ہو یا جوان دیہاتی اور یا شہری، امیر ہو یا غریب اانسانی نفسیات، جذبات، نفرتوں، محبتوں، حساسیت اور دیگر رویوں اور رجحانات کی عکسبندی انہوں نے بحیثیت مجموعی ہر

افسانے میں کی ہے۔ ان کے افسانوں کے مطالعے کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ ان کی سماجی بصیرت اور قوت مشاہدہ نے انھیں انسانی فطرت کا نباض بنادیا ہے۔

چونکہ ایک سچا ادیب یا شاعر اپنے موضوع کا مشاہدہ کر کے ادب تخلیق کرتا ہے۔ اس لیے اس کے شعور پر ماحول کے اثرات اور اس کے ذاتی داخلی میلانات کا اثر ہوتا ہے۔ صادق حسین کے افسانوی موضوعات سے اندازہ ہوا ہے کہ ماحول اور معاشرے کا ان کی تحریروں میں بطورِ خاص کردار ہے۔ صادق حسین کے بیشتر افسانے دیہاتی سماج کے عکاس ہیں۔ اور اس کی وجہ دوران ملازمت اُن کا مختلف خطوں میں جانا اور قیام کرنا ہے۔ جغرافیائی تناظر کے حوالے سے صادق حسین نے زیادہ تر افسانے پوٹھواری خطے کی نمائندگی کی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے کچھ افسانوں میں بنگال کے خطے اور کلچر کی جھلک بھی موجود ہے۔ "جب قوس قزح کی آنکھ کھلی"، "دو چھٹانک چاول" ، "پتھر اور سائے"، "روپ و نتی"، "شعلوں کے سائے" اور "چمکیلے اندھیرے" بنگالی کلچر اور تہذیب کی عکاسی کرنے والے نمائندہ افسانے ہیں جن میں انھوں نے صوبہ بنگال سے تعلق رکھنے والے افراد کی سوچوں، رویوں، مشکلات و مسائل، معمولات زندگی اور مشاغل کے علاوہ اُن کی نفسیات کی ترجمانی بھی عمدہ انداز میں کی ہے۔

صادق حسین حقیقت نگار ترقی پسند مصنف ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں انسان کی تشریح اس کے مادی ماحول سے کی ہے۔ بنیادی طور پر وہ حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں اس لیے معاشرتی حقائق کی ترجمانی کو افسانے کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ انسان دوستی ان کا مقصد حیات ہے۔ اسی لیے جب انھوں نے انسان کو غیر انسانی حالت میں دیکھا تو ان کے اندر کا حساس افسانہ نگار تخلیقی و تحریری سطح پر احتجاج کیے بغیر نہیں رہ سکا۔ انھوں نے اپنے عہد کی زندگی اور اس کے مسائل پر ہمدردانہ نگاہ ڈالی اور ان کا زاویہ نظر وسیع اور ذات پات، رنگ و نسل کی قیود سے آزاد تھا۔ دیہات چونکہ ان کے داخل میں موجود تھا اس لیے ان کی سادگی میں ان کے افسانوں میں صداقت کے تمام جواہر موجود ہیں۔ بظاہر ان کے افسانوی موضوعات میں مماثلتیں نظر آتی ہیں۔ لیکن اُن کے ہر افسانے میں ان مماثلتوں کے باوجود انفرادیت نمایاں ہے۔ انھوں نے ایک ایک موضوع کے اندر مختلف ذیلی موضوعات کے ذریعے باریک سے باریک اور انتہائی اہم سماجی پہلوؤں کی نشاندہی کروائی ہے۔ اور ان مسائل اور عوامل کی جانب قاری کی توجہ مبذول کروانے میں کامیاب ہوئے ہیں جن پر شاید ہی کسی ادیب اور افسانہ نگار نے اس سے پہلے توجہ دی ہو۔ کہا جاتا ہے کہ ہر حساس افسانہ نگار یا فنکار اپنے ارد گرد کے ماحول سے متاثر ہوتا ہے اور اسی ماحول سے اپنے فن کا مواد حاصل کرتا ہے۔ حقیقی زندگی کے حقیقی تجربات اور مشاہدات ہی درحقیقت اس کی فکر اور تحریر کے رخ کا تعین کرتے ہیں۔ جب وہ کسی بھی موضوع پر اظہار خیال کرتے اپنے حقیقی زندگی کے تجربات احساسات اور مشاہدات کو احاطہِ تحریر میں لاتا ہے تو اسے حقیقت نگار ادیب یا

افسانہ نگار کہا جاتا ہے۔ صادق حسین نے بھی حقیقی زندگی کے تجربات قلم کو سپرد کیئے۔ اس لیے کوئی بھی معاشرتی اور سماجی زندگی کا پہلو اُن کی نگاہوں سے او جھل نہیں رہا۔ اُن کی حس لطیف نے انہیں زندگی کے سب سے حسین پہلو محبت کو نگاہوں سے او جھل نہیں ہونے دیا۔ آپ نے محبت کے عنوان پر بے شمار افسانے لکھے اور ان کے ہر افسانے میں محبت کے متنوع صورتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔"کلیوں کی پکار"،"سورج مکھی"،"مولا پہلوان"،"خون کی پگڈنڈی"،"دشمن"،"آخری گاؤں"،"روپ ونتی"،"ہیلن آف ٹرائے"اور" شعلوں کے سائے میں" جیسے افسانے محبت کی رنگارنگ صورتوں کے ترجمان ہیں۔ کبھی یہ محبت عورت اور مرد کی محبت کا رنگ اپنائے ہوئے نظر آتی ہے۔ تو کبھی مامتا کے رنگ میں اجاگر ہوتی ہے۔ یہ محبت کبھی وطن کی آن پر جان نچھاور کرتے ہوئے ظاہر ہوتی ہے تو کبھی شوہر سے محبت کا اظہار کی صورت میں نمایاں ہوتی نظر آتی ہے اور کہیں پدرانہ شفقت کی شکل میں رنگ بکھیرتی نظر آتی ہے۔ لیکن صادق حسین کے افسانوں میں محبت کے سبھی رنگ منفرد اور جدا ہیں جنھیں صادق حسین کے بیان کے حُسن نے اُن کے نکھار میں اضافہ کیا ہے۔

صادق حسین کے افسانوں کی نمایاں خصوصیت وہ منصوبہ بند لائحہ عمل اور فکر وخیال کی ترتیب ہے جو وہ افسانہ تحریر کرنے سے پہلے اختیار کرتے ہیں اور یہی خصوصیت انھیں دوسرے افسانہ نگاروں سے ممتاز کرواتی ہے۔ صادق حسین کے افسانوں میں ذہنی وجذباتی حقائق کا فنی اظہار بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اُن کی کہانیوں اور افسانوی موضوعات میں اُن کی ظاہری غیر جانبداری کے پیچھے ان کی دردمندی اور انسان دوستی کا جذبہ اور تصور ہر وقت اور ہر لحظہ متحرک رہتا ہے۔ معاشرتی رویوں اور تضادات کو داخلی، جذباتی اور خارجی سطح پر پیش کرنے میں انھیں خاصہ کمال حاصل تھا۔ اور بلاشبہ یہ خصوصیت ان کی تجزیاتی قوت اور قوتِ مشاہدہ کی عطا کردہ ہے۔ انھوں نے اپنے موضوعات میں مجبور، غریب اور بے کس لوگوں کی جذباتی الجھنوں اور ماحولیاتی گھٹن کو جس انداز سے بیان کیا ہے اس وجہ سے ان پر ترقی پسند حقیقت نگار افسانہ نویس ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ غریب، مفلوک الحال اور نچلے طبقات کے علاوہ انھوں نے اپنے افسانوں میں امیر اور اونچے طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کی زندگیوں اور سماجی امور کے حوالے سے سیر حاصل بحث کرنے کے ساتھ ساتھ اُن کے منفی رویوں اور خامیوں پر تنقید بھی کی ہے۔ اونچ طبقے کی عکاسی کرنے والے افسانوں میں "سورج مکھی"، "اینٹ کی بیگم"، "بونے"، "نانی انکل" اور "خوشبو کی بستی" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

زمانی تناظر کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو صادق حسین کے افسانوں میں تغیراتِ زمانہ کے اثرات بھی نظر آتے ہیں ان کے پہلے افسانوی مجموعے "پھولوں کے محل" کے بیشتر افسانے دیہاتی سماج کی باریکیوں اور معصومانہ اور شفاف طرزِ معاشرت کے عکاس ہیں۔ لیکن ان کے دوسرے افسانوی مجموعے "شہر اندر شہر" کے

افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ کہنا درست ہے کہ ان کے فن نے ترقی کی ہے۔ کیونکہ ان کے افسانوں میں زندگی کے تنوع کے ساتھ ساتھ معاشرتی رنگارنگی اور گہرائی بھی نظر آتی ہے۔ اور "شہر اندر شہر" کے افسانوں کے موضوعات میں "پھولوں کے محل" کے افسانوں جیسا تاثر اور رنگ بھی نظر نہیں آتا۔ "شہر اندر شہر" کے افسانوں کے موضوعات میں جو نمایاں تبدیلی دیکھی گئی وہ ہے دیہات پر شہری زندگی کے اثرات کا مرتب ہونا۔ اور یہ چیز اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ زمانی تغیر نے جہاں عام انسانی زندگی کو متاثر کیا وہاں دیہات بھی تغیرات زمانہ اور سماجی ترقی کے اثرات قبول کرنے میں پیچھے نہیں رہا۔ اسی طرح معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں کے اثرات جیسے منگلہ پاور پلانٹ کے قیام کا تذکرہ اور جمہوریت کا تصور ان کے افسانوں میں ملتا ہے۔ صادق حسین کے افسانوں کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے موضوع کے تعین کرنے سے پہلے سوچ بچار سے کام لیا ہے۔ انہوں نے پہلے فکر و خیال کے تانے بنے، پھر کہانی کا مرکزی خیال ترتیب دینے کے بعد اسے احاطہ فکر میں لایا۔ اس کے بعد عنوان دے کر کہانیوں کو مکمل صورت دی۔ اپنی کاوشوں کی بدولت ان کے افسانوں میں آہنگ اور ہمہ گیریت نظر آتی ہے۔

زیر تحقیق مقالے کے موضوع، مسئلے، مفروضے، سوالات اور مقاصد کو مد نظر رکھتے ہوئے باب سوم بعنوان "صادق حسین کے افسانوں میں سماجی شعور بحوالہ کردار" کا تجزیاتی مطالعہ کرنے کے بعد اُن کے افسانوی کرداروں کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئیں اُن کی روشنی میں یہ کہنا درست ہے کہ صادق حسین اپنی زبردست قوتِ مشاہدہ اور وسعتِ نظری کی بنا پر تجربات واقعات اور سانحات کے صحیح نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت سے مالا مال ہیں۔ انھوں تحلیل نفسی کے اصولوں کو اپناتے ہوئے اپنے کرداروں کے باطن میں جھانک کر ان کے احساسات و جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ ان کے افسانوی کردار ہمارے سماج کے چلتے پھرتے زندہ اور بے مثال کردار ہیں۔ ان کرداروں کے ذریعے صادق حسین بہت سارے سماجی پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ حقیقت پسندی آپ کا شیوہ ہے۔ کردار سازی میں بھی آپ نے فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ کردار سازی کے وقت آپ نے کرداروں کے خیالات، جذبات، احساسات، مخصوص ذہنی کیفیات، ہیجانات اور اضطراب کو لفظی جامہ پہنانے کے ساتھ اس میں انفرادیت، حقیقت اور اصلیت کے علاوہ افسانوی دلکشی، شاعرانہ لطافت اور نفسیات کو بھی شامل رکھا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے اُن کی کہانیاں زیادہ تر ان کرداروں کے گرد گھومتی ہیں جو کسی نہ کسی الیے یا سماجی مسائل کا شکار ہوں۔ آپ نے کرداروں کو ان کے تمام تر مسائل سمیت اُن کی باطنی کیفیات و حالات کو بھی بیان کیا اس لیے اُن

کے کردار غیر حقیقی معلوم نہیں ہوتے بلکہ ہمارے معاشرے کے جیتے جاگتے کردار نظر آتے ہیں۔ صادق حسین کے بیشتر کردار سماج کے نچلے طبقے کی نمائندگی کرنے والے افراد ہیں۔ ان افسانوی کرداروں کے نام ہی اُن کی

سماجی حیثیت کی پہچان کروانے کے لیے کافی ہیں۔" مستری خدادادخان""،پتھیرا"،"ماسی جنتے"،"ٹھاجا قصائی"، "کرموں"اور"دادو پہلوان"وغیرہ ان کے افسانوں کے کردار ہیں جو نچلے اور متوسط طبقے کی عکاسی کرتے ہیں۔

یہ کردار ایسے ہیں جو زیادہ تر دیہی زندگی سے منسلک ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان خواہشات کا منبع ہے ہر صورت اپنی خواہشات کی تکمیل چاہتا ہے۔ خواہشات کی تکمیل کی غرض سے وہ ہر جائز ناجائز ذرائع استعمال بھی کرنا شروع کر دیتا ہے۔ لیکن صادق حسین کے افسانوی کردار اس کے برعکس ہیں وہ توکل اور محنت پر یقین رکھنے کے عادی ہیں۔ خواہشات کی تکمیل کے عمل میں ان کے کرداروں میں بغاوت کی بجائے خلوص اور لگن کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ جو ہر لحاظ سے خیر اور بھلائی کا درس دیتا ہے۔ اس سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ صادق حسین کا سماجی و انفرادی شعور وسیع النظری کے باعث انسان دوستی کا درس دینے کے علاوہ معاشرتی اصلاح کا بھی ضامن ہے۔

معاشرتی زندگی کا کوئی بھی پہلو اُن کی نگاہوں سے ڈھکا چھپا نہیں رہا۔ انہوں نے بھوک سے بلکتے لوگوں کی سسکیوں کو بھی سنا ہے تو چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے حصول کے لیے انسان کو تگ و دو کرتے ہوئے بھی دکھایا ہے۔ صادق حسین نے معاشرے کی دکھتی رگوں کو ہاتھ لگایا تو "بوڑھی مانگو" بھوک سے نڈھال اپنی خودداری کو بیٹی کی عصمت کے عوض فروخت کر دینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ استحصالی معاشرے کے متاثرہ افراد کے لوگوں کے مسائل پر آہ و بکا کریں تو "پتھیرا" سماج کے رسم و رواج کے آگے مجبور ہو کر اپنی حیثیت سے بڑھ کر اپنے خاندان کی خوشیوں اور خواہشات کا احترام کرتا ہے تو اسے زندگی کی بازی ہارنا پڑتی ہے۔ غربت کے باعث انسان کی تذلیل ہوتی دکھاتے ہیں تو افسانہ "انسان" کے " منگو" میں احساس کمتری اس حد تک شدت اختیار کر جاتا ہے کہ وہ اپنی ستم ظریفیوں کی داستان کو ذہن سے محو کرنے کے لیے مزاحمتی کاروائی کے طور پر خود کو کتوں کا حاکم تصور کر کے اُن پر ایسے ہی حکم صادر کرتا ہے جیسے اس کا مالک اس پر حکم صادر کرتا ہے۔ سماجی بے حسی کی بات کریں تو "پتھر" اور " قینچی" کے آگے انسانی جان کی وقعت صرف دس روپے کے نوٹ تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ افلاس زدہ معاشرے میں بڑے کنبے کی کفالت کا تذکرہ کریں تو "کلیوں کی پکار" کا اسلم بڑے کنبے کی کفالت کرتے کرتے وقت سے پہلے بوڑھا ہوتا نظر آتا ہے۔ مٹی سے وفا کی بات کریں تو "دادو" اور "استاد شیدو" جیسے ناپسندیدہ کرداروں کے لیے پسندیدگی کے جذبات امڈتے نظر آتے ہیں اور قاری کی تمام ہمدردیاں اُن کیلئے مجتمع ہو جاتی ہیں۔ محبت میں وفاشعاری کی مثال قائم کرنی ہو تو "روپ ونتی"، "پریتم" کے انتظار میں مصائب زمانہ کا مقابلہ کرتے کرتے پاگل ہوتی نظر آتی ہے۔ افراد معاشرہ کا ذکر کریں تو معاشرے کا ہر فرد ہی اپنے اپنے طور پر مصائب زمانہ سے تنگ ہو کر خود کو "صلیب" پر لٹکا ہوا محسوس کرتا

ہے۔الغرض کوئی بھی معاشرتی پہلواُن کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہا۔ان کے افسانوی کردار بہت خوب ہیں اور ہر قدم پر مصالحت کے عادی ہیں۔

انھوں نے چھوٹے چھوٹے کرداروں کے ذریعے کہانی کا تانا بانا بن کر اسے بام عروج تک پہنچایا۔اُن کے افسانوی کردار دیہاتی سماج سے بھی تعلق رکھتے ہیں تو شہری سماج سے بھی۔اپنے کرداروں کے ذریعے انھوں نے جہاں سماج کے نچلے اور حقیر طبقے کو موضوع بنایا وہیں پر وہ سماج کے اونچے اور اعلیٰ طبقے کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔

ان کے کردار اپنے ساتھ پورا سماجی پس منظر اور ایک مکمل سیٹ اپ لئے ہوئے ہیں۔انھوں نے اپنے کرداروں کے ذریعے نہ صرف سماجی روایات اور رویوں کو منظر عام پر لایا ہے بلکہ اُن کی نفسیات اور احساسات کو بھی واضح کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔اس طرح دیکھا جائے تو ان کے افسانوی موضوعات کی طرح ان کے کرداروں میں تنوع ہے۔صادق حسین کے افسانوں میں مشاہدے کی گہرائی، تجربے کی وسعت، شعور کی پختگی، قلم کی بے باکی اور بے ساختگی کا حسین امتزاج ملتا ہے۔انہوں نے موضوع اور مواد کے مطابق مناظر اور کرداروں کا انتخاب کیا۔

صادق حسین کی حساس طبعی اُن کے افسانوی کرداروں کی شخصیت کے ذریعے محسوس کی جاسکتی ہے۔انہوں نے جس انداز سے اُن کے احساسات، نفسیات اور جذبات کو بیان کیا ہے وہ صادق حسین کے عمیق سماجی شعور اور وسیع النظری کی عمدہ مثال پیش کرتا ہے۔

صادق حسین کے افسانوی کرداروں میں رنگارنگی ہے یہ کردار تقدیر کے دھاگے میں پروئی ہوئی ایک مالا کی صورت میں ظاہر ہوئے جن کے ذریعے انہوں نے فرد کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات، خوشیوں، غموں، امیدوں، ناامیدیوں آرزوؤں، مسرتوں، حسرتوں، اور خوابوں کے ذریعے انسان کے پورے وجود کو اس کے معاشرتی تناظر میں گرفت میں لینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

صادق حسین انسانی جذبات واحساسات کے صحیح ترجمان ہیں۔اس لیے ان میں خوبیاں اور خامیاں دونوں پائی جاتی ہیں۔ان کے ہاں سلیقے سے کردار نگاری اس حوالے سے بہت اعلیٰ پائے کی ہے۔وہ حقیقی کرداروں کو زندگی کی تمام تر سچائیوں اور جزئیات کے ساتھ پیش کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ان کے بعض افسانوی کرداروں میں عمل اور سوچ کے حوالے سے مماثلتیں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔اس کے علاوہ مشترک صفات بھی۔اس کی وجہ صادق حسین کی اپنی ذات کا عکس اور شریف الطبعی ہے جو ان کے شخصی اوصاف کی صورت میں ان کے افسانوی کرداروں میں عیاں ہوئی ہے۔

زیرِ تحقیق مقالے کا چوتھا باب بعنوان "صادق حسین کے افسانوں میں سماجی شعور بحوالہ اسلوب" کے تجزیاتی مطالعے کے بعد جو نتائج سامنے آئے اُن کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنے افسانوں کو پر تاثیر بنانے کے لیے اُن تمام وسائل کو استعمال کیا ہے جس نے ان کی تحریروں کی معانی و مطالب میں نہ صرف خوبصورتی پیدا کی ہے بلکہ اسے فصاحت وبلاغت کے مقام پر لانے میں بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ آپ کا اسلوب بیان دوسرے افسانہ نگاروں سے ممتاز ہے۔ ان کے فکری و فنی عناصر اور سماجی تجربات نے ان تمام افسانوں کو یادگار بنایا ہے۔ ان کی سطور میں تہہ داری کی خصوصیت نمایاں ہوتی نظر آتی ہے۔ ان کے افسانوں کے تجزیاتی مطالعے کے بعد جو چیز منظر عام پر آتی وہ یہ کہ صادق حسین فطری فنکار کی صورت میں ہمارے سامنے آئے ہیں۔ آپ کا سماجی شعور بڑا تیکھا ہے۔ ان کے احساسات کی شدت الفاظ کے پیکر میں ڈھل کر قاری کو بہت جلد متاثر کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

یہ کہنا بھی بجا ہے کہ ہر شخص کے خیالات وافکار دوسروں سے جدا اور منفرد نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ایک ہی چیز کو دیکھ کر مختلف لوگوں کے ذہنوں میں مختلف خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ ہر شخص اپنے ماحول سے مختلف طریقوں سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ زندگی کے باریک سے باریک اور معمولی اور عام واقعات سے متعلق بھی ہمارا نقطہِ نظر قریب قریب مختلف ہوتا ہے۔ لیکن ہم میں سے بہت ہی کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے نقطہ فکر و نظر کو الفاظ کا جامہ پہنانے میں پوری طرح کامیاب ہوتے ہوں۔ بلاشبہ صادق حسین کا شمار ان چیدہ چیدہ افراد میں ہوتا ہے جو اپنے مطمع نظر کو مکمل طور پر بیان کرنے کی صلاحیتوں سے مالا مال ہیں۔ آپ نے اپنے نظریات وافکار کو تحریری و عملی شکل میں لانے کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔

آپ صاحب فکر افسانہ نگار ہیں۔ آپ نے سماجی حقائق سے تاثر قبول کر کے اپنے مخصوص ذہنی عمل سے اُن میں شخصیت کا رنگ بھر کر الفاظ کے سانچوں میں ڈالا ہے۔ آپ کا اسلوب پختہ اور رواں ہونے کے ساتھ ساتھ سادہ اور عام فہم ہے۔ آپ کے جملوں میں شگفتگی اور تازگی ہے۔ آپ الفاظ کے ساتھ لب ولہجہ بھی ماحول کے مطابق رکھتے ہیں۔ جو کردار کے نقش کو گہرا کرنے کے ساتھ ساتھ اُن کے موضوعات میں اثر آفرینی بھی پیدا کرتا ہے۔

آپ کا اندازِ تحریر بیانیہ ہے۔ اس اندازِ بیاں میں نہ صرف معاشرتی زندگی کی حقیقی تصویریں ملتی ہیں۔ بلکہ اسلوب میں روانی اور وضاحت کا عنصر بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ ان کے افسانوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ آپ نے نہ صرف موضوعات عام حقیقی اور روز مرہ زندگی سے لئے ہیں بلکہ زبان وبیان الفاظ کی نشت و برخاست بھی عام قاری کی ذہنی سطح کے مطابق ہے۔ اُن کی تحریروں میں محاورات، تشبیہات اور استعارات کا بہت زیادہ استعمال ہوا ہے۔ محاورات کے حوالے سے یوں کہا جائے تو درست ہو گا کہ ان کے افسانوں میں محاورات بر محل ہوتے ہیں۔ اور اُن کی

نثر کو جاذبیت اور گہرائی عطا کرتے ہیں جس سے عبارت کے حُسن اور معانی میں اضافہ ہوتا ہے۔اور بیان کردہ پورا واقعہ تمام تر جزئیات کے ساتھ نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔انہوں نے تشبیہات واستعارات کو بھی اپنے ماحول سے اخذ کیا ہے۔ ان کا استعاراتی و تشبیہاتی انداز اس حقیقت کا بھی عکاس اور شاہد ہے کہ آپ کی قوتِ مشاہدہ عمیق اور محسوساتی سطح پر بڑی توانا اور متحرک ہے۔ بعض اوقات انھوں نے انسان کی داخلی کیفیات کو اشیاء کے خارجی وجود سے موازنہ کرنے کے لیے تشبیہاتی رنگوں کو زبان دی ہے۔

صادق حسین کی زبان شائستہ اور ہموار ہے انہوں نہ تو قلم کو بے قابو ہونے دیا اور نہ جذبات کو۔ ان کے افسانوں کے مطالعہ سے قاری کو بہت جلد اس بات کا احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ اچھی باتیں اچھے شخص یا آرٹسٹ سے سن رہا ہے۔

فضا سازی، منظر نگاری اور خاکہ نگاری میں جن اہم نکات اور الفاظ کا سہارا لے کر انہوں نے کہانیوں کے پلاٹ بنے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا پسندیدہ ترین موضوع دیہات ہے۔انھوں نے جس خطے کی بات کی سب سے پہلے اس کے ماحول سے آشنا کروایا۔ فضا سازی اور منظر نگاری کے وقت پوری باریکی کے ساتھ لفظوں کا چناؤ کر کے حرف حرف اور نکتے نکتے کو اس ربط و تسلسل کے ساتھ اس طرح جوڑا کہ پوری تصویر ابھر کر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔اُن کے افسانوں میں منظر نگاری اُن کے فطرت سے لگاؤ کو ظاہر کرتی ہے۔

سراپا نگاری میں انہیں کمال دسترس حاصل ہے۔اُن کے افسانوں کا تحقیقی مقالے کے متعین کردہ فرضیہ مقاصد، سوالات، وغیرہ کی روشنی میں تجزیہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ انھوں نے جس کردار کا سراپا کھینچا ہے اسکی مکمل تصویر اور حلیہ بیان کر دیا ہے۔ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ کردار قاری کی نگاہوں کے سامنے چلتا پھرتا متحرک کردار ہو۔

منظر نگاری کے علاوہ جزئیات نگاری بھی صادق حسین کی پہچان ہے۔ اپنے افسانوں میں انہوں نے باریک بینی کے ساتھ چھوٹی چھوٹی جزئیات پر بھی اپنی توجہ مرکوز رکھی۔ خواہ وہ جزئیات ماحول اور مناظرِ فطرت سے متعلق ہوں یا تہذیب وثقافت کی مکمل تصویر کشی کرتے ہوں، انھوں نے پوری مہارت کے ساتھ ایک ایک چیز کو بیان کیا۔ جغرافیائی تناظر کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو صادق حسین کے زیادہ تر افسانے دیہات کو احاطہ تحریر میں لاتے ہیں۔ آپ نے پنجاب، پوٹھوار کے علاوہ مشرقی پاکستان کے دیہات کو بھی موضوع بنایا ہے۔اس لیے انھوں نے زبان اور الفاظ کا استعمال بھی اسی جغرافیے اور ماحول کے مطابق کیا ہے جس خطے کا ذکر وہ افسانوں میں کرنا چاہتے ہوں۔

جب پوٹھوار کے گاؤں یا دیہات کی بات کی تو انھوں نے خالص وہی زبان استعمال کی جیسے پوہنچیاں، مونڈھا، موکھا، طباق وغیرہ اور ان جیسے بہت سارے الفاظ کو استعمال انھوں نے کیا جو خالصتاً اس علاقے کی ترجمانی کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ اُن کے افسانوی کرداروں کے نام بھی اسی مناسبت سے رکھے گئے۔ جیسے کرم جان، چھیماں، شیرا، فجا، حمید اکڑیل وغیرہ پنجابی اور پوٹھواری کلچر کی نمائندگی کرنے والے نام ہیں۔

ہندی سماج کا ذکر کریں تو اسی مناسبت سے لفظی چناؤ کے ساتھ ساتھ انہوں نے کرداروں کے نام بھی اس کے کلچر کے مطابق ترتیب دیے۔

ان کے افسانوں میں اردو زبان کے ساتھ ساتھ پنجابی، بنگالی، انگریزی اور پوٹھواری زبان کے الفاظوں کا بھی استعمال دیکھنے کو ملتا ہے۔ محاورات و تشبیہات کے علاوہ ضرب الامثال اور تلمیحات کا استعمال بھی انھوں نے کیا اور یہ تلمیحات اور ضرب الامثال بھی برمحل اور ثقافتی پس منظر سے بھرپور ہیں۔

آپ کے افسانوں میں " صوتی عناصر "کا مشاہدہ اس بات کی دلیل دیتا ہے کہ آپ کی قوتِ مشاہدہ کتنی شفاف اور باریک ہے۔ اور آپ کا سماجی شعور کتنا پختہ اور واضح ہے۔ ماحول کی منظر کشی کرتے وقت انھوں نے جن باریکیوں سے کام لیا، صوتی عناصر اس بات کی نشاندہی کرنے کے لیے کافی ہیں۔ آپ نے پورے ماحول کا عکس پیش کرنے کے لیے اشیاء کے نام اور مناظر کے علاوہ اُن جاندار اور بے جان چیزوں کی مخصوص آوازوں پر بھی توجہ دی جسے شاید ہی دوسرے افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں برتا ہو۔ اس حوالے سے ان کا اندازِ بیان سب سے منفرد اور یکتا معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے صوتی عناصر کے ذریعے قاری کو داخل اور خارج کے علوم اور رازوں سے آگاہی بخشی ہے۔

آپ کے افسانوں میں علامتی رنگ بھی بہت جگہ دیکھنے کو ملا۔ اس کے علاوہ تجسس کی فضا کی تخلیق سے انہوں نے انسانی رویوں کی نشاندہی کرنے کے ساتھ ساتھ معاشرے میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کو بھی واضح کیا ہے۔ مکالمہ نگاری، تکرار، لفظی تضاد اور متضاد کیفیات کو ایک ساتھ بیان کرنے میں صادق حسین اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

آپ کا ایک اور فنی کمال ایجاز و اختصار ہے آپ کم سے کم لفظوں میں بڑی سے بڑی بات کہنے اور بڑے سے بڑے واقعات کو سمیٹنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی صادق حسین کے اسلوبِ اظہار کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو صادق حسین اپنے فنی منصب پر پورا اترنے میں کامیاب رہے ہیں اور یہ تمام باتیں ان کی بصارت اور سماجی بصیرت کی آئینہ دار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے اسلوب بیان کی بدولت عام موضوعات و مسائل عام نہیں رہے بلکہ ایک تخلیقی اظہار کی صورت میں ڈھل گئے ہیں۔

ان کے مشاہدے کی باریکی، تجربے کی صداقت اور بیاں کی تازہ کاری نے ان کے افسانوی سرمائے کو معنویت اور تاثریت عطا کی ہے۔ جو اُن کے ماہر اور کامیاب افسانہ نویس ہونے کی دلیل پیش کرتی ہے۔ فکری سطح پر اُن کے افسانے سماجی، معاشی، معاشرتی اور فرد کے داخلی مسائل کے ترجمان ہیں۔ انھوں نے اپنے مطالعے اور مشاہدے کو پوری صداقت کے ساتھ سپرد قلم کیا ہے۔

صادق حسین نے سماجی شعور کی عکاسی کرنے والے تمام عناصر کو سادہ اور پر تاثیر انداز میں زمانی تغیر اور سماجی پس منظر کے علاوہ جغرافیائی تناظر اور تہذیبی و عصری رجحان کے ساتھ افسانوی موضوعات میں بیان کیا۔ انھوں نے انسانی نفسیات کو تحلیلِ نفسی کے اصولوں کے مطابق پرکھا ہے اور انسان کے داخل میں اتر کر ان کے احساسات اور جذبات کو سمجھنے میں کامیاب ہوئے۔ ان کے افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ان کے افسانوی موضوعات، کردار، واقعات اور جزئیات مکمل طور پر ان کے سماجی شعور، اور زبردست قوتِ مشاہدہ کے ترجمان ہیں۔

ماخذات

احمد، شکیل۔اردو افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی۔گورکھپور: آفسیٹ پریس، ۱۹۸۴ء۔

احمد،انوار۔اردو افسانے اپنے سماجی اور سیاسی تناظر میں۔ملتان: بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ۱۹۸۳ء۔

احمد،انوار۔اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ۔فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۰ء۔

احمد، ممتاز۔رشیدامجد کا اسلوب۔لاہور: مطبوعہ اوراق، ۲۰۰۲ء۔

اختر، سلیم۔افسانہ اور افسانہ نگار(تنقیدی مطالعہ)۔لاہور: سنگِ میل پبلشرز، ۲۰۱۳ء۔

اظہر، پروین۔اردو میں مختصر افسانے کی تنقید۔علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاوس، ۲۰۰۰ء۔

افضال بٹ، محمد۔اردو ناول میں سماجی شعور۔اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۹ء۔

اسلم، فوزیہ۔اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک۔اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۷ء۔

اشرف،اے،بی۔مسائلِ ادب(تنقید و تجزیہ)۔لاہور: سنگِ میل پبلشرز، ۱۹۹۵ء۔

انور، فردوس۔اردو افسانہ نگاری کے رجحانات۔لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۹ء۔

الھدیٰ، سرور۔ادب کی سماجیات(تصور اور تعبیر)۔نئی دہلی: انجمنِ ترقی اردو، ۲۰۰۶ء۔

بریلوی، عبادت۔افسانہ اور افسانے کی تنقید۔لاہور: ادارہ ادب و تنقید، ۱۹۸۶ء۔

بیگ، حامد۔اردو افسانے کی روایت۔اسلام آباد: اکادمی ادبیات، ۱۹۹۱ء۔

بیگم، عائشہ۔تاریخ اور سماجیات۔مطبع العربیہ، ۱۹۹۹ء۔

پرویز، اطہر۔ادب کا مطالعہ۔علی گڑھ: اردو گھر، ۱۹۴۲ء۔

جبیں، نگینہ۔اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ۔الہ آباد: ۱۴۰۵اے دریاآباد، ۲۰۰۲ء۔

جمشید، اسلم۔ترقی پسند اردو افسانہ اور چند افسانہ نگار۔دہلی: ماڈرن پبلشنگ ہاوس، ۲۰۰۲ء۔

حسین، احتشام۔ادب اور سماج۔بمبئی: کتب پبلشرز، ۱۹۴۸ء۔

حسین، انتظار۔اجتماعی تہذیب اور افسانہ(علامتوں کا اظہار)۔لاہور: سنگِ میل پبلشرز، ۱۹۸۳ء۔

حسین، صادق۔پھولوں کے محل۔لاہور: ادارہ فروغِ اردو، ۱۹۶۳ء۔

حسین، صادق۔شہر اندر شہر۔لاہور: ادارہ فروغِ اردو، ۱۹۳۸۸ء۔

حسین، صادق۔گلاب کے آنسو۔لاہور: بک ہوم پبلشرز، ۲۰۰۸ء۔

حسن، محمد۔ادبی سماجیات۔دہلی: فروغِ اردو، ۲۰۱۱ء۔

راہی، اعجاز۔اردو افسانے میں اسلوب کا آہنگ۔راولپنڈی: ریز پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء۔

رئیس، قمر۔نیا افسانہ، مسائل اور میلانات۔دہلی: اردو اکادمی، ۱۹۹۲ء۔

رئیس، قمر۔اردو میں بیسویں صدی کا افسانوی ادب۔دہلی: آف سیٹ پرنٹرز۔۲۰۰۴ء۔

زریں، صالحہ۔اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ(ابتداءسے ۱۹۴۷ء تک)۔لکھنؤ: نصرت پبلشرز، ۲۰۰۰ء۔

سدید، انور۔اردو افسانے کی کروٹیں۔لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۱ء۔

سدید، انور۔اردو افسانہ عہد بہ عہد۔لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۲ء۔

سدید، انور۔اردو افسانے میں دیہات کی پیشکش۔الہ آباد: اردو رائٹرز گلڈ، ۱۹۸۲ء۔

سعید، علیگ طارق۔اردو ادب کا تہذیبی پسِ منظر۔لاہور: دارالشعور، ۲۰۱۵ء۔

سید احمد، مولوی۔فرہنگِ آصفیہ(جلد سوم)۔لاہور: سنگِ میل پبلشرز، ۲۰۰۲ء۔

سنز، فیروز۔ فیروز سنز اردو انسایکلو پیڈیا۔لاہور: فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، ۱۹۸۴ء۔

شہناز، روبینہ۔تخلیقی ادب۔اسلام آباد: نمل یونیورسٹی، ۲۰۱۱ء۔

شیدا، راجندر ناتھ۔ادب، فکر اور سماج۔دہلی: ایشیاء پبلشرز، ۱۹۵۲ء۔

شیریں، ممتاز۔طویل، مختصر افسانہ۔لاہور: سویرا آرٹ پریس، ۱۹۶۳ء۔

صادق۔ترقی پسند اردو افسانہ(۱۹۳۶ءسے ۱۹۵۶ء تک)۔دہلی: نعمانی پریس، ۱۹۸۱ء۔

صدیق، احمد۔ادب اور زندگی(مجنون گورکھ پوری کے چند تنقیدات کا مجموعہ)۔لکھنؤ: کتب خانہ دانش، ۱۹۴۴ء۔

صدیقی، عظیم۔افسانوی ادب(تحقیق و تجزیہ)۔دہلی: مکتبہ جامعہ، ۱۹۸۳ء۔

عبدالرحمٰن، رانا۔افسانے صادق حسین (مرتب)۔لاہور: بک ہوم پبلشرز، ۲۰۱۲ء۔

عبدالرحمٰن، رانا۔لہو کے چراغ (مرتب)۔لاہور: بک ہوم پبلشرز، ۲۰۱۲ء۔

عبدالسلام۔کرشن چندر کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ(سیاسی وسماجی پس منظر)۔نئی دہلی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۴ء۔

عظیم، وقار۔فنِ افسانہ نگاری۔دہلی: اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۷۷ء۔
عظیم، وقار۔نیا افسانہ۔الہ آباد: آفسٹ پریس، ۱۹۸۲ء۔
عقیل، محمد۔سماجی تنقید اور تنقیدی عمل۔الہ آباد: تہذیبِ نو پبلی کیشنز، ۱۹۸۰ء۔
علوی، وارث۔جدید افسانہ اور اس کے مسائل۔دہلی: نئی آواز، ۱۹۹۰ء۔
کنول، روبینہ۔صادق حسین کی افسانہ نگاری۔ملتان: بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ۱۹۸۷ء۔
گورکھپوری، مجنوں۔ادب اور زندگی۔کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۸۵ء۔
مصلح الدین، محمد۔سماجیات۔دکن: سنٹرل پبلشرز، ۱۹۵۳ء۔
منظر، شہزاد۔جدید اردو افسانہ۔کراچی: منظر پبلی کیشنز، ۱۹۸۲ء۔
نارنگ، گوپی چند۔اردو افسانہ روایت اور مسائل(مرتب)لاہور: سنگِ میل پبلشرز، ۱۹۸۶ء۔
نارنگ، گوپی چند۔ادبی تنقید اور اسلوبیات۔لاہور: سنگِ میل پبلشرز، ۲۰۰۸ء۔
نقوی، خاور۔پوٹھوار میں اردو افسانہ نگاری(تحقیقی وتنقیدی مطالعہ)۔اسلام آباد، ۱۹۹۷ء۔
ہاشمی، نورالحسن۔ادب کا مقصد۔لکھنوء: سرفراز پریس، ۱۹۵۶ء۔

International Islamic Univ
CENTRAL
LIBRARY
ISLAMABAD